جب الجزائر جاگا

لطیف فاروقی

مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور

ناشر : اکبر ملک مالک مکتبۂ اشاعت ادب ، لاہور

طابع : علمی پرنٹنگ و فردوس پرنٹنگ پریس لاہور

آرٹسٹ : اے کریم

تعداد : ایک ہزار

طبع اول : ستمبر ۱۹۶۳ء

قیمت : ۸ روپے

جب
الجزائ
جا

اپنے محترم دوست خان حشمت اللہ خان آف گلگت کے نام
جن کی ترغیب تکمیل کتاب کا باعث ہوئی

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حرفِ آغاز

یوں تو ہزاروں، لاکھوں انسان اپنے اپنے عہد میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اس بات کا دعویٰ کرتے آئے ہیں کہ ان میں قوم و ملک کے لئے جانیں قربان کرنے کی زبردست تڑپ موجود ہے لیکن وقت پڑنے پر ایسے دعوے عام طور پر بہت کم شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ ان دعووں کی تڑپ میں وہ خلوص کارفرما نہیں ہوتا جو آئندہ نسلوں کے لئے جینے اور مرنے کی لذّت محسوس کرتا ہو۔

کسی بوڑھے آدمی نے درخت کا پودا لگایا تو ناعاقبت اندیشوں نے اس پر ہنسی اڑا کر کہا "کیا یہ سمجھتے ہو پودے کے درخت بننے تک تمہاری عمر وفا کر سکے گی اور تم اس کا پھل کھا سکو گے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "تم احمق ہو، تمہیں تو اپنی ہی زندگی سے مطلب ہے اور میں دوسروں کے لئے جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس درخت کا پودا اپنے لئے نہیں، آئندہ نسلوں کے لئے لگایا ہے"۔

یہی مثال الجزائر کے ان لاکھوں شہیدوں کی ہے جو یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ وہ اپنی قربانی کا ثمرہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکیں گے، شاہراہِ آزادی کی طرف قدم بڑھانے میں اصلاً غافل نہ ہوئے۔

الجزائر، جو شمالی افریقہ میں واقع ہے، مسلم آبادی کی غالب اکثریت رکھنے کے باوجود ایک طویل مدت تک سمندر پار کی غیر قوم —— اہل فرانس —— کا غلام رہا۔ الجزائری غلام فرانسیسی حکومت کے غیر منصفانہ تسلط کی وجہ سے نالاں تو تھے مگر مضطرب نہ تھے۔ ان کے دلوں میں اضطراب کی لہریں اس وقت پیدا ہوئیں جب ان کی حیثیت کو ہر لحاظ سے کم سے کم تر کر دیا گیا۔ مثلاً مجالسِ قانون ساز میں صرف چند کٹھ پتلی عربوں کو شمولیت کی اجازت ملی، ملازمت میں الجزائری غلاموں کے حصے کا تناسب بہت کم رکھا گیا، انہیں مزروعہ زمین کے صرف ۱/۳ حصے کا مالک بنایا گیا، بینکوں، جہازوں، کانوں، مقامی وسائلِ حمل و نقل، رفاہِ عامہ کے اداروں اور اجناس کی کاشت میں زیادہ سے زیادہ حصہ فرانسیسی اور یورپی آبادکاروں کا رکھا گیا۔ عربوں کو تعلیم کی نعمت سے یکسر محروم کئے رکھا۔ یعنی صرف ۲ فیصد مقامی آبادی کو حصولِ تعلیم کی اجازت دے کر اور ۱۹۵۲ء تک عربی مدرسوں کے لئے ایک پائی کی بھی منظوری دینے سے انکار کر کے انہیں باشعور شہری بننے سے روک دیا گیا۔

ان حالات میں، ظاہر ہے خوابیدہ قوم کا علاج بیداری ہی ہو سکتا تھا، چنانچہ جب الجزائر جاگا تو اس نے نومبر ۱۹۵۴ء میں حکومتِ فرانس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ بغاوت کی چنگاریاں رفتہ رفتہ سینکڑوں

سے ہزاروں اور ہزاروں سے لاکھوں جانوں کی قربانیاں لینے کے بعد غاصبانہ طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل ہو گئیں۔ ایسے وقت میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تو اسے خالد بن ولید، طارق ابنِ ز اور محمد بن قاسم کی طرح حضرت خولہ، رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور شرف النساء کے چہرے نظر آ— پھیر گیا تھا۔ الجزائر میں فرحت عباس، عبدالرحمٰن فارس، یوسف بن خدہ، بن باللہ اور خضر وغیرہ کی طرح جمیلہ جمیلہ بوحائرڈ اور جمیلہ بوپاشا وغیرہ نے اپنے آباؤ اجداد کے جہاد فی سبیل اللہ کی سنت پوری کرنے کا تہیہ کر لیا۔ عورت طاقتِ نبرد آزمائی کے لئے پیدا نہیں ہوئی لیکن وقت کے نازک اور شدید تقاضے نے جب غیرت کو آواز دی تو مردوں کے ساتھ نوجوان خواتین بھی کفن بردوش ہو گئیں اور اپنے وطنِ عزیز کو آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے ٹامی گنوں کی گولیوں کی طرح چل پڑیں۔ سات سال کے عرصے میں فرانسیسی پولیس اور فوج کے ہاتھوں نو دس لاکھ الجزائریوں کو جام شہادت پلانے کے بعد مرد رہنماؤں کو بھی بڑے بڑے مصائب جھیلنے پڑے لیکن جو تکلیفیں جمیلہ بوہیرد، جمیلہ بوحائرڈ اور جمیلہ بوپاشا کو پہنچائی گئیں ان کے ذکر تک سے بھی زبان گنگ ہو جاتی ہے، چونکہ ان مجاہد اور نڈر خواتین نے بھی مردوں کی طرح وطنِ عزیز کی آزادی کی خاطر شہادت گاہ میں اپنے نصب العین کا یقین کر کے قدم رکھا تھا کہ آنے والی نسلیں ہی نخلِ آزادی کی چھاؤں میں آرام کریں گی۔ اس لئے ان کی چال میں بے باکی پیدا ہو گئی اور انہوں نے اجتماعی جدوجہد کے میدان میں چلتی ہوئی تلواریں بن کر منزلِ آزادی کو حاصل کر لیا۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ الجزائر کے حصولِ آزادی میں ان خواتین کا بھی غیر معمولی حصہ ہے تو یہ اظہار حقیقت پر مبنی خیال کیا جائے گا۔ بلاشبہ ان جری دوشیزاؤں کو اپنی جانوں کے مقابلے میں آزادیٔ وطن زیادہ عزیز تھی لیکن قدرت کی طرف سے انہیں جو گراں قدر انعام ملا وہ جدوجہد کی تاریخ میں شاذ ہی کسی کے حصے میں آیا ہوگا —— یعنی یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں الجزائر کی آزادی کا جانفزا منظر دیکھ لیا۔

اس ناول کو لکھتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ جدوجہد آزادی کی صحیح تصویر پیش کی جا سکے۔ حقائق کے ساتھ جہاں تاریخی واقعات کی فضا دھندلی نظر آئی، وہاں قرائن سے کام لے کر عکاسی کی ۔۔ حاصل کی گئی ہے، مثلاً الجزیرہ کے بعض علاقوں کے نام اور جمیلہ بوحائرڈ کے وکیل کی کارگزاری وغیرہ۔ اس طرح تاریخی کرداروں کے واقعات کی تفصیلات پر بھی اندازے اور تخمینے سے تکمیل کار کی ہے۔

راقم الحروف نے آزادی کی یہ داستان جس دردمند دل سے لکھی ہے، امید ہے، قارئین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اس لئے الجزائری جدوجہد حریت جس حد تک ہماری سعیٔ آزادی سے مماثلت رکھتی ہے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس آزادی کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور بقائے حیات کی اس شمع فروزاں کو آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بنائیں۔

لطیف فاروقی

1

عقیل نے ناشتہ کرنے کے دوران ملازم سے فرانسیسی اخبار "فرانس سائر" وصول کیا تو اس کی نگاہیں اخبار کی ایک جلی سرخی پر گڑ گئیں، وہ لبوں تک آنے والی الی کو کڑک کی آواز سے واپس رکھ کر ایک ناقابلِ برداشت اضطراری کیفیت کے ساتھ ی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا:

"کیا خوب گویا بغاوت ختم ہو گئی"!

"دکھاؤ نا اخبار" ——— کرامت نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مطالبہ کیا۔

"حکومتِ فرانس کا خیال ہے کہ مجاہدین کو موت کی نیند سلا کر بغاوت ختم ہو سکتی ہے" عقیل نے اخبار اپنے ہاتھ ہی میں لئے ہوئے اپنے جوشِ گفتار کو قائم رکھتے ہوئے کہا "حالانکہ یہ ناممکن ہے — نا — ممکن"!

کرامت نے کہا "بہت ظلم کیا ہے حکومت فرانس نے کہ اچانک ہوائی جہاز وں

کے ذریعے چھاتہ فوج کے دستے اتار کر بے گناہ اور مجبور انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"لیکن وہ مرے نہیں" عقیل کے جوش میں ذرا بھی کمی نہ آئی "وہ زندہ ہیں اگر الجزائری بہادری کی موت نہ مرے ہوتے تو میرے جیسے حقیر انسان کے اندر قوتِ جہاد پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ جب ایک مجاہد جان دیتا ہے تو دس مجاہد اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ — تعجب ہے کہ فرانس کے نزدیک بغاوت فرد ہو چکی ہے:"

کرامت نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے عقیل کے ہاتھ سے اخبار لے کر پڑھنا شروع کر دیا تھوڑی دیر ادھر اُدھر ٹہلنے کے بعد عقیل اپنی جگہ پر واپس آ بیٹھا اور ٹھنڈی چائے ایک خالی برتن میں انڈیل کر تازہ چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ کرامت نے خبر کا متن پڑھتے ہوئے کہا۔ "حکومت فرانس کے نزدیک الجزائر ایک امن پسند صوبہ ہے جس کی کوئی بغاوت بھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔"

عقیل جو اپنی پیالی میں دودھ ڈالنے کو تھا، رک گیا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا "میں چائے نہیں پیوؤں گا، میں مزید حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

۱۹۵۴ء کے اوائل ہی میں الجزائر کے باشندوں پر اپنے ہمسائے ممالک مراکش اور تیونس کی جدوجہدِ آزادی کا روز بروز اثر پڑ رہا تھا جس کے نتیجے میں الجزائر کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مطالبۂ آزادی کے نعرے لگاتی نظر آنے لگیں۔ یہ آوازیں ایک عرصہ تک گونجتی رہیں مگر ان کا انجام صدا بصحرا معلوم ہوتا رہا، حکومت فرانس نے کئی مہینوں تک اِن آوازوں کو رسمی آوازیں خیال کر کے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن الجزائری چاہتے تھے کہ ان کی آوازیں قابلِ اعتنا سمجھی جائیں۔ مشکل یہ تھی کہ بندوقوں اور توپوں سے ٹکرائے بغیر اِن کی آوازیں حکومتِ فرانس کے کانوں سے ٹکرا نہیں سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنوری، فروری، مارچ، اپریل اور مئی کی آوازوں نے جون،

جولائی، اگست، ستمبر اور اکتوبر میں اپنے اندر قوتِ فیصلہ کی لہریں بھر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نومبر کی پہلی صبح کے تیور بدلے ہوئے نظر آئے۔ عزیبوں، مجبوروں اور انصاف پسندوں کی وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں جنھیں حکومت فرانس تصوّر ہی تصوّر میں پائے استحقار سے ٹھکراتی چلی آئی تھیں، پیکرانِ عزم بن کر چھائی ہوئی بدلیاں بن گئیں، ایسی بدلیاں جن میں سالہا سال سے بجلیاں آسودہ تھیں اور اب گرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھیں۔ اِن مختصر سی کئی ٹولیوں نے اپنا حقِ آزادی حاصل کرنے کیلئے بتیس تیس (۳۰) (۳۲) مقامات پر حملہ کردیا جس کے نتیجے میں۔ چار (۴) فرانسیسی ہلاک اور دو (۲) زخمی ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ موسیوماندے فرانس وزیرِ اعظم تھا۔ یہ موسیو ماندے فرانس وہی شخصیت تھی جس نے جینوا کی ایک کانفرنس میں ہند چینی کی جنگ کے خاتمے کی تحریک کی تھی اور اس کے گیارہ روز بعد اس نے ڈرامائی انداز میں قرطاجیہ جاکر تیونس کی آزادی کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھایا۔ انھوں نے اس وقت کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افسر موسیو سوتیل کو الجزائر میں گورنر جنرل مقرر کردیا تھا جس کی یورپی آبادکاروں نے سخت مخالفت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس شخصیت کے گورنر جنرل ہونے پر یورپی آباد کاروں کو اختلاف تھا اس کے متعلق لازمی طور پر یہ یقین کیا جا سکتا تھا کہ وہ الجزائریوں کے حق میں ہوگی لیکن ہوا یہ کہ الجزائر میں الجزائریوں کی معمولی سی تحریکِ آزادی کو خطرے کا آلارم سمجھ کر اسے غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ الجزائر کی فوج میں مزید فرانسیسی فوجی دستوں کو شامل کردیا گیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا گیا کہ فرانس ہمیشہ الجزائر کو اپنے ملک کا صُوبہ سمجھنے سے زیادہ کوئی درجہ دینے کو تیار نہ ہوگا۔

اگرچہ اس قسم کے اعلانات کی پشت پناہی بموں، توپوں، مشین گنوں اور جنگی طیاروں سے ہو رہی تھی، پھر بھی عقیل ایسے نوجوان اپنی مجاہدانہ خفیہ سرگرمیوں

کے مقابلے میں مادّی طاقت کو کوئی وقعت ہی نہ دیتے تھے۔ الجزائر کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کے ایک ایک فرد کی آنکھیں چشمِ تصور میں مراکش اور تیونس کی ہمہ گیر تحریک آزادی کو چشمِ حسرت سے نہ دیکھ رہی ہوں۔ مراکش اور تیونس میں انہی دنوں جو ہنگامہ برپا تھا اس کے تیور بتاتے تھے کہ ان خطوں کو آزادی دیئے بغیر چارہ نہیں۔ یہی احساس حکومت فرانس کا تھا مگر ان خطوں کی ہنگامہ آرائی کے مقابلے میں الجزائری چند ٹولوں کے کمزور سے نعرے بظاہر کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ الجزائر کے عوام، جن کے پاس سرمایۂ عزم کے سوا کوئی مادی طاقت موجود نہ تھی، یقین رکھتے تھے کہ ان کے اٹھے ہوئے قدم کبھی واپس نہیں ہو سکتے۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ تاجِ آزادی حاصل کرنے کے لئے لاتعداد قربانیاں لابدی ہیں، انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ ان کی آبیاری ان کی زندگی میں انھیں اپنے درخت کا پھل نہیں کھلا سکتی۔ اگر ان کا نظریۂ زندگی خود غرضی پر مبنی ہوتا تو وہ آزادی کی راہ میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتے کیونکہ وہ قدم ان کی بجائے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ اس لئے انھیں یہ بات بہ دل و جان منظور تھی کہ اگر آزادی کا راستہ ان کی لاشوں پر بھی بن سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں بلکہ بہت ہی سستا ہے، یہی وجہ ہے کہ الجزائر کے گھر گھر میں چرچا تھا کہ آزادی مانگے بغیر کبھی نہیں مل سکتی اور مانگنے کا مطلب جانی قربانی بھی ہوتا ہے۔ عقیل تو مضطرب ہو کر گھر سے باہر نکل گیا اور حالات معلوم کر کے شام کو واپس آ بھی گیا لیکن بہت سے نوجوان گھروں سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آتے تھے اور وہ چیلوں اور گدّھوں کی بھوک کا سامان کرتے تھے۔ جٹ طیاروں نے واپسی کی پرواز میں یہ پیغام پہنچایا کہ جو نوجوان شہادت کے خواہاں تھے ان کی آرزو پوری کر دی گئی ہے۔

اگر حکومت کی چھاتہ فوج کے دستے الجزائریوں کی معمولی سی بغاوت کو

ختم نہ کرتے تو بالکل ممکن تھا کہ تحریک آزادی پروان نہ چڑھتی، لیکن اب جب کہ حکومت نے عملی طور پر نعرۂ آزادی کو خاموشی میں بدلنے کا سامان کیا تو اور بہت سی آوازیں ہنگامہ آرائی کے لئے بیقرار ہو گئیں۔ یہ آوازیں عوام کی تھیں جو بالکل نہتے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہ تھا۔ لیکن ان کے عزم و استقلال کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اپنی شکست کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

۲

اگرچہ حکومت فرانس الجزائر کی تحریکوں کو کچلنے کے پروگرام میں غافل نہ تھی لیکن تحریکوں کے محرک بڑے بڑے مظالم برداشت کر کے بھی اپنے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دیتے تھے۔ تحریکوں میں مردوں کے دوش بدوش چند خواتین نے بھی حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن حکومت فرانس اب تک فکر و غم سے آزاد تھی، وہ اپنے فوجی دستے بھیجتی جو الجزائری مجاہدین کو موت کی نیند سلا دیتے۔ الجزیرہ میں، جو الجزائر کا دارالخلافہ تھا، کئی ایک درس گاہیں تھیں۔ ایک درس گاہ میں زبیدہ نامی ایک نوجوان اور حسین لڑکی تعلیم حاصل کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی اثر تھا اس کا چہرہ گول مگر ٹھوڑی نوک دار تھی، اس کا رنگ طلوعِ صبح کی طرح سرخی مائل سفید تھا۔ اس کے بال کالی گھٹاؤں کی مانند سیاہ تھے۔ قد درمیانہ تھا، اس کی

آنکھیں ہمیشہ جھکی رہتی دکھائی دیتیں۔ جماعت میں پروفیسر کے سبق پڑھانے کے دوران بھی اس کی نگاہیں کبھی مخاطب نہ ہوتیں۔ سوال کیا جاتا تو جواب کے لئے مخاطب ہو جاتیں اور پھر شرافت کا انداز لیئے ہوئے جُھک جاتیں۔ وہ طبعاً خاموش تھی لیکن کوئی اس سے مخاطب ہوتا تو تسلّی بخش جواب کے لئے مستعد ہو جاتی۔ جواب ختم ہوتا تو فوراً باوقار سنجیدگی کے آثار پیدا کر کے اپنی راہ لیتی۔ یورپی آباد کاروں کی وجہ سے زنانہ ملبوسات کے جو نت نئے فیشن بدلتے رہتے تھے ان کا اس حسین و جمیل پیکر پر کوئی اثر نہ تھا۔ موسمی آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی فیشن فائدہ بخش نظر آتا تو اسے وہ ضرور اختیار کر لیتی لیکن ایسے فیشنوں کے نزدیک بھی نہ پھٹکتی جو ترغیبِ جنسی کے باعث بنتے ہوں۔ فراک اور قمیصوں میں چاہے کتنی ہی جدّتیں ہوتیں لیکن سر پر ستر پوش دوپٹہ ضرور موجود ہوتا۔ اسے دیکھ کر قدرتی مناظر کا قدردان انسان یوں محسوس کرتا جیسے وہ تاج محل دیکھ رہا ہے اگرچہ دیکھنے والے کو فوراً یہ خیال آجاتا کہ کاش یہ تاج محل اس کا اپنا ہوتا۔ لیکن اس کے شرافت مآب وقار اور رعب حُسن کے سامنے کوئی دم نہ مار سکتا۔ کئی اہل دل ہم جماعت آپس میں اس قسم کی چہ میگوئیاں کرتے کہ زبیدہ سے اظہارِ محبت کا اشارہ تک ممکن نہیں۔

زبیدہ ایک سلجھے ہوئے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس کے والدین دینی مزاج رکھنے کے ساتھ روشن خیال بھی تھے۔ وہ اپنی اولاد کو اس حد تک تعلیم دلانے کے حق میں تھے جس حد تک ان کے اخلاق پر ناگوار اثر نہ پڑتا تھا ناگوار اثر کا تعلق غلط طرزِ تعلیم سے تھا لیکن جس درس گاہ میں وہ تعلیم حاصل کر رہی تھی وہ دوسری متعدد درس گاہوں کی نسبت غنیمت تھی۔ والدین کی آرزو تھی کہ ان کی لختِ جگر اپنی تعلیم کے تمام مدارج طے کر لے، چنانچہ وہ حصولِ تعلیم میں پورا

زور صرف کر رہی تھی۔

زبیدہ کو اپنی درسی کتابوں کے علاوہ عام مطالعہ کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ بین الاقوامی حالات سے واقف ہونے کے ساتھ اپنے غلام ملک کے حالات سے بھی ہر وقت بہرہ ور رہتی تھی۔ گھر میں جب فرش پر ماں باپ ناشتہ یا کھانا کھانے کے لئے اکٹھے بیٹھتے تو عام طور پر سیاسیات پر تبادلہ خیال شروع ہو جاتا۔ گفتگو کا آغاز عام طور پر زبیدہ ہی کی جانب سے ہوتا۔

"ابا جان! آپ کے خیال میں، کیا ہمیں آزادی مل جائے گی؟"

"انشاءاللہ"

"مگر میں سوچتی ہوں کہ مطالبۂ آزادی کے نعرے لگانے والے کب تک نعرے لگا سکیں گے"

"اس وقت تک جب تک ان کو آزادی مل نہیں جاتی۔"

"مگر ابا جان آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ نعرے لگانے والوں کی آواز حکومت کے اسلحہ نے کئی مرتبہ بند کر دی۔"

"لیکن پھر بھی نعروں کی آواز گونجتی رہی"

یہ فقرہ کہنے کے ساتھ باپ نے زبیدہ کی طرف خاص طور پر مخاطب ہو کر کہا "کیا تم اس کا مطلب سمجھ گئی ہو کہ نعروں کی آواز بند کر دینے کے بعد بھی آواز گونجتی رہی؟"

"جی ہاں ابا جان آپ کا مطلب یہی ہو گا کہ حریت پسندوں کی شہادت نے اور زیادہ مجاہد پیدا کر دئے۔"

والد بولے "مجھے خوشی ہے کہ تمہاری سمجھ میں بات آگئی ہے۔"

زبیدہ نے کہا "یہ تو درست ہے ابا جان لیکن مجھے کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ غریب قلاش اور نہتے مجاہدین جدید تباہ کن اسلحہ کا کب تک مقابلہ کر سکیں گے کیا ایک وقت اپنی ہار مان کر خاموش نہ ہو جائیں گے"؟

والد کے چہرے پر سرخی چھا گئی "ہر گز نہیں، ہمیشہ یاد رکھو غلامی کا ظلم اگر انتہا کو پہنچ

جائے تو اس میں انتقامی طاقت بھر جاتی ہے۔ ایک کمزور انسان اس وقت تک کمزور ہوتا ہے جب تک اس پر کوئی حملہ آور نہیں ہوتا۔ تم کتنی نرم طبع ہو لیکن اگر کوئی شخص رائفل لے کر تمہارے سامنے کھڑا ہو جائے تو اپنے بچاؤ کے لئے تمہارے کمزور جسم میں کتنی زیادہ طاقت بھر جائے گی۔"

زبیدہ نے کہا "اباجان! آپ نے درست فرمایا، ابھی ابھی میں نے تصوّر میں اپنے آپ پر کسی فرانسیسی کو حملہ آور پایا تو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مجھ میں مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو گئی۔ علاوہ اس کے مجھے ایک پاکستانی مصنف کی لکھی ہوئی تاریخِ آزادی کا باب یاد آیا جس کے حقائق سے بہت متاثر ہوئی اس نے لکھا ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے خانہ جنگی میں ایسے ایسے رقیق القلب بلکہ بزدل مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کرتے رہے جو مقابلے سے پہلے خوف و ہراس کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری الجزائری ٹولیاں ایک نہ ایک دن ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کر لیں گی۔"

"یقیناً" زبیدہ کے والد نے جلدی سے چائے کا گھونٹ لے کر فیصلہ کن انداز میں کہا "اگر خدا نے چاہا تو ایک دن الجزائریوں کی یہ بے حقیقت سی ٹولیاں ملک کی کایا پلٹ دیں گی۔"

زبیدہ اپنے والدین اور عزیزوں کے ساتھ بیٹھی ملکی حالات پر اس طرح کا تبصرہ کرتی رہتی تھی۔ کبھی یہ تبصرہ سطحی ہوتا اور کبھی گہرا۔ کبھی ظاہرا حالات کو زیرِ بحث لایا جاتا، کبھی پیچیدہ معاملات کو۔ اس طرح اس کے ذہن پر دو قسم کا اثر پڑتا۔ ایک حالات کی واقفیت کا اور دوسرا حب الوطنی کا۔ کبھی کبھی اس کا ذہن اس طرف آتا کہ اگرچہ آزادئ وطن کے لئے آواز اٹھانے والی ٹولیاں بے حقیقت سی ہیں لیکن ان کی مثال بارش کے پہلے قطرے کی ہے اور بارش کے پہلے قطرے کی جرأت قابلِ فراموش ہرگز نہیں۔ پھر اسے خیال آتا کہ کاش آزادئ وطن، کی پہلی آوازوں میں اس کی بھی آواز شامل ہوتی۔ وہ اپنی سوچوں کے تصور میں یہ منظر بھی دیکھتی کہ آزادئ وطن کی مسلسل آوازوں کو بند کرنے کے لئے حکومت

فرانس نے ہوائی فوجوں کا ذریعہ اختیار کر لیا ہے اور چھاتہ فوجیں زمین پر اتر کر آندھی کی طرح بڑھتے ہوئے جسموں کو گولیوں اور بموں کی آگ سے بھون رہی ہیں۔ اس تصوّر میں زبیدہ اپنے آپ کو امتحان میں ڈال دیتی اور اپنے آپ سے سوال کرتی: "کیا تو ایسے جلوس میں شامل ہونے کی جرأت کر سکتی ہے جس کا نتیجہ موت ہو سکتا ہے؟"

اپنا جائزہ لینے کے بعد غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکل جاتا "ہاں" مگر وہ پھر سوچتی کہ یہ "ہاں" محض جذباتی لفظ ہے، وقت پڑا تو یہ "ہاں" عملی طور پر "نہیں" میں بدل جائے گی۔

لیکن اس احساس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ پر ایک اور سوال کر گذرتی "کیا شہید ہونے والوں کو انجام کار اپنی شہادت کا علم نہ تھا؟ اگر علم تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بہت بڑی قربانی کی۔ یہ قربانی کیا چیز ہے؟ اس کا ان کو کیا فائدہ پہنچا؟"

"ان کو کیا فائدہ پہنچا؟" اس سوال کا فوری جواب اس کے اُس تربیت یافتہ ذہن نے دیا جس کے تحتِ شعور میں قرآن حکیم کی تعلیم رہتی تھی، وہ قرآنِ حکیم جو انسان کی حیثیت سے جینا سکھاتا ہے، جو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا سکھاتا ہے اور جو یہ بھی سکھاتا ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے سامنے انفرادی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جو اجتماعی زندگی کا مفہوم یہ بھی بتاتا ہے کہ قومی زندگی میں اپنے لئے نہیں بلکہ دوسرے کے لئے جیا جاتا ہے۔

اپنی ہی الجھن کا ایسا سلجھا ہوا جواب پا کر زبیدہ فرطِ اضطراب سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی اور فیصلہ کن انداز میں اپنے آپ سے کہتی "واہ زبیدہ! کیا تجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میدانِ شہادت میں قدم رکھنے والوں کا قومی مقصد اپنے لئے زندہ رہنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے لئے۔ آزادیٔ وطن کے راستے میں شہادت ایک ایسا بیج ہے جس کا پھل عام طور پر دوسرے کھاتے ہیں اور شہادت پانے والا شہادت سے پہلے ہی اپنے

اس مقصد عزیز کی مے سے سرشار ہوتا ہے جس کی کیفیت اس کی آخری سانس تک جاری رہتی ہے۔"

زبیدہ اپنی زندگی کا اسلامی تصور سمجھ لینے کے بعد خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو رضا کار بنا لیتی اور چند لمحوں میں یوں محسوس کرتی کہ اس کے جسم پر زندگی کے معمول کا لباس نہیں بلکہ کفن ہے۔ مگر پھر جب وہ اپنے اس تصور سے واپس آتی تو اپنے آپ کو کوسنے لگتی اس کی بہت سی تنہائیوں میں کئی ایسے لمحے آتے کہ وہ بیٹھی بیٹھی اچانک جھرجھری لے کر اٹھ کھڑی ہو جاتی اور اس کے دل میں کہے ہوئے خاموش الفاظ بے اختیار زبان پر آ جاتے جنہیں گھر کے افراد کئی بار سن چکے تھے۔ مثلاً وہ کسی سوچ میں مستغرق اچانک اٹھتی اور اس کی زبان پر یہ لفظ ہوتے "میں بھی تو ان کی طرح انسان ہوں"

گھر کے افراد زبیدہ کے اس جملے پر چونک اٹھتے اور سوال کر بیٹھتے کہ "تم کن کی طرح انسان ہو"؟

لیکن زبیدہ اس کا جواب ٹال جاتی ——— ٹالتی رہتی لیکن اس کی زبان پر اس قسم کے الفاظ برابر آتے رہتے جو گھر والوں کے کانوں میں کبھی کبھار ضرور پڑ جاتے اور وہ مواخذہ بھی ضرور کر بیٹھتے۔ ایک رات سونے سے پہلے جب کہ اس کی آنکھیں نیند سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئی تھیں، اس کی زبان سے اس قسم کے جملے سننے میں آئے۔

"انجام موت ہے تو کیا ہوا، اس موت کا نام شہادت ہے ——— کیا ہم اس طرح مطالبہ کرتے رہیں گے ——— کیا ہم مرتے ہی رہیں گے! ——— ہم نہیں مریں گے تو آزادی کس طرح ملے گی؟ ——— کیا ہی اچھا ہو کہ آزادی کی بہار ہم بھی دیکھ سکیں ——— اف توبہ آزادیٔ وطن بہت مشکل ہے ——— بہت محال ہے ——— مگر پاکستان کا قیام بھی ناممکن کہا جاتا تھا، وہ کیسے ممکن ہو گیا۔ الجزائر کی آزادی بھی ممکن ہے، بلکہ یقینی ——— مگر ہائے اللہ فرانسیسیوں نے کتنے مظالم کئے ——— کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، کوئی،

کوئی بات نہیں، کوئی بات ——"

پھر اسے نیند آگئی۔ اسے تو نیند آگئی مگر اس کے ماں باپ نہ سو سکے، انھیں یہ فکر دامنگیر ہو گئی کہ اس کے دماغ پر حب الوطنی کا جنون سوار ہو گیا ہے۔ اب اس کے ماں باپ بے خواب رہنے لگے۔ زبیدہ ان کو بہت پیاری تھی اس لئے وہ اس کا بال بیکا ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں یہ قومی فرض کو اپنے دماغ پر اتنا سوار نہ کر لے کہ بغیر سوچے سمجھے آزادیٔ وطن کی تحریک میں شامل ہو جائے۔ اب اس کے والدین نے دینی اور سیاسی تبادلۂ خیال کرتے وقت طریقے طریقے سے یہ بھی سمجھانا شروع کر دیا کہ تحریک میں شامل ہونے والے خاص مزاج کے آدمی ہوتے ہیں اور عہدہ برا بھی خاص ہی ڈھب کے لوگ ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس سے پہلے اس کے والدین کا تبادلۂ خیال ترغیبی ہوتا تھا اس لئے زبیدہ رفتہ رفتہ یہ حقیقت محسوس کرنے لگی کہ وہ اسے اپنی محبت کے سبب عملی زندگی میں داخل ہونے سے گریزاں کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اس احساس کا اس نے اب تک ذکر تو نہ کیا لیکن وہ ان کی تاویلات پر چوکس ہو گئی اور اپنے آزادانہ نقطۂ نگاہ کو، جس کی تربیت اسلامی فطری تعلیمات نے کی تھی، بھٹکنے نہ دیا۔

۲

روزانہ کے معمولات میں تحریک آزادی کا ذکر کچھ ایسی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس کے بغیر الجزائری اپنی زندگی کو بے کیف زندگی سے تعبیر کرنے لگے۔ وہ سمجھنے لگے کہ اس ذکر کے بغیر اِن کے جسموں میں زندگی کی کوئی رمق نہیں۔ گھر ہوں یا دفتر، کاروبار کی منڈیاں ہوں یا تفریح گاہیں۔ سیر گاہیں ہوں یا گذر گاہیں کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں تحریک آزادی کا تذکرہ نہ ہو رہا ہو۔ اوّل تو حریت پسندوں کو ساری ساری رات نیند نہ آتی تھی لیکن آتی بھی تو اس میں خواب وہ اِسی تحریک آزادی کے دیکھتے ــــ ہوٹلوں اور کلبوں میں بھی اسی کا ذکر رہتا تھا۔

الجزائر کے شہروں میں شہر الجزیرہ ناقابل فراموش خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ شہر الجزائر کا دار لسلطنت ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت کا مالک ہے جس کی

آبادی تین لاکھ سے کچھ اوپر ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ترقی یافتہ ہونے کے لحاظ سے یہ بحیرۂ روم کے ساحل کے فرانسیسی شہروں کی مانند ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس کی بعض خصوصیات فرانس کے اچھے شہروں پر بھی فوقیت حاصل کر گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے بازار بے حد کشادہ ہیں اور ان کشادہ بازاروں میں قہوہ خانے جابجا نظر آتے ہیں۔ بازاروں کے ساتھ ساتھ حسین و دلآویز چمن زار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان چمن زاروں کے اردگرد لوہے کے خوبصورت اور مضبوط جنگلے لگے ہوئے ہیں۔ یہ جنگلے ظاہر کرتے ہیں کہ شہر کے ہنگاموں سے الگ چمن زاروں کی اپنی حکومت ہے اور اس حکومت میں باہر کی حکومت سے مختلف قوانین و احکام کی حکمرانی ہے۔

کشادہ سڑکوں کا منظر اپنی جگہ دلکش ہے مگر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والی وہ رونق ہے جو انبوہِ انسانی کی مرہونِ منت ہے۔ سڑکوں کے کناروں پر کتب فروشوں کی دکانیں، عمدہ ریستوران اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی بے شمار دکانیں ہیں کوئی دکان اپنے گاہکوں سے خالی نہیں۔ ریستورانوں میں تو تل دھرنے کی جگہ نہیں لوگ چھوٹی چھوٹی میزوں کے آس پاس بیٹھے مختلف قسم کے مشروبات پیتے رہتے ہیں، لیکن زیادہ تر قہوہ پیا جاتا ہے۔ ہر طرف سے اس کی چسکیوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں میں آتے جاتے مونگ پھلی کی گریاں کھانے کا سبھی کو شوق ہے۔ وہ رات کے وقت اس کے چھلکے پھینکتے چلے جاتے ہیں، لیکن جونہی رات کے آٹھ بجے کا ہنگام ہوتا ہے، کشادہ سڑکوں اور گلیوں کی ساری چہل پہل اور رونق ختم ہونی شروع ہو جاتی ہے اور پھر ہر متنفس کو اپنے بستر پر لٹا کر رات کی خاموشی پہرہ دینا شروع کر دیتی ہے۔

الجزیرہ کے بارونق نظاروں سے پیچھے نظر ڈالی جائے تو وہاں عربوں کے سفید سفید مکان نظر آتے ہیں جو ایک سلسلے میں تختہ بہ تختہ اونچے ہوتے چلے گئے ہیں۔

ان سفید مکانوں کا منظر بھی خوب ہے لیکن جو لوگ بلند ترین مکانوں میں رہتے ہوں گے ان کی آنکھیں الجزیرہ کی سمٹی ہوئی رونق کا کس قدر دلفریب منظر ملاحظہ کرتی ہوں گی۔ دلفریب اس لئے کہ جب ان کی آنکھیں رات کے آٹھ بجے کے ذرا بعد اٹھتی ہوں گی تو وہاں سناٹے کا منظر انھیں اس بات کا یقین دلا سکتا ہوگا کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔

ایک خاندان کا چشم و چراغ عقیل جس کا شروع میں ذکر آیا، طلوعِ آفتاب کے بعد ناشتہ کر کے گھر سے نکلا اور کشادہ سڑک پر لمبے لمبے ڈگ اٹھاتا ہوا سیدھا ایک ریستوران میں چلا گیا، ریستوران میں داخل ہوتے ہی وہ دو شخصوں کی گفتگو سننے میں محو ہو گیا، اس گفتگو کے انہماک نے اسے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بھی نہ بیٹھنے دیا۔ اگرچہ بیرے نے از راہِ ہمدردی اور بہ اندازِ مہمان داری کرسی پر بیٹھنے کی مؤدبانہ پیش کش کی لیکن اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے نہ میز کرسی تھی، نہ بیرا تھا اور نہ بیرے کی پیش کش تھی اس وقت اس کی آنکھیں بھی کان بنے ہوئے تھے۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک سوٹڈ بوٹڈ لمبے اونچے آدمی نے سامنے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کے سر پر قہوہ کی پیالی دے ماری اور اس کے سر سے خون کا فوارا چھوٹ پڑا۔

"الجزائر کی آزادی ایک خواب ہے جو بیداری کا روپ کبھی نہیں دھار سکتی!"

عقیل جو اب تک ساکت کھڑا تھا دوسروں کے سانس بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوڑا اور حملہ آور پر پل پڑا" اس نے گھونسے مار مار کر حملہ آور فرانسیسی کو ادھ موا کر دیا۔ جب فرانسیسی پولیس آئی تو وہ گرجتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہاری سامراجی طاقت بھی بہت جلد دم توڑنے والی ہے اسی طرح جیسے یہ فرانسیسی ظالم"۔

اتنے میں خون آلود نوجوان بھی قریب آ گیا اور فرانسیسی سپاہیوں کے سامنے للکار کر کہنے لگا "یاد رکھو میرا خون کبھی رائیگاں نہ جائے گا"۔

فرانسیسی پولیس جس کے پاس اقتدار تھا، جس کے پاس اسلحہ کا سہارا تھا، سیخ پا ہو گئی اور اس نے عقیل کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، خون آلود نوجوان کا بازو بھی ایک دوسرے

سخت گیر سپاہی کے ہاتھ میں تھا جس نے اسے کھینچنے کے بعد دو چار ناقابلِ برداشت ڈنڈے رسید کیے۔ نوجوان ضربوں کی تاب نہ لاکر بلند آواز سے چیخا "یہ ڈنڈے کیا چیز ہیں تمہاری پستول بھی الجزائریوں کو خاموش نہیں کر سکتی۔"

اتفاق کی بات گاڑی پر سوار زبیدہ اور اس کے والد گذر رہے تھے، یہ نقشہ دیکھ کر رک گئے اور زبیدہ تو اس طرح بھاگتی ہوئی آگے بڑھی جیسے وہ گھر سے اسی مقصد کے لیے نکلی تھی۔

"اچھا یہ بات ہے" یہ الفاظ فرانسیسی سپاہی کے تھے جس نے پستول نکال کر اس کا منہ خون آلود نوجوان کی طرف کر دیا۔ ٹھن کی آواز نے گولی نوجوان کے سینے سے گذار دی اور اور وہ نوجوان ایک دو منٹ میں ٹھنڈا ہو گیا۔

"بتاؤ الجزائری کی آواز ختم ہوئی یا نہیں" یہ طیش بھری آواز پستول چلانے والے فرانسیسی کی تھی جو نتھنے پھلائے ہوئے زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

"کبھی ختم نہیں ہو سکتی الجزائری کی آواز" یہ چیختی ہوئی آواز زبیدہ کی تھی۔ "مرد تو مرد الجزائر کی عورتیں بھی جان نثاری میں انشاء اللہ پیچھے نہ رہیں گی۔"

ایک طرف سے آواز آئی "انشاء اللہ" یہ آواز عقیل کی تھی جو دوسرے فرانسیسی سپاہی سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اتنے میں زبیدہ کے باپ نے بڑی ہی مشکل سے زبیدہ کو کھینچ کر گاڑی میں بٹھایا اور ڈرائیور سے گاڑی تیز کرنے کا اشارہ کیا "بیٹی تمہارا جذبہ بہت مبارک ہے مگر جلتی آگ میں یوں بے سوچے سمجھے نہیں کودا کرتے۔" زبیدہ آج گستاخ ہو گئی۔ اس نے دبے لفظوں میں باپ کو "بزدل" کہہ دیا۔ بزدلی کا طعن اس کا باپ کس طرح سن سکتا تھا مگر وہ یہ طعن سن کر خاموش ہو گیا۔ آج زبیدہ کچھ اور گستاخی بھی کر لیتی تو باپ برداشت کر لیتا کیونکہ وہ اپنی پیاری بیٹی کی کسی طرح جان بچانا چاہتا تھا۔

فرانسیسی پولیس بے ہوش فرانسیسی اور پرجوش الجزائری عقیل کو ایک کار میں بٹھا کر تھانے میں لے گئی جہاں سب سے پہلے بے ہوش فرانسیسی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی لیکن ابھی تک وہ ہوش میں نہ آیا تھا۔ تھانیدار خاموشی سے عقیل کی طرف آیا اور اسے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ آخر پوچھنے لگا۔ "تم نے فرانسیسی کو کس جگہ ضرب پہنچائی تھی؟"

عقیل نے صاف لفظوں میں جواب دیا۔ "میں نے ہی ضرب نہیں پہنچائی بلکہ میرے ساتھیوں نے بھی ضربیں پہنچائی تھیں۔"

"وہ ساتھی کہاں ہیں؟" تھانیدار کی آواز میں قدرے تیزی پیدا ہو گئی۔

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔" عقیل نے بھی قدرے تیزی میں جواب دیا۔

"بزدل" یہ لفظ تھانیدار کے تھے جس نے اس کی گال پر زور دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہے تھے۔ "اپنے جرم کو اپنے بھائی بندوں میں تقسیم کر کے قانونی طور پر بچنے کی ناکام کوشش کرنا چاہتے ہو؟"

عقیل ایک جھرجھری لے کر اٹھ کھڑا ہوا "یہ بات ہے تو لیجیے میرا بیان نوٹ کر لیجیے کہ میں ہی ذمہ دار ہوں فرانسیسی کو بے ہوش کرنے کا۔"

تھانیدار کڑک کر بولا۔ "نوجوان! تم بھولے ہوئے ہو تمہارا بیان نوٹ کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اگر فرانسیسی دم توڑ بیٹھا تو تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔"

"کچھ پروا نہیں۔" یہ الفاظ عقیل نے اپنے گلے کا پورا زور صرف کر کے کہے۔

عقیل کے اس جواب پر تھانے دار اور سپاہیوں کو جس قدر طیش آیا تھا وہ دو چار لمحوں میں عقیل کو شاید موت کی نیند سلا دیتا لیکن اچانک بے ہوش فرانسیسی کی لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ پاس کھڑے ڈاکٹر نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کی ہدایت پر نیم بے ہوش فرانسیسی کو ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا اور عقیل کو تھانے کے ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

عقیل کو کمرے میں بند ہوئے ابھی کچھ ہی گھنٹے ہوئے تھے کہ بموں کے دھماکوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں عقیل کے کانوں میں صاف آرہی تھیں اور ان آوازوں پر اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح دیوار کو توڑ کر باہر نکل جائے اور نہتے الجزائریوں پر مظالم ڈھانے والوں کے سر پھوڑ دے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ قید میں تھا۔ اس نے تاریک کمرے میں رہ کر چند گھنٹوں ہی میں غلامی کے کرب ناک لمحات کا احساس کر لیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد اس بات کا تصور کیا کہ اس کا الجزائر آزاد ہو گیا ہے مگر اسے تھانے کے بند کمرے سے رہائی نہیں ملی۔ یہ سوچ کر اس کے چہرے پر ایک خوشی کی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس نے اپنے دل میں کہا "میرے جیسے ہزاروں نوجوانوں کی قید و بند سے اگر الجزائر آزاد ہو سکتا ہے تو یہ مصیبتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، میرے جیسے نوجوان قید و بند کی مصیبتوں کو عین راحت خیال کریں گے۔"

"مگر یہ قید تو میرے لئے سوہانِ روح ہے"، اب اس کا تصور زائل ہو چکا تھا، وہ اب اپنے آپ کو ایک زخمی پرندے کی مانند سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے پیروں میں اتنی طاقت پیدا کرے کہ اس کے پھڑپھڑانے سے قید خانے کی دیواریں پنجرے کی تیلیوں میں تبدیل ہو کر ٹوٹنے لگیں اور پھر وہ اپنے مظلوم بھائی بندوں کی ٹولیوں میں جا شریک ہو۔

تھوڑی دیر اور گذری تو تاریک کمرے کا تالہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ایک سپاہی نے عقیل کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکالا اور کہا "تمہیں تو ہمارے ہاتھوں سسک سسک کر مرنا ہوگا، لیکن تمہاری اطلاع کے لئے میں بتائے دیتا ہوں کہ تمہارے بہت سے بھائی بندوں کو موت کا مزا چکھا دیا گیا ہے۔ جو کہتے تھے آزادی دو، ہم نے بموں اور مشین گنوں کے ذریعے ان کو آزادانہ قتل کر دیا ہے، میں تمہیں قتل گاہ کا منظر دکھانے آیا ہوں۔ تم نے قتل و غارت کی بہت سی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ مگر وہ قتل و غارت اصلی نہیں ہوتے، مصنوعی ہوتے ہیں، میں تمہیں بغیر ٹکٹ کے اصلی قتل و غارت کا نقشہ

دکھانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دیکھے جانے والے منظر میں قتل و غارت کا خون مصنوعی رنگ سے نہیں بنایا گیا بلکہ رگوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس سرخ خون کا منظر پیدا کرنے میں نقلی بندوقوں اور نقلی مشین گنوں نے نہیں بلکہ اصلی بندوقوں اور اصلی مشین گنوں نے حصہ لیا ہے۔"

سپاہی نے ایک بار اور اسے گریبان سے پکڑ کر تھانے سے باہر کی طرف کھینچا۔ عقیل کے طیش میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا اور وہ اس طیش میں فرانسیسی سپاہی سے زیادہ بلند اور کرخت آواز میں بولنا چاہتا تھا مگر فرانسیسی سپاہی کی گفتگو اتنی مسلسل تھی اور اس کے جملے اس قدر متصل تھے کہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ جب وہ تھانے سے باہر کی طرف دھکیلا گیا تو سپاہی کی گرفت سے آزاد تھا۔ اب وہ بولنا بھی چاہتا تو کچھ نہ بول سکتا تھا کیونکہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر انبوہ مرگ نظر آ رہا تھا۔ الجزائری مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جو فرش زمین کو لالہ گوں بنائے ہوئے تھی۔ عقیل ابھی یہ منظر اچھی طرح دیکھ نہ پایا تھا کہ وہ ایک دوسرے منظر کی تاب نہ لا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھے تھانے میں واپس چلا آیا۔ اس نے دیکھا کہ کتنی ہی چیلیں انسانی گوشت کھانے میں مصروف تھیں کسی کی گال میں شگاف پڑ گئے، کسی کی ٹانگ کی ہڈی باقی رہ گئی اور کسی کا سینہ ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل ہو گیا۔ اس وقت تھانہ خالی تھا اور حوالدار اور ایک سپاہی کے سوا تھانے میں کوئی نہ تھا۔ عقیل کو خوف زدگی کی حالت میں تھانے کی طرف واپس آتے دیکھ کر حوالدار کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے سپاہی کو حکم دیا کہ عقیل کو قتل و غارت کے منظر کا عادی بنایا جائے۔ سپاہی نے ایک بار پھر اسے گردن سے دبوچا اور بازار میں دور تک لے گیا۔ اب کے انسانی لاشوں اور عقیل میں بیس تیس گز کا فاصلہ رہ گیا۔ سپاہی نے اس کے بالوں کو کھینچتے ہوئے پوچھا "کہو الجزائر کی آزادی کا یہ تحفہ کیسا ہے؟"

اس سوال پر وہ سخت برافروختہ ہو گیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ جہاں سینکڑوں

لاشیں آزادی کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں وہاں ایک اور سہی - اس نے موقع پاکر سپاہی کی دائیں گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا - سپاہی کا سر بھنا گیا - ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے مسلسل مکّوں کی بارش کر دی مجاہد عقیل اگرچہ کچھ گھنٹے پہلے ماریں کھا کر ادھ مُوا ہو چکا تھا لیکن شہیدوں کا بدلہ لینے کے لئے اس میں قدرت کاملہ نے دس نوجوانوں کی طاقت بھر دی - چنانچہ اس کے مسلسل مکوں نے سپاہی کا کام تمام کر دیا - اب عقیل لاشوں کو پھاندتا ہوا تیزی سے چلنے لگا - اس نے راستے میں دیکھا کہ ایک سناٹا چھایا ہوا ہے، بازاروں گلیوں اور سڑکوں پر کوئی متنفس نظر نہیں آیا ابھی وہ اپنے گھر سے بہت دُور تھا کہ اسے سپاہیوں کا ایک جتھا لیفٹ رائیٹ LEFT RIGHT کرتا ہوا ایک سمت جاتا نظر آیا - اس جتھے کے پاس گنیں تھیں - اگر اس جتھے کی نظر عقیل پر پڑ جاتی تو وہ اس کو گولیوں سے چھلنی چھلنی کر دیتے - عقیل اپنی جان بچاتا ہوا تیز روی کے ساتھ چلتا گیا - آخر اپنے گھر آکر اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا - کرامت عقیل کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا -

"تمہیں اپنے بوڑھے والد کا خیال نہیں - جس کے سینے میں ممتا کا دل ہے، وہ تمہیں ڈھونڈنے کے لئے کب کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں - کہتے تھے کہ اگر واپس آؤں گا تو عقیل کو ہمراہ لے کر آؤں گا - ورنہ آؤں گا ہی نہیں"

عقیل نے فکر مند ہو کر کہا "پھر میں بھی انھیں ڈھونڈنے چلتا ہوں - بازار میں کوئی فرانسیسی سپاہی مل گیا تو وہ ان کے بڑھاپے کا ذرا بھی خیال نہیں کرے گا"

کرامت نے بھائی کا راستہ روک کر کہا "مت جائیے میں انھیں لاتا ہوں، اگر آپ اس وقت چلے گئے تو والد میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ میں نے آپ کو کیوں جانے دیا آپ یہاں آرام سے بیٹھ جائیں اور میں چلتا ہوں"

کرامت تو باہر چلا گیا اور عقیل گہری سوچوں میں گھر گیا - اسے بارہا خیال آیا کہ اگر وہ سپاہیوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو اس کا بوڑھا باپ کبھی جانبر نہ ہو سکتا —— یہ

خیال آتے ہی وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ سیاسی ٹولیوں کا ساتھ دینا چھوڑ دے۔ ابھی وہ اس فیصلہ پر مطمئن ہونے ہی والا تھا کہ اسے معاً یہ یاد آگیا کہ ریستوران میں ایک الجزائری پر فائر کرنے کے بعد جب فرانسیسی سپاہی نے یہ کہا تھا کہ "بتاؤ الجزائری کی آواز ختم ہوئی یا نہیں" تو اس کا جواب ایک نووارد نوجوان لڑکی نے یہ دیا تھا کہ "وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتی الجزائری کی آواز۔ مرد تو مرد الجزائر کی عورتیں بھی جاں نثاری میں انشاء اللہ پیچھے نہ رہیں گی"

نوجوان لڑکی کا یہ جواب جب معاً عقیل کے فیصلے پر مطمئن ہوتے وقت اس کے کانوں میں گونجا تو اس کے بدن میں زبردست کپکپی پیدا ہوئی اور وہ غیر ارادی طور پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا "مردوں سے بہتر تو وہ عورتیں ہیں جو موت کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتیں ——— میں اپنے والد کی ہر راحت کا خیال رکھوں گا لیکن انھیں یہ بھی سمجھاؤں گا کہ انھیں مجھ سے زیادہ عزیز اپنا وطن ہونا چاہیئے"

اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے اضطراری کیفیت میں ادھر سے اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس وقت اس کی چشم تصور لاشوں کا منظر دیکھ رہی تھی، جبھی تو اس کا طیش اس کے ہاتھوں سے عجیب حرکتیں کرا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے بائیں ہاتھ پر دائیں ہاتھ کا مکہ مارتا تھا۔ لاشوں کے تصور سے رہائی پائی تو پھر والد کا خیال آگیا۔ وہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ ابھی وہ پیچھے نہیں ہٹا تھا کہ سیڑھیوں میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھا تو والد اور کرامت تھے۔ والد اوپر آئے تو عقیل کو گلے لگا کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ انسان کتنا کمزور واقع ہوا ہے، عقیل کے مجاہدانہ عزائم پر والد کے آنسوؤں نے پھر فتح پالی اور اس نے تازہ فیصلہ یہ کیا کہ والد جانے دیں گے تو جائے گا، نہیں جانے دیں گے تو نہیں جائے گا، اور اس نے والد کو چارپائی پر لٹا کر ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔

عقیل اور کرامت کی چھوٹی بہن عزیزہ جو ایک مدت سے باہر گئی ہوئی تھی اچانک گھر آگئی اور والد کو پریشان دیکھ کر غم زدہ ہوگئی۔ اس نے بھی سارا ماجرا سنانے کے بعد عقیل سے منت کی کہ وہ اب باہر نہ جایا کرے۔

۴

۱۹۴۷ء کے اوائل میں جب ہندوستان کی آزادی کا سورج طلوع ہونے والا تھا، احمد بن بیلا، یوسف بن خذہ، محمد خضر، احمد حسین اور مصطفےٰ شریف وغیرہ شخصیتوں کے دل بھی الجزائر کی آزادی کے لئے تڑپنے لگے۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ برطانیہ اپنی بری، بحری اور ہوائی عظیم الشان فوجی طاقت کے باوجود حریت پسندوں کے نعروں سے عاجز آگیا ہے تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ اصلی طاقت یک جہتی، اتحاد، تنظیم، جرأت، ہمت عزم و استقلال اور شجاعت ہے، نہ کہ جنگی اسلحہ۔ جب ہندوستان کی غلامی کے نہتے اقدامات سلطنت برطانیہ میں زلزلہ پیدا کر سکتے ہیں تو الجزائری باشندوں کے عزم و استقلال سے یہ کہاں بعید ہے کہ فرانس کی سرزمین میں بھونچال آجائے ——— چنانچہ احمد بن بیلا نے اسی سال الجزائر کی تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ فرانس کے مظالم نے چیدہ چیدہ مسلمانوں کو قوم

پرستوں کی ایک خفیہ پارلیمانی پارٹی بنانے پر مجبور کیا جس کے رکن شروع میں احمد بن بیلا بھی بنے اور انھوں نے اپنے رفقا کے ساتھ اس پارٹی کی سرگرمیوں میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ دو سال ہی گذرے تھے کہ اپنی بہترین تنظیم کے اعتبار سے یہ قابل اعتماد پارٹی بن گئی۔ اس پارٹی نے ۱۹۴۹ء میں الجزائر کے شہر عوران کے ایک ڈاکخانے پر حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں میں احمد بن بیلا، محمد خضر اور دوسرے کئی مجاہد رہنما شامل تھے۔ فرانسیسی پولیس نے سب کو گرفتار کر لیا۔ قریباً اڑھائی سال کی قید و بند کے بعد ۱۹۵۲ء میں احمد بن بیلا اور محمد خضر جیل سے بھاگ نکلے۔ بن بیلا تو لیبیا کے راستے قاہرہ پہنچے اور وہاں اپنے دورانِ قیام میں الجزائر کے قومی محاذِ آزادی کے سربراہ بن گئے اور محمد خضر مراکش جانے کے بعد سپین پہنچے اور وہاں سے قاہرہ آگئے۔ ان کی غیر موجودگی میں مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا کا حکم سنایا۔

الجزائری خفیہ پارٹی کے سرگرم اراکین ایک تو اپنی ذات میں چٹان کی طرح اٹل تھے، دوسرے یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے دو ہمسایہ علاقوں کو اپنے بل بوتے پر آزادی کے قریب آتے دیکھ کر اور بھی سخت جان بن گئے۔ ان کی بصارت اور بصیرت کو پتہ لگ گیا کہ عزم و استقلال کے لابدی خوشگوار نتائج سامنے ہیں، وہ بھی اگر عزم و استقلال کی چٹان بنے رہے تو انھیں بھی نعمتِ آزادی مل کر رہے گی۔

الجزائری رہنماؤں کی آنکھوں کے سامنے مراکش اور تیونس کی سیاسی تحریکوں کے حالات آئینہ کی طرح صاف اور واضح تھے۔ مراکش کے عوام کو فرانس سے ایک تو یہ شکایت تھی کہ مراکش کی حکومت میں مراکش کے لوگوں کا مطلقاً دخل نہیں۔ دوسرے مراکش کی شہری آزادی صفر کے برابر ہے جس کی مثال یہ ہے کہ سیاسی پارٹی "استقلال" کا شائع کیا ہوا رسالہ پڑھنے والوں، تقریر کرنے والوں اور حکومت پر نرم سے نرم تنقید کرنے والوں کو قید کر دیا جاتا ہے تیسرے مراکشی لوگوں کو اعلیٰ درجے کی اسامیوں سے یکسر محروم رکھا جاتا ہے چوتھے بہت کم فیصد مراکشیوں کو حصولِ تعلیم کا موقع دیا جاتا ہے۔ پانچویں مراکش کے لوگوں

سے وصول کیے ہوئے ٹیکس سے ان فرانسیسی سپاہیوں کو تنخواہیں دی جاتی ہیں جو قوم پرست مراکشی لوگوں کی نسلیں ختم کرنے کا فرض ادا کرتی رہتی ہیں۔ مراکشی عوام کو چھٹی شکایت یہ تھی کہ مراکش کی معدنیات پر ان کی بجائے فرانسیسیوں کا تصرف ہے۔ یہ اور اس طرح کی کئی اور شکایات مراکشیوں کو سمندر پار رہنے والے حاکموں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ حکومتِ فرانس نے سترہ سالہ سلطان محمد پنجم کو مراکش کا فرماں روا بنایا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ نوعمر سلطان اپنے حاکموں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے گا۔ وہ مراکش کا صحیح معنوں میں خیر خواہ تھا لیکن بجائے قتل و غارت کا منظر پیدا کرنے کے فرانس کے ساتھ مراکش کو آزادی دلانے کے سمجھوتہ کی پالیسی پر عمل درآمد کرنا چاہتا تھا۔ غلاوی جو ایک بوڑھا سیاسی آدمی تھا، وقت گذرنے کے ساتھ سلطان محمد پنجم کو قوم و ملک کے حق میں مضر خیال کرنے لگا چنانچہ ایک موقع پر اس نے سلطان کے منہ پر تحائف پیش کرنے کے ساتھ الزامات بھی عاید کر دیے جس کے جواب میں سلطان نے "او کتے" کہہ کر محل سے نکلوا دیا۔ بیرونی ملکوں کے فرانسیسی مقبوضات پر جو اثرات پڑتے رہے اس میں ایک طویل مدت گذر گئی لیکن سلطان محمد مراکش کا فرماں روا قائم رہا۔ ایک وقت فرانس نے سلطان محمد کے رویے کو اپنے خلاف پا کر غلاوی کی مخالفت کو شہ دی جس نے فوج ہمراہ لے کر سلطان کے محل کا محاصرہ کر لیا چنانچہ ۲۰۔ اگست ۱۹۵۳ء کو فرانس کے حکام نے سلطان محمد پنجم کو پہلے کارسیکا بھیجا اور پھر افریقہ کے دور افتادہ جزیرہ مڈغاسکر میں نظر بند کر دیا۔ اب سلطان محمد پنجم کی بجائے بوڑھے کو مراکش کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یہ اقدام غلاوی کے منشا کے مطابق ہوا کیونکہ اس وقت غلاوی فرانس کا ختا پورا کرنا چاہتا تھا۔

فرماں روا خواہ کتنا ہی حاکم اعلیٰ کا کٹھ پتلی بنے لیکن عوام کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت عوام کی ترسی ہوئی نگاہیں سلطان محمد پنجم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ غلاوی کی کوشش سے جس بوڑھے فرماں روا کا سکہ چل رہا تھا اس کی موجودگی میں حکومت

فرانس انعام کے طور پر مراکش کو ہوم رول دینے کا ارادہ کر رہی تھی۔ وقت گذرتا گیا عوام اور حکومت کی کش مکش کے باعث قریباً روز کشت وخون کا بازار گرم رہنے لگا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جلاوطن کردی گئی، کارخانے برباد کردئے گئے ـــــ یہ سارا نقشہ دیکھ کر ایک روز غلاوی کا اونچا سر آپ ہی آپ نگوں ہوگیا اور اس کے خیالات میں زبردست انقلاب آگیا۔ اس کے دل کی آنکھیں روشن ہوگیئں۔ اسی نئی روشنی میں اٹھا اور اس نے ۸۴ سالہ بوڑھے شیخ کی جگہ پھر معزول نوجوان فرماں روا سلطان محمد پنجم کو تخت نشین کرنے کی تجویز کی۔ یہی نہیں بلکہ کسی طریق سے سلطان محمد پنجم کو مڈغاسکر سے بذریعہ ہوائی جہاز وطن میں پہنچایا۔ یہ ۹ نومبر ۱۹۵۵ء کا دن تھا جبکہ وہ سلطان محمد پنجم کے پاؤں پر گر گیا اور پھر سلطان کی عبا کو بوسہ دینے کے بعد غم ناک آواز اور نمناک آنکھوں کے ساتھ معافی مانگ لی۔

حکومت فرانس جو غلاوی کو اپنا قابل اعتماد غلام سمجھے ہوئے تھی سخت حیرت زدہ ہوئی، لیکن وہ وقت کی اس آواز کو دبا سکنے کی جرأت نہ کرسکتی تھی جس کا مقابلہ توپوں کی آوازیں بھی نہیں کرسکتیں چنانچہ ۲ مارچ ۱۹۵۶ء میں ہوم رول کی بجائے مراکش کو کامل آزادی ملی جس کی خوش آئند خبر نے ہمسایہ علاقہ الجزائر کے ایک ایک باشندے میں اپنا ملک آزاد کرنے کا بے مثل حوصلہ بخش دیا۔

الجزائری رہنما مراکشی عوام کی خوشی کے ساتھ اپنی خوشی کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ چند ہی دنوں بعد یعنی اپریل کے پہلے ہفتے میں تیونس کو بھی کامل آزادی مل گئی، اب تو الجزائری کہنے لگے کہ جب مسلمانانِ ہند کا نعرہ یہ تھا کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" ـــــ ـــــ اور وہ پاکستان لے کر رہے اور پھر جب مراکش کی طرح تیونس بھی حبیب بورقیبہ جیسے فہیم سیاستدان کی رہنمائی میں آزادی حاصل کرچکے تو الجزائر بھی انشاء اللہ اپنے مخلص رہنماؤں کے زیر قیادت آزاد ہو کر رہے گا۔

۵

اپریل کے اواخر میں مراکش اور تیونس کی آزادی سے خوشی کی لہر جو دوڑی اس کا اثر صرف آزاد مراکش اور آزاد تیونس ہی پر نہ پڑا، الجزائر نے بھی اس کا بڑھ چڑھ کر اثر قبول کر لیا۔ اس وقت خوشی کے احساس کے ساتھ مجاہدانہ عزائم میں بھی غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی۔

الجزائر کے سرکاری اور غیر سرکاری عوام کے علاوہ تعلیمی اداروں کے طلبہ اور طالبات پر بھی سیاسی حالات کا اچھا خاصا اثر پڑ گیا۔ وہ تعلیم میں دلچسپی کم لینے لگے اور سیاسیات میں زیادہ ہر ایک کی زبان پر الجزائر کا نام چڑھ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اساتذہ اسباق پڑھانے پر مامور تھے لیکن ان دنوں ان کے لیکچروں کا رخ زیادہ تر الجزائر کی صورت حال پر تبصرہ کرنے میں گذرتا رہا۔ جب اساتذہ خود سیاسیات سے زیادہ متاثر تھے۔ تو انھیں اپنے شاگردوں کے سبق یاد نہ کرنے پر شکایت کیوں ہوتی۔ الجزائریوں کی شہری، اقتصادی اور سیاسی حق تلفیوں کے علاوہ

تعلیمی حقوق کی جب بے دردی کے ساتھ پامالی ہوئی تو اس کا اثر ملک گیر ثابت ہوا۔ حکومت فرانس نے ارادتاً الجزائر کے عربی مدارس کی حوصلہ افزائی سے گریز کیا۔ یہ حکومت کی ایک زبردست سیاسی چال تھی۔ کہ الجزائری مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے عاری رکھا جائے تاکہ وہ سوجھ بوجھ اور فہم و تدبر سے سیاسی طور پر مضبوط نہ ہو سکیں۔ لیکن حکومت قدرت کے اس قانون کو فراموش کئے ہوئے تھی جو انتہائی حدود کو چھونے کے بعد ردّ عمل کے نتائج دکھاتا ہے۔ جب الجزائریوں نے دیکھا کہ فرانسیسی حکومت نے ۱۹۵۲ء تک عربوں کے مدرسوں کے لئے ایک پائی بھی منظور نہ کی تو ان کے انتقامی جوش نے پیمانۂ صبر لبریز کر دیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات ۲×۲ = ۴ کی طرح صاف طور پر آگئی کہ حکومتِ فرانس الجزائری عربوں کو فرانسیسی زبان میں فرانسیسی خیالات کا سبق پڑھانے پر تُلی ہوئی ہے الجزائر میں الجزائریوں کی غالب اکثریت کے باوجود عربی مدارس کی بے حد کمی تھی۔ چونکہ الجزائری باشندے فرانسیسی مدارس میں پڑھنا نہیں چاہتے تھے اور عربی مدارس آٹے میں نمک کے برابر تھے اس لئے اقتدار کی اس سیاسی چال کے تحت صرف دو فیصد مقامی آبادی تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔ صاحب احساس والدین کی طرح عقیل کے والد بھی اپنے لڑکے کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اسے فرانسیسی درسگاہ میں داخل کر رکھا تھا۔ جہاں اساتذہ اور طلبہ غالب اکثریت میں تھے۔ عربی سکولوں کی طرح ان سکولوں میں بھی الجزائر کے حالات کا ہر وقت ذکر رہتا تھا۔ فرانسیسی اساتذہ اور طلبہ کی زبان سے الجزائر پر تکلیف دہ تبصرہ سُن سُن کر الجزائری مسلمانوں کے کان پک گئے۔ وہ کوئی جواب دینا چاہتے مگر مصلحت روک لیتی۔ اساتذہ کے تبصروں میں دل دکھانے کا عنصر غالب ہوتا۔ عقیل باوجود پُرجوش نوجوان ہونے کے چپ رہا خاموش ہو جاتا رہا۔ تھوڑا عرصہ گذرا اس نے اپنے بوڑھے والد کی ٹانگیں دباتے ہوئے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف سیاسی تحریکوں میں حصہ نہیں لے گا لیکن ایک فرانسیسی استاد نے جغرافیہ کے سبق کو خیرباد کہنے کے بعد دِل آزارانہ انداز میں الجزائری مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کے خلاف جو زہر اگلنا

شروع کیا تو عقیل کا چہرہ طیش میں سرخ ہوگیا۔ اس کے کئی مسلمان ہم جماعتوں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں اس کے طیش کا بم پھٹ کر ان کی تعلیم کو نقصان پہنچانے کا باعث نہ بنے۔ عالمِ خفگی میں اپنے بوڑھے باپ کا چہرہ کئی بار نظر آیا جبھی تو وہ ہر بار اپنا غصہ پی جاتا رہا لیکن ایک وقت ایسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا باپ یوں کہہ رہا ہے "بیٹا! اب تو حد ہی ختم ہوگئی، اب تمہیں مداخلت کی اجازت ہے۔" اس سچے یا جھوٹے تصور کا سہارا لینے کے فوراً بعد عقیل اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ فرانسیسی استاد نے پوچھا "کیا چاہتے ہو؟" اس نے جواب دیا "میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الجزائر آزاد ہو کر رہے گا۔"

عقیل کے اس ایک فقرے نے ساری جماعت میں آگ لگا دی، ہر طالب علم اور ہر طالبہ اس کی طرف طیش بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ ایک فرانسیسی طالبہ جسے عقیل کے ساتھ محبت ہوگئی تھی، سر نیچا کئے رہی۔ گویا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ عقیل نے ایسی بات کیوں کہہ دی جس سے درسگاہ کی انتظامیہ کو اس سے نفرت ہو جائے گی اور اسے جلد ہی درسگاہ سے نکل جانا پڑے گا۔ اس طرح پھر وہ اپنے محبوب کے دیدار سے محروم رہ جائے گی۔

عقیل کی زبان سے ایک فقرے کا نکلنا تھا کہ ساری جماعت نے مخالفانہ آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ اچانک استاد کی زبان سے نکل گیا "مسٹر عقیل تمہارے اس طرح کے بیہودہ فقرے کا کیا اثر پڑا ہے۔"

عقیل نے جواب میں کہا "اتنا اثر تو پڑا ہے کہ ساری جماعت بوکھلا گئی ہے اور اب تک میرے کانوں میں مخالفانہ آوازیں آ رہی ہیں۔"

اُستاد نے کہا "دیکھو مسٹر! شاگرد کو استاد کے سامنے فرماں بردار شاگرد بن کر رہنا چاہیے۔"

عقیل نے کہا "اور وہ میں خدا کے فضل سے ہوں لیکن اس کے مقابلے میں استاد کو بھی اپنی حدود کا علم ہونا چاہئے تاکہ تجاوز نہ ہو۔"

اُستاد نے طنزیہ لہجے میں کہا "میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

عقیل بولا "میں اس لائق تو نہیں کہ شاگرد ہو کر اُستاد کو کچھ سمجھاؤں لیکن موجودہ دور میں بعض مسائل ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ سمجھانے کا فرض نوجوانوں ہی کو ادا کرنا پڑتا ہے پاکستان کے ایک مشہور شاعر نے موجودہ دور کی کیفیت کا مزاج دیکھ کر کہا ہے کہ ع جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر۔ تو محترم سنیئے میں ایک سوال کے ذریعے سمجھاتا ہوں اگر کوئی کسی کے باپ کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹے تو آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہو گی؟"

اُستاد نے کہا "ہر کوئی اس سے نفرت کرے گا"۔

"تو پھر" عقیل نے فوراً کہا "الجزائر کی سرزمین کو ہم اپنا باپ سمجھتے ہیں۔ کیا ہم اپنے باپ کی بے حرمتی برداشت کر سکتے ہیں؟"

اُستاد نے ذرا تیز آواز میں کہا "کیا ہم اس کی بے حرمتی کر رہے ہیں؟"

عقیل نے جواب دیا "کیا یہ بے حرمتی نہیں کہ الجزائر ہے کسی کا اور قابض آپ ہیں"

"کس اصول کے تحت؟" اُستاد نے پہلے سے زیادہ تیز ہو کر پوچھا۔

"اِس اصول کے تحت" عقیل نے متحمل ہو کر جواب دیا "کہ الجزائر میں غالب اکثریت ہماری ہے آپ کی نہیں اور ہمارے اِس موقف کو سب ممالک تسلیم کر چکے ہیں"

"مثلاً؟" اُستاد نے معلومات چاہیں۔

"مثلاً عربی ممالک" عقیل نے جواب میں کہا جس سے اُستاد کا قہقہہ نکل گیا۔

عقیل کے غصے کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے کہا "محترم ایک اور ملک کا نام سنیئے —— روس"

اُستاد نے آپے سے باہر ہو کر کہا "تمہاری قوم کس قدر بے وقوف واقع ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ گذرا تمہاری آواز پر لبیک کہنے والوں نے اقوامِ متحدہ میں اِس مسئلہ کو پیش کرنا چاہا مگر یہ بالکل نہ سمجھے کہ یہ فرانس کا داخلی معاملہ ہے"

اب عقیل نے کہا "اُستاد محترم آپ ہی کی دلائی ہوئی سوجھ بوجھ اور شعور کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ ریاست الاسکا کے بارے میں جو امریکہ کا ایک حصہ ہے، آپ

کی کیا رلٹ ہے اسے امریکہ سے علٰحدہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹانا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو الجزائر کے معاملے کا اقوام متحدہ میں جانا ہرگز ناجائز نہیں ؟"

اُستاد لاجواب ہوگیا اور بات ٹالنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کرنے لگا۔" بیٹھ جاؤ گستاخ"

"عقیل نے کہا مسلمان جب اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تو اسے کوئی نہیں بٹھا سکتا۔"

عقیل کے اس جملے نے جماعت کے تمام طالب علموں کو سیخ پا کر دیا اور وہ اکیلے عقیل پر پل پڑے۔ چند مسلمان ہم جماعت شاید مقابلہ کرتے لیکن کچھ فرانسیسیوں نے اُنہیں بھی پیٹنا شروع کر دیا یکایک جو شور اٹھا تو ساری جماعتیں اور استاد، استانیاں اس طرف آگئیں اور معاملے کو سمجھے بغیر انھوں نے پیٹنے والوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ عقیل اور اس کے ساتھی بہت مشکل سے جانیں بچا کر بھاگے ان بھاگنے والوں میں وہ فرانسیسی حسینہ بھی تھی جو محبت کے معاملے میں مذہبی اختلاف کو حائل نہیں سمجھتی تھی۔

فرانسیسیوں سے مار کھانے کے بعد جب عقیل اور اس کے ساتھی بہت دور چلے آئے تو فرانسیسی حسینہ جس کا نام برتھائن تھا، ہمراہ آگئی۔ عقیل کو اس سے بالکل محبت نہ تھی اور نہ وہ اس سے محبت کرنا چاہتا تھا لیکن آج اس کے اس کردار نے اس کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالا کہ وہ فرانسیسی اساتذہ اور ہم جماعتوں کی نظر میں اس کی حامی بن کر ہمراہ چلی آئی۔ اسے صاف معلوم تھا کہ فرانسیسی اپنے دشمن کو تو بخش سکتے ہیں لیکن اپنی قوم کے غدار کو نہیں بخش سکتے۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر لا کر کہا۔

"ڈیر آپ آج کل کے حالات سے واقف ہی ہیں پھر آپ کو ایک فرانسیسی درسگاہ میں بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا آپ کو اس کا انجام معلوم نہیں تھا؟"

"مگر میں کہتا ہوں مس برتھائن!" عقیل نے کہا "کیا تم اپنے انجام سے ناواقف ہو؟ کیا تمہیں اپنے اہل مدرسہ کے اس سلوک کا اندازہ نہیں جو تمہارے واپس جانے پر وہ تم سے کریں گے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے"۔ برتھائن نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا "مگر مجھے اپنی کوئی پروا نہیں"۔

اور پھر بولی " ڈیئر آپ بہت سخت جان ہیں ۔ آپ بڑے بہادر ہیں پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ آپ مارے نہ جائیں آپ کو معلوم نہیں کہ فرانسیسی کتنے ظا ـــــ کتنے سخت ہیں "

عقیل نے کہا " تم نے پہلے لفظ کو پوری طرح ادا نہیں کیا ۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اپنی قوم کو ظالم کہنے والی تھیں "

برتھائن کی محبت نے اعتراف کر لیا تو عقیل بولا " پھر یاد رکھو برتھائن میں ظالم کا مقابلہ کرنے سے کبھی نہیں رک سکتا خواہ میری جان چلی جائے "

برتھائن نے فقرہ ختم ہونے سے قبل عقیل کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا " ایسا نہ کہیئے ڈیئر ایسا نہ کہیئے ۔ مجھ میں یہ بات سننے کی ہمت نہیں "

" تمہیں کیا ہو گیا ہے برتھائن " عقیل نے کہا " تم خواہ مخواہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہی ہو اب تمہیں الجزائری حریت پسندوں کا سخت مخالف ہو جانا پڑے گا ، تب جا کر تمہاری جان بخشی ہو سکے گی "

برتھائن بولی " ہاں آپ کو خطرات سے بچانے کے لئے مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا ۔ میں کیا کروں مجھے کیا ہو گیا ہے ـــــ ڈیئر آپ کو کیا ہو گیا ہے ، کیا آپ میری خاطر مصلحتاً خاموش نہیں رہ سکتے تاکہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے ۔

" برتھائن ! " عقیل نے مخاطب ہو کر کہا " تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ہمارے مذہب نے ایک جذبہ جہاد کا رکھا ہے ۔ یہ جذبہ ایسی شراب ہے جسے پینے کے بعد قدم اٹھانے والا پیچھے کی طرف دیکھنا نہیں جانتا ۔ یا تو وہ دوسرے کو ختم کر دیتا ہے ، یا خود ختم ہو جاتا ہے ۔ وہ خود ختم ہونا نہیں چاہتا جب تک وہ موت کا استقبال کرنے کا اپنے اندر جذبہ پیدا نہ کرے ، وہ لفخا سے جان توڑ لڑائی کس طرح کر سکتا ہے ۔ ہم ایسے ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جو امن پسندی میں بھی اپنی مثال آپ ہے اور جنگ کے وقت نبرد آزمائی میں بھی بے نظیر ہے ۔ تم مسلمان نہیں ورنہ تمہیں اس مذہب کے اصولوں کی قدر ہوتی "

برتھائین عقیل کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بڑی توجہ سے بات سُن رہی تھی، بات ختم ہونے پر بولی "کیا میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ میرے ساتھ شادی کر لیں گے "

عقیل نے کہا "تمہارا یہ جذبہ بھی صحیح نہیں۔ صرف مجھے اپنا بنانے کے لئے مذہب تبدیل کرنا معقولیت کے خلاف ہے۔ تمہارے مسلمان ہونے میں مجھے بہت خوشی حاصل ہو گی لیکن بغیر سوچے سمجھے مسلمان ہونا غلط ہے۔ ہمارا مذہب جب تک اپنی سچائیوں کو دلی طور پر تسلیم نہیں کرا لیتا تب تک کسی کے مذہب کی تبدیلی روا نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ہماری مذہبی کتاب میں واضح لفظوں میں موجود ہے کہ لا اکراہ فی الدین یعنی ہمارے مذہب میں زبردستی نہیں۔ تم شوق سے مسلمان ہو سکتی ہو۔ مگر اس شرط کے ساتھ نہیں کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہیں تو یوں کہنا چاہئے اگر اسلام سچا مذہب ہے تو میری محبت کامیاب ہو نہ ہو میں مسلمان ضرور ہو جاؤں گی۔" میں تمہیں فرانسیسی زبان میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھنے کے لیئے دے سکتا ہوں جو تمہیں ہمارے مذہب کے حقائق سمجھنے میں مدد دیں گی۔ تم اپنی طرف سے دیانت داری کے ساتھ غور کرنا کہ ہمارا مذہب سچا ہے یا نہیں۔ سچا ہوا تو مسلمان ہو جانا ورنہ انکار کر دینا۔"

برتھائین نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت اچھا مجھے آپ اپنی مذہبی کتابیں دیجئے میں ان کا مطالعہ ضرور کروں گی۔ کل اپنے ساتھ مدرسہ میں لیتے آیئے گا ___ مگر اُف! میں نے کیا کہہ دیا۔ آپ کا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں "

عقیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " اور یہ عجیب بات ہے کہ میں کل وہاں ضرور آؤنگا" یہ بات ختم ہوئی تھی کہ ایک کار نزدیک آئی جس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے، خدا حافظ کہہ کر عقیل گاڑی کی طرف لپکا۔ عقیل کے ساتھی بھی آگے بڑھے بعض اس میں عقیل کے ساتھ بیٹھ گئے اور باقی اس دوسری کار میں بیٹھ گئے جو ابھی آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں کاریں روانہ بھی ہو گیئں لیکن برتھائین چیخ چیخ کر کہتی رہ گئی "خدا کے لئے کل درسگاہ میں نہ آیئے گا۔ آپ کو اپنی مذہبی کتاب کی قسم! کل سکول میں نہ آیئے گا۔ آپ کو میری محبت کی قسم کل

——— آپ زندہ نہ رہ سکیں گے۔" لیکن اس کے لاشعور میں عقیل کے کہے ہوئے الفاظ اب تک گونج رہے تھے۔ "میں کل سکول ضرور آؤں گا۔ مجھے اپنی زندگی کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے الجزائر کی آزادی کی ضرورت ہے۔"

۶

کسی کو تیراکی سکھانے کے بعد اسے تیراکی سے روکا نہیں جا سکتا۔ زبیدہ ایک متحمل مزاج اور اعتدال پسند طالبہ تھی۔ سیاسیات میں اس کا دخل زیادہ حد تک سیاسیات سے واقف رہنے تک محدود تھا۔ لیکن فرانسیسیوں کے روز افزوں مظالم دیکھ کر اس اعتدال پسند طالبہ کی رگِ حمیت کا خون جوش مارنے لگا۔ دوسرے متعدد واقعات کے علاوہ ماضی قریب کا یہ واقعہ اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا کہ ریستوران کو خواہ مخواہ قتل گاہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ کیا ریستوران میں آنے والے مسلمانوں کا یہی قصور تھا کہ وہ حاکم وقت قوم سے تعلق نہ رکھتے تھے اور نہتے تھے؟ زبیدہ نے جب دیکھا کہ اب ان دنوں فرانسیسی پولیس کی خون خوار نگاہیں الجزائر کے چپے چپے کی نگرانی کر رہی ہیں اور معمولی سی تحریک کو بھی آناً فاناً کچل دینے میں تاخیر گوارا نہیں کرتیں تو اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور اپنے دل میں کہا

"اگر ہر کوئی اپنے گھر میں یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ خیر تحریک چلانے والے حکومت سے نبٹ لیں گے۔ تو دوسرے دن تحریک کا نام ونشان باقی نہ رہے۔" زبیدہ نے اپنے دل میں یہ بھی کہا: "میرے ماں باپ کو مجھ سے بہت پیار ہے اسی وجہ سے وہ میرے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرتے رہتے ہیں تاکہ میں تو دکسی تحریک میں شامل ہو کر انھیں داغ مفارقت نہ دے جاؤں لیکن کیا حضور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان مجاہدین کے دِل اپنے بھائی بہنوں اور ماؤں کی شہادت سے مغموم ہوتے تھے؛ مائیں بہنیں تو بلکہ مردوں کو الوداع کرتے وقت ایسے ایسے گیت گاتی تھیں جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ واپس آنا ہے تو غازی بن کر آؤ ورنہ شہادت کا درجہ حاصل کر جاؤ۔"

زبیدہ کو ایک عورت کا یہ واقعہ بھی یاد آگیا جو جنگِ احد میں سپاہیوں کو واپس آتے دیکھ کر ہر ایک سے پوچھ رہی تھی کہ کیا حضورؐ زندہ وسلامت ہیں؟ جواب دینے والے اس عورت کو اس کے شوہر اور بھائی وغیرہ کی شہادت کی خبر دیتے تھے لیکن وہ اِس خبر سے ایک لمحہ کے لئے بھی مغموم نہ ہوتی تھی۔ اور صرف یہ پوچھتی تھی۔ کہ کیا حضورؐ کو تو گزند نہیں پہنچا؟"

یہ واقعہ یاد کرتے وقت اعتدال پسند اور متحمل مزاج زبیدہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی "وکیا میرے والدین کو ایسا نہیں ہونا چاہئیے" اس احساس کی تیزی نے اِسے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا جہاں اس کے والدین بیٹھے تھے۔

"ابا جان! میں اِس وقت ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں"۔ زبیدہ کے چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ والدہ نے اِس کی سنجیدگی کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کے لئے کہا "وکیا تمہاری اِس ضروری بات میں میں شامل نہیں ہو سکتی؟"

"کیوں نہیں" زبیدہ نے کہا "آپ بھی شامل ہوں گی درحقیقت میں آپ دونوں سے بات کرنا چاہتی ہوں"۔ ابھی تک زبیدہ کے چہرے پر سنجیدگی کے واضح آثار تھے۔ اس کی والدہ نے ایک بار اور اس کی سنجیدگی کو توڑنے کے لئے کہا "تم یہ بات کرنا چاہتی ہو گی کہ

کہ آج دسترخوان پر کچھ شاندار قسم کی پلیٹیں ہونگی۔" مگر زبیدہ نے اپنی سنجیدگی کو بحال رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "امی جان! آج کل کے حالات میں شاندار پلیٹوں کا کیسے خیال آسکتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کو ایسا خیال نہ آئے —— میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ کیوں نہ آپ اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیں۔"

والد بولے "بیٹی! تمہارا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے مگر ہم کوشش تو یہی کرتے ہیں کہ حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں۔ مثلاً ہم سچ بولتے ہیں، ہم تعلیم کو پسند کرتے ہیں، ہم ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، ہم نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں، بیٹی! ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے۔"

والدہ نے متصلاً ہی کہا "ہاں بیٹی ہماری ہر وقت یہی کوشش ہوتی ہے، خدا ہمیں حضورؐ کے نقشِ قدم پر اور زیادہ چلنے کی توفیق بخشے۔"

زبیدہ نے کہا۔ "مگر امی جان! مجھے یہ واقعہ بھی یاد ہے کہ حضور کے تربیت یافتہ لوگ اپنی اولاد کو بڑی خوشی سے جنگ کے لئے رخصت کیا کرتے تھے، کیا آپ کے دل میں ایسا جذبہ نہیں ہونا چاہیئے؟"

والدین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، گویا دونوں کی نگاہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ زبیدہ وہی موضوع چھیڑ رہی ہے جو انھیں کسی وقت اپنی پیاری بیٹی سے محروم بھی کر سکتا ہے لیکن اچانک والد نے کہا "زبیدہ بیٹی! تمہارا خیال بہت نیک ہے۔ تم انشاء اللہ ہمیں اس جذبہ سے عاری نہیں دیکھو گی۔"

زبیدہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی اور اس نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں بھی کسی تحریک میں شامل ہوئی تو آپ بھی مجھے خوشی سے الوداع کریں گے۔"

والد بولے "مگر بیٹی تم نے اپنی سنہری تاریخ میں عورتوں کو جنگ میں شریک نہیں دیکھا ہوگا۔"
زبیدہ بولی "کیا ابا جان! خولہ عورت نہ تھی جو اپنے بھائی ضرار کی شہادت کا بدلہ لینے

کے لئے چمکتی ہوئی تلوار کے ساتھ جنگ میں گھس گئی تھی؟"

"تھی وہ ضرور عورت" والد بولے "مگر اس کو باقاعدہ طور پر جنگ میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تو خود ہی اپنے جذبہ کے تحت شامل ہو گئی تھی، اب الجزائر میں کون ضرار ہے جس کا بدلہ لینے کے لئے تم تحریک میں شامل ہونا چاہتی ہو۔"

زبیدہ کا چہرہ کسی حد تک سرخ ہو گیا۔ "کیا الجزائر کے چپے چپے پر جو مسلمان قتل کئے جا رہے ہیں وہ میرے بھائی نہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ سب ضرار کی طرح میرے بھائی ہیں اور ان کا بدلہ لینے کے لئے میرے جیسی گناہگار لڑکیوں کو ضرور تحریک میں شامل ہونا چاہیئے۔ کیا ابا جان! آپ کو حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعہ کا یہ منظر یاد نہیں کہ ان کے ساتھ خواتین بھی شامل تھیں؟"

والد نے کہا "بیٹی! خدا بہتر جانتا ہے میں تمہارے جذبۂ جہاد کو روکنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اسلامی جنگی تاریخ میں عورتوں کو کبھی باقاعدہ جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب کبھی خواتین شامل ہوئیں تو جبری اور ہنگامی حالات میں اپنے طور پر شامل ہوئیں۔"

زبیدہ نے کہا "چلئے یونہی سہی! کیا اس وقت ہمارے ملک کے حالات ایسے نہیں کہ مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی جنگِ آزادی میں شرکت کریں۔"

والدہ فکرمند سی ہو کر بولیں "زبیدہ بیٹی! مجھے تو تم سے ڈر لگ رہا ہے۔ ہم تمہیں تو دو منٹ بھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتے، پھر تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔"

اگرچہ والد بھی دل میں فکرمند تھے لیکن وہ اپنی فکرمندی ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا "نہیں بھئی تمہارا خیال صحیح نہیں، ہمیں بزدل نہیں ہونا چاہیئے، زبیدہ کا جذبہ بہت مبارک ہے۔ بس اسے صرف یہ بات سمجھانا ہے کہ کچی عمروں کا جوش ہوش سے قدم رکھنے میں مانع ہوتا ہے، لڑکیوں اور عورتوں کو زیادہ تر مدافعت کرنے کی تدبیریں کرنی

چاہئیں۔ ہاں اگر پانی سر سے گذرنے لگے تو پھر عورتوں کا مرد بن جانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر ہماری سنہری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک جنگ کے موقع پر چند عورتوں نے ایک حملہ آور مسلح کافر کو خیمے کے بانس مار مار کر ختم کر کے رکھدیا تو آج کل کی عورتیں حفظِ ماتقدم کے طور پر اسلحہ استعمال کرنے کا طریقہ کیوں نہ سیکھ لیں کہ جب ضرورت پڑے تو مقابلہ میں پیچھے نہ رہ سکیں۔"

زبیدہ اپنے والد کے ایسے حوصلہ افزا خیالات سُن کر بہت خوش ہوئی اور اس نے فرطِ مسرت سے باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ والد نے بھی اس کے ماتھے کو تین چار بار چوم لیا۔ "بیٹی یقین رکھو! تمہارے مجاہدانہ خیالات بہت اچھے ہیں لیکن تم کوئی قدم بھی ہماری اجازت کے بغیر نہ اُٹھانا۔ ہم خدانخواستہ تمہاری جان اور ایمان کے دشمن تھوڑے ہیں۔"

زبیدہ نے کہا "ابّا جان! سچ سچ بتائیے ریستوران میں جو واقعہ پیش آیا تھا کیا اس موقع پر میرا بولنا بے جا تھا؟"

والد نے جواب دیا "ہرگز نہیں"

زبیدہ نے کہا "ابا جان! شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ مجھے کھینچ کر گھر لے آئے تھے۔"

والد بولے "تمہاری زبان سے جو کچھ نکلا تھا وہ اضطراری کیفیت تھی مگر میرا بھی اس وقت فرض تھا کہ تمہارے ایسے جوش کو ٹھنڈا کرتا جو مسلح سپاہیوں کو بھڑکا کر تمہاری جان لے سکتا تھا۔ سچائی کے لئے جان کے چلے جانے میں تو کوئی ہرج نہ تھا لیکن تمہاری زندگی سے الجزائر آگے جا کر اپنی آزادی کے لئے جو خدمات حاصل کر سکتا ہے وہ اس سے محروم ہو جاتا —— اس لئے میری بیٹی! تمہیں قدم ضرور رکھنا چاہیئے مگر اس طرح سوچ سمجھ کر حتے الوسع تمہاری جان ضائع نہ ہو تاکہ اس سے قوم اور ملک زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔"

زبیدہ کی خوشی کی آج کوئی انتہا نہ تھی، اس نے اسی خوشی میں شام کے کھانے کا خود انتظام کیا اور اچھے اچھے کھانے تیار کر کے دسترخوان پر چنے۔ ابھی سب لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ انھیں متصلہ مکان میں شور سا سنائی دیا۔ والد بھاگے بھاگے گئے تو پتہ چلا کہ ان کا نوجوان

لڑکا تحریک میں مارا گیا ہے اور اس کی لاش کو چیلیں کھا گئی ہیں۔

زبیدہ کی والدہ نے دسترخوان اٹھالیا اور اظہارِ افسوس کے لئے سب کے سب ہمسائے کے گھر چلے گئے، انھیں تسلّی دی، غائبانہ جنازے میں شامل ہوئے اور پھر شام کو اپنا رکھا ہوا کھانا اِنھیں زبردستی کھلایا۔

۷

زبیدہ یورپی سکول میں پڑھتی تھی قابل ہونے کی وجہ سے سب اس کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ مسلمان اساتذہ کے علاوہ فرانسیسی اساتذہ کے دلوں میں بھی اس کی بڑی قدر و منزلت تھی زبیدہ بڑی ذہین لڑکی تھی اور ہر مضمون کو فوراً سمجھ جاتی تھی اساتذہ کو پڑھائی میں اس سے کبھی شکایت نہ ہوئی تھی۔

نوجوانوں کی رگوں کا خون چونکہ زیادہ گرم ہوتا ہے اس لئے مدت کے حالات میں یورپی سکول کے طلبا میں مخالف اور موافق کا خوب جوش دیکھا جانے لگا۔ مخالف جوش زیادہ تھا کیونکہ یہ عربوں کا سکول نہ تھا بلکہ یورپین کا تھا۔ طالب علم آپس میں الجزائر کی تحریک آزادی کو عام طور پر زیر تبصرہ لانے لگے۔ کئی شریر لڑکیاں اور لڑکے مسلمان طلبا اور

طالبات کو چھیڑنے کی غرض سے ذرا بلند آواز میں تبادلۂ خیال کرتے نظر آنے لگے - ان کا خیال یہ ہوتا کہ مسلمان اپنی تحریک کے خلاف اظہار خیال سُن کر بھڑکیں گے اور پھر ان کے طیش کو اقتدار کی طاقت سے ختم کر دیا جائے گا -

زبیدہ کو اگر اس کے والد نے آگ میں گرنے سے روک نہ دیا ہوتا تو وہ کب کی سرگرم بحث ہو کر کسی نتیجے کا باعث بنی ہوتی لیکن وہ اپنے والد کی سمجھائی ہوئی مصلحت کے تحت خاموش رہ جاتی رہی —— یورپی آبادکار طلبا اور طالبات کے نزدیک سب سے اہم طالبہ زبیدہ تھی - اور وہ اس کو کسی طرح بحث کے کانٹوں پر گھسیٹنا چاہتے تھے - اس کے کان یورپی آبادکاروں کی زبان سے مسلمانوں کے خلاف سخت دلآزار الفاظ سنتے مگر بے نیاز رہتے - زبیدہ کی بے نیازی چھیڑنے والوں کو اور زیادہ غصہ دلا دیتی اور وہ پہلے سے زیادہ دلآزار انداز میں آغازِ گفتگو کر دیتے - زبیدہ پھر بھی خاموش رہتی - شریر ٹولے نے جب دیکھا کہ زبان نے کچھ اثر نہیں کیا تو انھوں نے تخاطب کا طریقہ استعمال میں لانا چاہا - ایک روز تفریح کے وقت جب کہ زبیدہ کھیل کے میدان سے گذر رہی تھی تو مسٹر فرینکا اس FRANCOIS نے آواز دی "مس زبیدہ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہماری بات سُن جائیں"

زبیدہ نزدیک آئی اور کہا "میں الجزائر کے علاوہ ہر بات سننے کو تیار ہوں"

کسی کو بھی زبیدہ کے اس جواب کی توقع نہ تھی "لیکن میرا خیال ہے، تم جیسی لائق اور فہمیدہ لڑکی کو ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرنے کی وسعتِ قلب ہونی چاہیئے"

زبیدہ نے کہا "جس موضوعِ بحث پر خواہ جوش وخروش استعمال ہوتا ہو وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا کرتا میرے پاس ہوش کی تو دوا ہے مگر جوش کی نہیں"

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہماری گفتگو جوش کی حامل ہوگی" ایک طالبہ جولیٹن نے زبیدہ سے کہا -

زبیدہ بولی "کیا جوش کی حامل نہیں ہوگی - مس جولیٹن بار رہا تمہاری پرجوش گفتگو

سُن چکی ہوں ۔ لطف یہ ہے کہ تم سب ہم خیال ہو کر بھی ایسا اندازِ گفتگو اختیار کرتی رہتی ہو جو مخالف کے ساتھ بحث کرتے وقت ہونا چاہیئے ۔ تمہارے جوش کا جب یہ عالم ہے تو میں تم سے اس معاملہ پر گفتگو کرنے سے درگذری "

دو اور لڑکے بولے "چلیئے ہم آپ سے تبادلۂ خیال کرتے وقت جوشِ گفتار سے کام نہیں لیں گے "

زبیدہ نے کہا "یہ تمہارا دعویٰ ہے دلیل کا تعلق اس عادت سے ہے جو موجودہ سیاسی حالات نے راسخ کر دی ہے ۔ اس لیئے میں نہایت معذرت کے ساتھ درخواست کرتی ہوں کہ مجھے تم اس قابل نہ سمجھو "

یہ الفاظ کہنے کے بعد زبیدہ وہاں سے چلی گئی لیکن شریر ٹولے نے آپس کی رائے سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی دوسرے طریقہ سے الجزائر کے سوال پر اس کو گفتگو کرنے پر مجبور کر کے رہیں گے ۔

سکول کے اساتذہ میں صرف دو مسلمان اساتذہ تھے ، باقی سب فرانسیسی یا یورپی آباد کار اور حکومت کے وفادار تھے ۔ ایک روز غیر مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کے اس شریر ٹولے نے ، جو زبیدہ کو بحث میں گھسیٹنا چاہتے تھے اساتذہ کو اس بات پر مجبور کر لیا کہ سکول میں الجزائر کے سوال پر مقابلے کی تقریریں کرائی جائیں ۔ چنانچہ بدھ کا دن مقرر ہو گیا جس میں ابھی پانچ روز باقی تھے ۔ پرنسپل نے مسلمان اساتذہ پر اس بات کا زور دیا کہ مسلمانوں کو اس موضوع پر بولنے کیلئے مجبور کیا جائے ۔ نمائشی طور پر ایک فرانسیسی طالب علم کو تحریکِ آزادی کی حمایت کرنے کے لئے کہا گیا تاکہ بظاہر یہ نہ معلوم ہو کہ یک طرفہ کاروائی کی گئی ہے ۔

زبیدہ نے مقابلے کی تقریروں کا اعلان جب نوٹس بورڈ پر پڑھا تو پریشان سی ہو گئی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ معاملہ شرارت پر مبنی ہے ۔ وہ آج جب گھر آئی تو کھوئی کھوئی سی دکھائی دی ۔

زبیدہ کو خاموش پاکر اس کے والدین یہ سمجھ گئے کہ فرانسیسیوں سے پھر کوئی حریت پسندوں کی ٹکر ہو گئی

انھوں نے از خود دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رات پڑی تو زبیدہ نے اپنے والد سے خود بخود کہا "ابا جان! کل مقابلے کی تقریریں ہو رہی ہیں جس میں میں بھی حصہ لینا چاہتی ہوں، آپ مجھے ایک مضمون لکھ دیجیے"

"موضوع کیا ہے؟"

"یہی الجزائر"

"الفاظ کیا ہیں موضوع کے؟"

"اس ایوان کی رائے میں الجزائر، فرانس کا حصہ ہے لہذا اس کا حصولِ آزادی ایک بے معنی کوشش ہے"

والد مسکرا کر بولے "گویا تمہارے سکول نے یہ عنوان بہت طویل اور سخت بے معنی رکھا ہے"

"اور میں چاہتی ہوں کہ بے معنی عنوان کا بامعنی جواب دیا جائے" زبیدہ نے فوراً کہا۔

"مگر میں سمجھتا ہوں" والد بھی معاً بولے "کہ بے معنی بات کا بامعنی جواب خاموشی میں ہوتا ہے"

"اس کا مطلب یہ ہے" زبیدہ نے کہا "کہ آپ مجھے مقابلے کی تقریر سے روکنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ میری عزت کا سوال ہے"

والد بولے "مصلحت بہت کم موقعوں پر صحیح معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہی وہ موقع ہے جہاں مصلحت کا استعمال تمہیں ضرر سے بچا سکتا ہے"

"ضرر کیسا؟" زبیدہ نے پوچھا "یہ تو ایک علمی بحث ہے"

والد نے کہا "یہیں تو مجھے تم سے اختلاف ہے۔ میں اس بحث کو علمی میں سمجھتا سیاسی سمجھتا ہوں، خالص سیاسی، بلکہ ایک قدم بڑھ کر شرارت پر مبنی بحث"

زبیدہ نے ذرا توقف سے کہا "ابا جان! حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا احساس مجھے

بھی ہوا تھا لیکن اسلامی تعلیمات نے یہ بھی تو سبق دیا ہے کہ جب سچائی کی آواز کو دبایا جائے تو پھر حق پرستوں پر اس کا برقرار رکھنا فرض ہے ۔ اگر اس موقع پر میں خاموش رہی تو یہ گویا مجھ سے کتمانِ شہادت ہو گا اور کتمانِ شہادت کے بارے میں آپ مجھے کئی بار سمجھا چکے ہیں کہ یہ بہت بڑے گناہ کا باعث بنتا ہے ۔

زبیدہ کے والد اپنی بیٹی کے اسلامی فہم سے دل ہی دل میں بہت معترف اور خوش ہوئے ، اُنھوں نے دو چار ہی لمحوں میں اپنے ضمیر کی آواز سُن لی جو کہہ رہا تھا کہ " تم خود اپنی بیٹی کو سچائی کا سبق دیتے ہو اور خود ہی اِسے گریزاں کرانا چاہتے ہو ، تمہارا یہ عمل منافقت کی بیّن مثال ہے ۔"

وہ اپنے ضمیر کی اس آواز سے کانپ اٹھا اور اس فیصلے پر پہنچا کہ ہرچہ بادا باد ، چنانچہ اس نے زبیدہ سے کہا ۔ " ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی ، اب میرا خیال ہو گیا ہے کہ تمہیں مقابلے میں ضرور حصّہ لینا چاہیئے ۔ تُم اطمینان رکھو ، میں کھانا کھا لینے کے بعد تمہیں مضمون لکھ دوں گا ۔"

زبیدہ مطمئن ہو گئی ، کھانے کے بعد مضمون لکھا گیا جسے زبیدہ نے کئی بار پڑھ کر سمجھ لیا ، اب وہ اطمینان کی میٹھی نیند سو گئی ۔

صبح ہوئی تو باپ بیٹیا ناشتے سے فارغ ہو کر سکول کو روانہ ہوئے ۔ والد پرنسپل سے ملے اور کہا " مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج مقابلے کی تقریریں ہو رہی ہیں اور میری بیٹی بھی حصّہ لے رہی ہے اِس لئے میں بھی اس کی تقریر سننے آگیا ۔"

پرنسپل نے بظاہر اس کا بہت خوشی سے استقبال کیا لیکن اس کے اظہارِ مسرت کے دوران چہرے کے بعض چور آثار صاف بتا رہے تھے ۔ کہ آج کی مقابلے کی تقریریں تعلیمی نہیں بلکہ شرارت پر مبنی سیاسی ہیں ۔

نصف گھنٹے کے بعد سکول کی تمام جماعتیں سکول کے بڑے کمرے میں جمع ہو گئیں ۔ سامنے کی اسٹیج خاص طور پر زیادہ بڑی اور خوبصورت بنائی گئی تھی ۔ سامنے کی دیوار پر صدر ڈیگال

کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف بلیک بورڈ پر یہ لفظ لکھے ہوئے تھے "الجزائر فرانس کا حصّہ ہے"۔

پرنسپل اور اساتذہ اس کمرے میں مقابلے کی تقریریں سننے کے لئے جمع ہو گئے تو پرنسپل صدارت کی کرسی پر آ گئے۔ انھوں نے ابتدائی تقریر میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ آج کی مقابلے کی تقریریں سیاسی موضوع پر ضرور ہیں لیکن ہیں علمی اس لئے امید ہے کہ ایک دوسرے کے اختلافِ رائے کو ذاتی مناقشت کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ اب میں سب سے پہلے مس جیولیٹن کو تقریر کرنے کا موقع دیتا ہوں"۔

مس جیولیٹن کے نام لینے کی دیر تھی کہ وہ تیر کی طرح لپک کر اسٹیج پر آئی اور اس نے خطاب کے بعد اپنی تقریر شروع کی۔ تقریر کیا تھی دلائل کے بغیر جوش و خروش کے جذبات کا پلندہ۔ اس تقریر میں محض دعوے تھے اور ہر دعوے پر سارا سکول تالی بجانے لگ جاتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اجتماع سکول کا نہیں بلکہ کسی پارک کا ہے جہاں صرف سیاسی جلسے ہوتے ہیں۔ مس جیولیٹن کی تقریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ایک خیال کی پارٹی کا سیاسی جلسہ ہے جس میں حاضر لوگ پارٹی کے ہم خیال ہیں اور مقرر کے ایک ایک فقرہ پر جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں۔

مس جیولیٹن کی تقریر کے بعد احمد اللہ کا نام پکارا گیا مگر اس نے اسی وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر اظہارِ معذرت کر دیا۔

اس اظہارِ معذرت پر پرنسپل نے یہ الفاظ کہے "درحقیقت مس جیولیٹن کی تقریر اتنی مدلّل تھی کہ مسٹر احمد اللہ کو اپنے اظہارِ خیال کا پروگرام ترک کرنا پڑا اب میں رین بیزن کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔

رین بیزن بھی مس جیولیٹن کی طرح ایک تیر تھا جو تیزی سے سٹیج پر پہنچ گیا معلوم ہوتا تھا کہ سکول کے ہم خیال طلبا نے ایک ہی جیسے جذبات و خیالات پر مبنی تقریریں تیار کر لی تھیں۔

نگران کے پیرائے اور الفاظ میں خاصا فرق رکھا تھا۔ زین بیزن کی تقریر نے اپنے ہم خیال طلبا اور اساتذہ کو بے حد متاثر کیا جبھی تو سب اس کے ایک ایک جملے پر الفاظِ تحسین کی بوچھاڑ کئے جا رہے تھے۔

زین بیزن کی تقریر کے خاتمے کے بعد مخالف خیال کا کوئی مسلمان اسٹیج پر نہ آیا جس پر سارا سکول مضحکہ خیز ہنسی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ہنسی مسلمان طلبا پر بالعموم زبیدہ اور اس والد کے دلوں پر بالخصوص بجلی بن کر گری۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے آپ کو دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ زبیدہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس رویئے پر تبصرہ کرنے لگی مگر والد نے منع کر دیا، اور وہ حسرت کی تصویر بنی اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

چار طالب علم جن میں دو طالبات تھیں، اپنی اپنی تقریر کر چکے تو پرنسپل نے اٹھ کر کہا۔

"مجھے اپنے سکول کے ان مسلمان طلبا اور طالبات پر افسوس ہے۔ وہ نام لکھانے کے بعد بھی تقریر کرنے اسٹیج پر نہ آسکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حقائق کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی اور تعجب ہے کہ مس زبیدہ نے اپنا نام لکھانے کے بعد واپس نہیں لیا کیونکہ آج صبح ہی مجھے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ وہ تقریر کرنے ضرور آئیں گی، دیکھئے وہ اپنی تقریر میں دلائل پیش کرتی ہیں یا تاویلات۔ آیئے مس زبیدہ۔"

پرنسپل کے ان تعارفی الفاظ کے بعد زبیدہ سنبھلتی ہوئی اسٹیج پر پہنچ گئی اور پرنسپل کو آداب بجا لانے کے بعد مخاطب ہوئی۔

"محترم پرنسپل، معزز اساتذہ اور پیارے ہم جماعتو!

اس موقع پر مجھے تحریکِ الجزائر کی حمایت میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ میں شروع سے محسوس کر رہی ہوں کہ آج کے جلسے میں بہت جوش وخروش موجود ہے مگر میں درخواست کروں گی کہ میرے خیالات کی سماعت کے وقت اظہارِ جوش استعمال کرنے کی بجائے غور و فکر کو کام میں لایا جائے۔ اپنے خیالات کے اظہار سے پہلے یہ بات بھی عرض کرنا مناسب سمجھتی

ہوں کہ بلیک بورڈ پر یہ الفاظ درج ہونا مناسب نہیں تھے کہ "الجزائر فرانس کا حصہ ہے۔"

کیونکہ نہ تو ہمارا اسکول کوئی سیاسی پلیٹ فارم ہے اور نہ ہماری تقریروں سے ثابت ہو کر یہ اعلان ہو چکا ہے کہ "الجزائر واقعی فرانس کا حصہ ہے"

اِس جملے پر ایک طالبِ علم نے جوشیلی آواز میں کہا "یہ حقیقت ہے کہ الجزائر فرانس کا حصہ ہے"

زبیدہ نے بڑے تحمل کے ساتھ اس بے قاعدگی کی طرف پرنسپل کو توجہ دلائی جس پر انھوں نے بادلِ ناخواستہ طالبِ علم کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ زبیدہ نے اِن الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ "میرے خیال میں انسان دعوئی اور دلیل میں عام طور پر فرق نہیں کرتا اور ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ حالانکہ دوسرا رخ دیکھا جائے تو پھر تنقید و تبصرہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بلیک بورڈ کا ایک ہی رخ آپ کے سامنے ہے جس کی عبارت آپ سب نے پڑھ لی۔ اب اس کا دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے"۔

زبیدہ نے یہ کہہ کر بلیک بورڈ کا دوسرا رخ سامنے کر دیا جس پر یہ عبارت لکھی تھی "یہ تو وقت بتائے گا کہ الجزائر فرانس کا حصہ نہیں بلکہ الجزائری مسلمانوں کا حصہ ہے"

عجیب بات ہے کہ زبیدہ کے اِس طرح کے مظاہرہ پر کوئی بھی نہ بولا البتہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ سب غصہ پیئے بیٹھے ہیں۔ اب زبیدہ نے ایک اور عجیب و غریب حرکت کی۔ اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر بلیک بورڈ کے دونوں رخ صاف کر دئے اور کہا "مناسب یہی ہے کہ وقت سے پہلے کسی کا دعوئی تسلیم نہ کیا جائے، یہ تو واقعی وقت ہی بتا سکتا ہے کہ الجزائر فرانس کا حصہ ہے یا کہ الجزائریوں کا

اب میں ابتدائیہ سے کنارا کش ہونے کے بعد اصل موضوع کی طرف آنا چاہتی ہوں۔ آج کے اجلاس کا عنوان یہ ہے "اس ایوان کی رائے میں الجزائر فرانس کا حصہ ہے لہٰذا اس کا حصولِ آزادی ایک بے معنی کوشش ہے۔" جناب صدر اور معزز حاضرین! اوّل تو اِس عنوان کے الفاظ میں دلآزاری کا مفہوم پایا جاتا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ ایسا عنوان مجھ جیسی حریت پسند عورت کی وسعتِ قلب

کا امتحان کرنے کے لئے رکھا گیا ہوگا۔ میں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ خدا کے فضل سے میرا ظرف بہت بڑا ہے اور دلآزارانہ عنوان پر بھڑکنا نہیں جانتا صرف اطلاع کرنا فرض سمجھتا ہے کہ یہ عنوان دلآزارانہ رکھا گیا ہے۔

اب میں براہِ راست اپنے موضوع کی طرف آتی ہوں، اُمید ہے میرے خیالات کو نہایت غور اور ٹھنڈے دِل سے سُنا جائے گا۔

محترم خواتین وحضرات! الجزائر کی کل آبادی بچانوے لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جن میں ۱۲ - لاکھ یورپی آبادکار اور یہودی ہیں۔

ایک نوجوان فرانسیسی پر یہ حقیقت بیانی بہت شاق گذری، اِس نے اچھل کر کہا "یورپی آبادکاروں کی تعداد ۱۲ لاکھ نہیں بلکہ ۱۳ لاکھ ہے"۔

زبیدہ نے زیرِ لب مسکرانے کے بعد بڑے تحمّل سے کہا۔ "جو کچھ ہمارے اساتذہ نے ہمیں آداب سکھائے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جلسہ میں کسی سامع کو کوئی بات کہنی ہے تو وہ جناب صدر سے اجازت لے کر کہے، اُمید ہے آئندہ سے اِن آداب کا خیال رکھا جائے گا۔ کیونکہ اگر خیال نہ رکھا گیا تو آپ کی طرف سے یہ سمجھا جائے گا کہ آپ اپنی بیان کردہ تاویلات پر پردہ ڈالنے کے لئے آدابِ جلسہ کو بالائے طاق رکھ کر بے کار سا جوش دکھانا چاہتے ہیں"

زبیدہ کا یہ جملہ پرنسپل کو اچھا نہ لگا لیکن چونکہ اس کا اظہارِ خیال اُصولی طور پر درست تھا اس لئے۔ اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا "مس زبیدہ! تم اپنی تقریر کی طرف توجہ دو"۔

زبیدہ نے کہا "بہت اچھا"، اور پھر بولی۔

خواتین وحضرات! میں یہ کہہ رہی تھی کہ الجزائر کی کُل آبادی بچانوے لاکھ ہے جن میں بقول میرے ایک معزز ساتھی کے یورپی آبادکاروں کی تعداد تیرہ لاکھ ہے۔

فرانس نے ۱۸۳۰ء میں پہلی بار محض اس بہانے سے الجزائر پر حملہ کرنے کے دو سال بعد قبضہ کیا کہ الجزائر میں فرانسیسی سفیر کے ساتھ ناخوشگوار سلوک کیا گیا تھا۔ قبضہ کرنے کے

قریباً دو سال بعد ۱۹۰۳ء میں ایک آرڈی ننس کے تحت الجزائر کو فرانس کا لازمی حصہ بنالیا گیا اور یہ خیال ہی نہ کیا گیا کہ الجزائر میں اکثریت کس قوم کی ہے۔ ۱۸۷۰ء کے ایک قانون کے تحت اس ملک کو تین فرانسیسی صوبوں میں بانٹ دیا گیا۔ ان صوبوں کو اپنے لیئے قانون بنانے کی اجازت نہ دی گئی یہی وجہ ہے کہ یہاں کی اکثریت کی ذہنیت پر غلامی سرایت کرنے لگی۔

حکومت فرانس غیر منصفانہ طور پر الجزائر پر قبضہ کرنے کے باوجود مطمئن نہیں تھی۔ کیونکہ اسے اکثریت کے مخفی عزائم کا ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں اس نے اس دائمی خوف سے نجات پانے کے لیئے بظاہر ایک خوش آئند پالیسی پر عمل درآمد کیا یعنی الجزائریوں کو فرانسیسی پارلیمنٹ کے لیئے اپنے نمائندے اس شرط کے ساتھ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا کہ رائے دہندہ لوگوں میں غالب اکثریت فرانسیسی آبادکاروں کی رکھی جائے گی چنانچہ فرانسیسی پارلیمنٹ کے دوسرے اراکین میں الجزائری نمائندوں کی تعداد تیس سے زیادہ مقررہ نہ کی گئی الجزائریوں کی اکثریت کے ساتھ اس قسم کی اشک شوئی کر کے انھوں نے بظاہر الجزائریوں کو خوش کر دیا لیکن یہاں کے وہ خاص خاص حریت پسند باشندے جو سیاسی چالیں سمجھتے تھے حکومت فرانس سے روز بروز باغی ہوتے رہے اور اپنے باغیانہ خیالات کی تخم ریزی صحیح شعور رکھنے والے فہمیدہ لوگوں کے دلوں میں کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ الجزائری مسلمانوں نے الجزائر کی آزادی کے لیئے آواز اٹھانی شروع کی۔ اس آواز کا جواب ہوں، بندوقوں اور توپوں سے دیا گیا۔ جو الجزائری اپنے حقوق اور جائز مراعات سے محروم تھے ان کے شہر الجزیرہ اور قسطنطین کی خوبصورت اور پرشکوہ مساجد کو مسمار کر کے کلیساؤں میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے اوقاف کو اپنی تحویل میں رکھنے کے بعد ان کے نظم و نسق میں مسلمانوں کے دخل کو یک قلم ہٹا دیا گیا۔ اس دخل بے جا کا نتیجہ ظاہر تھا چنانچہ مسلمانوں نے مسلسل آزادی کی آواز اور زیادہ بلند کر دی۔ اس کا رد عمل یہ ہوا کہ تمام سرکاری سکولوں میں عربی کی تدریس ختم کر دی گئی۔ اس کی ایک ظاہر و باہر مثال ہمارا یہ سکول ہے جہاں بہت عرصہ پہلے عربی پڑھائی جاتی تھی

مگراب نہیں پڑھائی جاتی۔ میرا خیال ہے میرے اس بیان سے کسی کو اختلاف نہیں ہو گا"۔

اچانک ایک نوجوان یورپی آباد کار لڑکی اٹھ کر باآواز بلند کہنے لگی "تو پھر چلی جاؤ ادارہ عالیہ میں عربی پڑھنے کے لئے"۔

زبیدہ نے پرنسپل کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھئے جناب آداب جلسہ کی دوبارہ خلاف ورزی کی گئی ہے"۔

پرنسپل نے زبیدہ کو طنزیہ انداز میں جواب دیا "تم اپنا مقالہ ختم کرنے کی کرو"۔

زبیدہ نے کہا "بہت بہتر جناب —— ہاں تو میں اپنی دوست سے جس نے مجھے اس سکول سے نکل جانے کا مشورہ دیا ہے، یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب مجھے اس سکول کی کم ظرفی کا یقین ہو گیا تو الوداعی پارٹی لئے بغیر چلی جاؤں گی"۔

زبیدہ کے اس جواب پر مسلمان طلبا اور طالبات نے تالی بجائی۔ مگر تالی کی اس آواز کو یورپی آباد کاروں اور فرانسیسیوں کے انتقامی قہقہوں نے دبا دیا۔

زبیدہ نہایت متحمل مزاجی سے بولی "مضحکہ خیز قہقہوں کا کامیاب جواب خاموشی میں مضمر ہوتا ہے —— ہاں تو میں اب اپنی تقریر ختم کرنے کے قریب ہوں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ سرکاری سکولوں میں عربی پڑھانے کی مخالفت ہو گئی۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ پرائیویٹ سکول کھولنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ اگر کسی نے جرأت کی تو اس کے اساتذہ کو قید میں ڈال دیا گیا۔ کیا اس واقعہ سے کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ ایک استاد کو محض اس بنا پر چار سال جیل کی ہوا کھانی پڑی کہ اس نے طالب علموں کو الجزائر کی تاریخ پڑھانے کی غلطی کی تھی۔

محترم خواتین و حضرات! حاکم و محکوم میں جب اختلافات رونما ہوئے تو شہری زندگی کے شعبے میں الجزائریوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک روا رکھا گیا۔ اعلیٰ ملازمتوں کا تو خیال بھی دل میں نہ لا یئے، معمولی اور ادنےٰ اسامیوں پر صرف ان الجزائری مسلمانوں کو متعین کیا گیا جو "نبی اوئی اوئی" کہنے کے عادی تھے یعنی جو ہاں میں ہاں ملانے کے خوشامدانہ طور طریقوں کی پوری مہارت

رکھتے تھے۔

جناب صدر اور معزز خواتین و حضرات! اگر میں حقائق کے خلاف کہوں تو مجھے فوراً ٹوک دیا جائے۔ کیا کوئی شخص مجھے بتا سکتا ہے کہ سول سروسز میں الجزائریوں کا کتنا حصہ ہے۔ قابلِ کاشت اراضی کی کتنی پونجی الجزائریوں کے پاس ہے، جہازی کمپنیوں، بنکوں، تیل کی کمپنیوں اور مقامی ذرائع نقل و حمل کے علاوہ پبلک ورکس پر اس الجزائری قوم کا کتنا حق تسلیم کیا گیا ہے جو "بدقسمتی" سے اکثریت کا ناقابل تردید دعویٰ کرتی ہے۔

خواتین و حضرات! بظاہر یہ الفاظ بہت خوش گوار معلوم ہوتے ہیں کہ عرب اور فرانسیسی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کیونکہ ایک ہی ملک الجزائر کے رہنے والے ہیں لیکن جب بھائی کا بھائی سے ایک جیسا سلوک کرنے کا وقت آتا ہے تو ترازو کے ایک پلڑے کو اس قدر جھکا لیا جاتا ہے کہ دوسرا آسمان سے چھونے لگتا ہے۔ یہ اس لئے کہ دوسرے پلڑے کے ساتھ انسان تو انصاف نہیں کر سکتے وہ اپنی داد فریاد نیلی چھتری والے سے کریں۔"

اِس موقع پر ایک یورپی آباد کار استاد کو بھی جوش آگیا اور اس نے زبیدہ کو مخاطب کر کے کہا "دلیل؟"

"دلیل وہی ہے محترم جو میں اِس سے پہلے بیان کر چکی ہوں۔" زبیدہ نے فوراً جواب دیا "لیکن میں چاہتی ہوں کہ میں اپنی دلیل کو کچھ اور وزنی بنا دوں۔ لیجے سنیئے فرانسیسی حکمران بھائیوں نے اپنی محکوم قوم کے بھائیوں کے ساتھ یہ انصاف کیا کہ ۱۲۵ سال کے دورِ حکومت میں ۱۹۵۲ء تک عربوں کی تعلیم پر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب صرف ۲ فیصد کی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

خواتین و حضرات! میں اپنے مختصر سے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد آپ کے دلوں سے مخاطب ہو کر کہنا چاہتی ہوں کہ اب ایوان کی حقیقتاً کیا رائے ہے، کیا واقعی الجزائر فرانس کا حصہ ہے اور اگر ہے تو کیا حکومتِ فرانس کا اس کے ساتھ منصفانہ سلوک ہے یا غیر منصفانہ؟ اگر حقائق کے تحت غیر منصفانہ سلوک ہے تو اس کے لئے حصولِ آزادی کی

کوشش بے معنی ہے یا با معنی ؟"

اپنا مقالہ تمام و کمال پڑھ لینے کے بعد جب زبیدہ سدا بہار مسکراہٹ کے آثار چہرے پر لئے واپس ہوئی تو اس کے والد اور مسلمان لڑکیوں، لڑکوں نے اتنی بلند آواز سے تالیاں پیٹیں کہ فرانسیسی حکومت کے حامی بوکھلا کر رہ گئے۔

تالیوں کی تاب نہ لا کر سکول کے طالب علموں نے ان الفاظ سے کہ "الجزائر فرانس کا حصہ ہے" شور مچا دیا اور پرنسپل کو اختتامی الفاظ کہنے کی بھی اجازت نہ دی۔

زبیدہ کے والد نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہاں سے چلتے بنیں چنانچہ وہ وہاں سے چلے آئے۔ سکول کی چار دیواری سے نکل کر وہ بہت دور فاصلے پر پہنچ گئے لیکن سکول کے ہنگامے کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہی۔

۸

اِس میں شک نہیں کہ الجزائر میں فرانسیسی اور یورپی آبادکار مسلمانوں کے صرف آٹھویں حصے کی اقلیت تھے لیکن چونکہ اہلِ حکومت اور اہلِ اقتدار تھے اس لئے اپنے ہم وطن دشمنوں سے خوف زدہ نہیں تھے۔ اِن کا خیال تھا کہ جس طرح فرانسیسی پولیس الجزائریوں کی بڑی سے بڑی تحریک کو کچلتی آئی ہے اِس طرح اب بھی کچیے چلی جائے گی۔ البتہ مخالفین کے تمام تاثر سے ہٹ کر ایک خاص اثر رہنماؤں کے اُس ٹولے پر ضرور تھا جو حقیقت پسندانہ نظر رکھتا تھا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے ۳۱ اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۵۴ء کی وہ درمیانی رات تھی جب کہ مسلمانوں کی ایک خفیہ تنظیم نے الجزائر کے مختلف مقامات پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پے درپے حملوں کی بوچھاڑ کر کے حکومت کو سہما دیا تھا۔ ایک رات کے اندر اندر الجزائری مجاہدین نے پولیس کی چوکیوں، اسلحہ کے گوداموں، ملوں، ریڈیو سٹیشنوں، اہم فوجی تجارتی اور صنعتی مرکزوں کے

علاوہ ریل گاڑیوں، ٹیلیفون کے تاروں اور پٹرول کے ذخیروں وغیرہ پر اچانک حملہ کردیا تھا۔ حکومت اس حملے کی تاب نہیں لاسکی تھی اور وہ مجاہدین کے اس کارنامے کو ملیامیٹ کرنے میں بڑی طرح ناکام رہی تھی۔

فرانسیسیوں کو اگرچہ الجزائری مجاہدین کے حملوں کا یہ ردِعمل بھی یاد تھا کہ اس کے بدلے میں فرانس میں مقیم ڈیڑھ سو الجزائریوں کو شہید کردیا گیا تھا لیکن وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ الجزائریوں کا جہاد بڑی سے بڑی سزا اور عظیم سے عظیم مصیبت سے گھبرانے والا نہیں بلکہ اس کی قوت جہاد میں اضافہ کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان کے اقدامات روک دیئے جائیں۔

الجزائر کا کوئی کوچہ کوئی بازار، کوئی ادارہ، کوئی دفتر، کوئی سکول اور کوئی کالج ایسا نہیں تھا جو تحریکِ آزادی سے متاثر نہ ہو۔ سکولوں، کالجوں میں عقیلوں اور زبیداؤں کی کمی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت اور اس کے حامی باشندے روز بروز زیادہ سے زیادہ خائف نظر آنے لگے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں ایک مجاہد شخصیت فرحت عباس کے نام سے ابھری جس نے اپنی متعدد تقریروں میں اس مفہوم کے الفاظ کہے کہ ہمیں حکومت کے مظالم راہِ منزل میں واپس نہیں لا سکتے۔ تحریکِ آزادی میں حصے لینے والوں کو جہاں بن خدہ اور بن باللہ کے مجاہدانہ الفاظ خوب یاد تھے وہاں فرحت عباس کی بے خوفی بھی فراموش نہیں ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ عقیل نے اپنے بوڑھے باپ کی خاطر اپنے آپ کو سیاسی تحریک میں شامل ہونے سے روک دیا تھا لیکن دوسرے ہی دن جب وہ شہر میں گیا تو اسے قیامت نظر آگئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مشین گن نے نعرۂ آزادی لگانے والے الجزائری مسلمانوں کو بھون کر رکھ دیا۔ عقیل نہ جانے کس طرح جان بچا کر ایک مکان کے کواڑ کی اوٹ میں چھپ گیا ورنہ اس کا بھی قیمہ ہوجاتا۔ مکان کے کواڑ کی اوٹ سے سامنے کے میدان کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ مشین گن شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً گھوم کر قتلِ عام کئے جارہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے گھر پہنچا۔ چونکہ قتلِ عام کا شہرہ ہر جگہ ہوچکا تھا اس لئے عقیل کا بوڑھا باپ اپنے بیٹے کے انتظار میں آنسو بہا رہا تھا۔ عقیل آیا تو اس کی منت

سماجت کرنے لگا کہ آئندہ گھر سے نہ نکلنا۔

دس بارہ روز قیامت صغریٰ پر گذر گئے۔ ادھر عقیل کے والد کو چار روز سے بخار پڑنا شروع ہوگیا ان کا ایک خاندانی ڈاکٹر احمد حسن ان کے مکان سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔ عقیل نے کہا کہ وہ ڈاکٹر کو گھر بلا لائے مگر والد کہنے لگے کہ مدت ہوئی گھر سے نکلے نہیں، آج نکلتے ہیں چہل قدمی بھی ہو جائے گی۔ عقیل نے آمادگی پائی تو سواری کا انتظام کر کے گھر سے نکل پڑے۔ بگھی جب آدھ میل کے فاصلے پر پہنچی تو الجزائریوں کا ایک بہت بڑا جلوس نعرۂ آزادی لگاتا سمندری لہروں کی طرح امنڈتا دکھائی دیا۔ بگھی کو روک لیا گیا۔ جلوس جوش و خروش دکھاتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک طرف سے پولیس کی مسلح جلیپیں اچانک آگئیں ان میں سے مستعد سپاہی بندوقیں لئے باہر آگئے اور جلوس پر حملہ کر دیا جس طرف عقیل کی بگھی کھڑی تھی اس کے ساتھ ہی ایک گلی تھی جہاں سے اچانک مجاہدین کا ایک اور جلوس نکل آیا جو پولیس کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ پولیس کے کچھ سپاہی اس طرف آئے اور بندوقیں سیدھی کر دیں۔ کئی مجاہدین نے جوشِ ایمانی میں اپنے گریبان پھاڑ دئے اور کہا۔ "لو آزادی کے لئے ہمارے سینے حاضر ہیں" بس پھر کیا تھا حاضر سینوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ عقیل بالکل خوف زدہ نہ تھا لیکن اس کو اپنے والد کا خیال تھا جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا، ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور عقیل کے بوڑھے باپ کے سینے میں پیوست ہوگئی باپ نے بیٹے کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور یہ کہہ کر اپنی جان خدا کے سپرد کر دی "بیٹا! میرے جیسے مظلوموں کا ضرور بدلہ لینا اور آزادی حاصل کئے بغیر ہرگز ......" بس وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ آج اگر لاش ہمراہ نہ ہوتی تو اس نے بھی جام شہادت پی لیا ہوتا، وہ بگھی کو اپنے گھر لایا۔ لاش گھر آئی تو کہرام مچ گیا کرامت روتے روتے پاگل ہونے لگا۔ عزیزہ بے ہوش ہوگئی۔ عقیل کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کی زبان سے نکلا

"کاش میں خود بلا لاتا"

کرامت بولا۔ "تم گولی کا نشانہ بن جاتے تو پھر تمہارا والد کس طرح زندہ رہ سکتا۔"

کاش ہم دونوں ہی گھر سے نہ نکلتے۔" بھائی نے کہا۔

"کاش میں دنیا میں موجود ہی نہ ہوتی" عزیزہ بولی ۔" ہائے آپ لوگ کیسی دلخراش باتیں کرتے ہیں۔ میں مرجاؤں گی۔"

اس قسم کی بے اختیار باتیں سب کی زبانوں سے نکلتی رہیں۔ ایک فہمیدہ بزرگ بھی دیر سے آنسو بہاتے رہے مگر انھوں نے زبان نہ کھولی۔ جب لاش کو غسل دیا جا چکا تو کلیجے کو چیرنے والی ایک چیخ عقیل کے منہ سے نکلی، اس چیخ کے بعد وہی پہلے والے الفاظ کہ "کاش میں خود ڈاکٹر کو گھر بلانے چلا جاتا۔"

فہمیدہ بزرگ نے جب یہ دیکھا کہ صبر کا نام و نشان نہیں تو اس نے کہا "برخوردار اگر میں تمہارے غم کا اندازہ کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ اس طرح تمہارے بھائی اور بہن کے غم کی بھی کوئی حد نہیں۔ تم لوگوں کے بعد دوست ہونے کی حیثیت سے تمہارے والد کے انتقال کا جس قدر مجھے رنج اور افسوس ہے وہ بھی کسی طرح کم نہیں لیکن میں اس بات کا یقین دلا دوں کہ میرے دوست کو قابل رشک درجہ نصیب ہوا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے انھیں شہادت جیسی بیش بہا نعمت عطا کی ہے۔ تم کہتے ہو کاش تم خود ڈاکٹر کو بلانے چلے جاتے۔ ایسا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ تمہاری بجائے تمہاری لاش گھر میں آتی۔ تم کہتے ہو کہ کاش تم دونوں گھر ہی میں رہتے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ فرانسیسی ظالم سے یہ کہاں بعید تھا کہ تمہارے گھر کو گھیرے میں لے لیتے۔ اور اب تو صرف ایک متنفس روپوش ہوا ہے، پھر سب کے سب خاکستر ہو جاتے ——— میں کہتا ہوں کہ ہمیں بے سمجھی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں بلاشبہ غم کا زخم کاری ہے لیکن حکیم حقیقی نے اس زخم کے لئے مرہم تیار کیا ہے اس کا پھاہا بھی لگانے میں ہمیں غفلت نہیں برتنی چاہئے۔

عقیل جو اس وقت خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا، اچانک رونے لگا اور روتے روتے کہنے لگا "بزرگم بتایئے وہ مرہم کیا ہے؟"

بزرگ نے اپنے بہتے ہوئے آنسو بار بار صاف کرتے ہوئے رقت انگیز انداز میں بمشکل تمام جواب دیا "وہ مرہم ہے قرآن حکیم کی یہ آیہ مبارکہ ان اللہ مع الصٰبرین " اس آیت کے ادا کرنے کے بعد نہ جانے بزرگ کو کیا ہوا کہ ان کی ساری سمجھ سیلاب غم میں بہ گئی۔ وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگے۔" عقیل کی بہن بولی" ہائے چچا جان! آپ تو ہمیں صبر کی تلقین کر رہے تھے" اب آپ کا اپنا کیا حال ہے "۔

کرامت بولا" دوسروں کو نصیحت کرنا آسان ہے بزرگم مگر خود عمل کرنا مشکل ہے"۔

عقیل بھی نہ رہ سکا " ہاں چچا جان! جب آپ کو صبر نصیب نہیں، تو آپ ہم غم کے ماروں سے کیا امید رکھ سکتے ہیں"۔

بزرگ نے بہت دیر کے بعد اپنے آپ کو قدرے سنبھالا اور کہا "خدا تعالیٰ کے عطا کردہ مرہم میں کوئی فرق نہیں، یہ سراسر ہمارا قصور ہے کہ ہم مرہم لگاتے نہیں، ہماری گناہگاری مرہم کے فائدے کو زائل کر رہی ہے "۔

معلوم ہوتا تھا کہ بھڑاس نکالنے کے بعد سب کو کسی حد تک صبر آگیا۔ چنانچہ ہر آدمی انا اللہ مع الصٰبرین کا بار بار ورد کئے جا رہا تھا۔ شام سے پہلے پہلے جنازہ اٹھایا گیا اور جب عقیل اور اس کے بھائی بہن گھر واپس آئے تو سب فوجی سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ کرامت جو باپ کی حفاظت کے باعث گھر سے باہر قدم نہ نکالتا تھا، مستعد ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کئے بہن کو چمکارا اور کہا "ہر حال میں خدا کا شکر بجا لانا چاہیئے۔ اب تم گھر میں اللہ کی حفاظت میں رہو اور ہم تمہارے باپ کا بدلہ لینے چلتے ہیں "۔

عزیزہ نے کہا بھائی جان آپ دونوں شوق سے جایئے میں آپ کے لئے دعا کروں گی خدا آپ کو کامیاب کرے "۔

عزیزہ کے یہ حوصلہ افزا الفاظ دونوں بھائیوں کے نزدیک بہت غنیمت تھے وہ اس حوصلے کے سہارے اپنے گھر سے اس عزم کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے کہ وہ اپنے انتقامی

جوش کو کام میں لاکر استبدادی طاقتوں کو ملیامیٹ کر کے دم لیں گے۔

عقیل اور کرامت گھر سے نکلے ہی تھے کہ انھیں ایک ایسے اجتماع کے منعقد ہونے کا علم ہوا جس میں حصہ لینے والے طالب علم تھے۔ عقیل نے اپنے بھائی سے کہا "میں بھی ایک طالب علم ہوں اس لئے مجھے اس اجتماع میں پہنچنے کا پورا حق ہے"۔ کرامت نے باپ کے انتقال کا غم بھلانے کے لئے تھوڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اور میں بھی چونکہ طالب علم کا بھائی ہوں اس لئے میرا حق بھی بے جا نہیں"۔ چنانچہ دونوں بھائی پتہ معلوم کر کے جلسہ گاہ میں شریک ہو گئے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور زناٹے کی تقریریں جاری تھیں۔ صدر جلسہ ایک جوشیلا نوجوان تھا۔ غالباً یہ آخری تقریر تھی۔ مقرر طالب علم کہہ رہا تھا "ہمیں اپنے پرنسپل سے بڑی شکایت ہے جنھوں نے زبیدہ جیسی زبان دراز طالبہ کو پورا مضمون پڑھنے دیا جب ہمارے پرنسپل صاحب پر ایک ایک منٹ کے بعد ثابت ہو رہا تھا کہ اس کا زور بیان حکومت فرانس کے خلاف صرف ہو رہا ہے تو انھوں نے اس کی باقی تقریر کیوں اطمینان سے سُن لی۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ اپنے سکول میں زبیدہ کے خیالات سننے سے انکار کر دیں بلکہ اسے سکول کے احاطے میں داخل ہی نہ ہونے دیں"۔

کرامت نے یہ جلسہ سننے کے بعد عقیل سے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تحریک آزادی میں لڑکیاں بھی حصہ لینے لگی ہیں"۔

عقیل بولا "بھئی کرامت حکومتِ فرانس اپنی پولیس اور فوج کے ذریعے جو مظالم الجزائری حریت پسندوں پر روا رکھ چکی ہے اور رکھ رہی ہے ان سے ہماری زمین کانپ اٹھی ہوگی۔ لڑکیاں پھر بھی جاندار ہیں۔ ایک واقعہ تو میرے سامنے ہو چکا ہے۔ شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔ جس ریستوران میں فرانسیسی سپاہی ایک الجزائری کو گولی کا نشانہ بنا رہے تھے اس کے باہر اچانک ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی جس نے آوارہ سپاہیوں کو خوب خوب سنائی تھیں اور کہا تھا کہ الجزائری تحریک میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی شامل ہیں"۔

اس قسم کی گفتگو دونوں بھائیوں کے درمیان اپنے گھر واپس جاتے وقت ہو رہی تھی۔ اچانک ایک نوجوان ایک طرف سے بھاگتا ہوا گذرا۔ اس نے کہا

"یہاں سے بھاگ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

لوگ یہ سنتے ہی بھاگ اٹھے، دکانوں اور مکانوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ کرامت اور عقیل بھی اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے ایک مکان کی اوٹ میں ہو گئے۔ ان کا چابک دستی کے ساتھ اس طرح چھپ جانا مفید ثابت ہوا کیونکہ انھیں مسلسل دھماکوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں کوئی دو گھنٹے کے بعد دھماکے ختم ہوئے تو دونوں بھائی مکان کی اوٹ سے نکلے اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں پھر دھماکوں کی زوردار آوازوں نے ان پر ثابت کر دیا کہ انھیں ابھی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ کبھی تو پیدل بھاگتے کبھی کسی محفوظ گاڑی میں بیٹھ جاتے اور کبھی کہیں چھپ جاتے اس طرح وہ اپنے مکان سے بہت دور نکل گئے راستے میں کاروبار بالکل معطل نظر آیا۔ کوئی ہوٹل کھلا ہوا نہیں تھا، صرف شمالی حصے کا ایک ریستوران نظر آیا جس کے دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ دونوں بھائی جلدی سے اس میں داخل ہو گئے۔

"آپ لوگ یہاں کیوں آ گئے ہیں؟" یہ کڑک دار آواز ریستوران کے مینجر کی تھی۔

"کیا آپ مسلمان نہیں ہیں۔" کرامت نے کہا

"کیوں نہیں، میں مسلمان ہوں۔"

"تو کیا ہم مسلمانوں کو مسلمان بھی پناہ نہیں دے سکتے۔؟"

مینجر نے فوراً نرم ہو کر کہا "میرا مقصد خدانخواستہ یہ نہیں کہ آپ لوگوں نے اس ریستوران کی پناہ کیوں ڈھونڈی ہے بلکہ میری مراد یہ ہے کہ ایسے خطرے کے دنوں میں جیسا کہ آج کا دن ہے گھر سے کیوں نکلے ہیں۔ یا تو مجاہد بن کر حالات کا مقابلہ کیجیے یا پھر اپنے گھروں میں سر چھپا کر بیٹھ رہیے۔"

عقیل نے کہا "کیا آپ کسی الجزائری کے متعلق یہ خیال کر سکتے ہیں کہ وہ مجاہد نہیں ہوگا۔ فرانسیسی حکومت جس قسم کا خونی ڈرامہ ہمارے ساتھ کھیل رہی ہے۔ وہ جب بزدلوں کو بھی نڈر بنا رہا ہے تو ہمیں مزید جرأت کا سبق کیوں نہ دے گا۔ کیونکہ ہم پہلے ہی اس میدان میں کود چکے ہیں۔"

مینجر نے کہا "پھر تو میرے عزیزو! بغیر کسی معاوضہ کے اس ہوٹل کا دروازہ کھلا ہے کھانا بھی مفت کھائیے، رہائش بھی مفت رکھیے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی خدمت ہو تو بے تکلف کہیے میرا ریستوران بہت خوش قسمت ہے جہاں مجاہدین قدم رنجہ فرما رہے ہیں۔"

عقیل نے کہا "توبہ توبہ ہم صحیح معنوں میں مجاہد کہاں ہو سکتے ہیں البتہ خواہش ضرور ہے کہ اگر ہماری متاعِ جاں تحریک آزادی کو دو قدم آگے بڑھا سکتی ہے تو یہ نذرانہ پیش کر دیں۔"

مینجر نے کہا "یہی خواہش تو مجاہد بننے کی حقیقی دلیل ہے۔ آپ لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اس سے پہلے جو نوجوان میرے ریستوران میں آیا تھا اس کی کہانی کس قدر دلچسپ جرأت آموز اور ایثار پیشگی کا نمونہ ہے۔"

عقیل اور کرامت کو اس کہانی کے سننے میں دلچسپی پیدا ہوئی تو مینجر نے کہا "پہلے آپ تھوڑا سا کھانا کھا لیجیے پھر کہانی بھی سُن لیجیے گا۔"

9

اگرچہ کرامت اور عقیل کھانا کھانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے لیکن منیجر نے کسی طرح مجبور کر ہی لیا۔ انڈوں کے آملیٹ، ڈبل روٹی کے سلائیس اور بعد میں چائے یہ تھا مختصر سا کھانا جو منیجر نے پیش کیا۔ اس کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے کہانی شروع کی۔

"آج سے کچھ روز پہلے آج کی طرح ہمارے شہر کی گلیاں اداس تھیں، اس روز نہتے مسلمانوں نے حصولِ آزادی کے لئے گرم گرم خون بہایا تھا۔ تمام کاروبار معطل ہو چکے تھے۔ بموں کے دھماکوں کی وجہ سے سب ہوٹل اور ریستوران بند تھے، صرف میرا ریستوران کھلا تھا۔ اس میں ایک خوبصورت نوجوان کافی پی رہا تھا۔ اس کے کافی پینے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ کافی کی بجائے خون کے گھونٹ پی رہا ہے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ فرانسیسی سپاہیوں کے وحشت و بربریت کے مظاہروں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ کافی پینے

کے بعد کونٹر پر میرے پاس آگیا۔ "کافی کا کتنا بل ہے۔"

اس نے بل کی رقم ادا کی اور باہر نکلنے لگا مگر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر ٹھہرالیا۔ "یوسف صاحب آپ یہاں کیسے آگئے کیا آپ کو اپنی گرفتاری کا ڈر نہیں۔"

یہ یوسف بن خذہ تھے، جنھوں نے سیدھا ہو کر جواب دیا۔ "کیا آپ مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کو بزدل تو نہیں لیکن معاف کیجئے گا، بیوقوف ضرور سمجھتا ہوں۔ اگر فرانسیسی پولیس کو آپ کا پتہ چل گیا تو وہ آپ کی گرفتاری کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے سے گریز نہ کرے گی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ حکومت فرانس آپ کو سب سے زیادہ خطرناک باغی سمجھتی ہے۔"

میری اس بات کا جواب یوسف نے یہ دیا۔ "جہاں ہر روز بیسیوں مسلمانوں کے خون کی نہریں چلتی ہیں۔ وہاں میری حقیر سی جان کی کیا حقیقت ہے۔" یہ الفاظ کہتے وقت یوسف کی آنکھوں میں بے معلوم سے آنسو تھے جنھیں وہ پینے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے اس سے بہ منت کہا۔ "آپ آج رات یہیں ریستوران میں بسر کیجیے تاکہ آپ گرفتار نہ ہو سکیں، حالات معمول پر آجائیں تو چلے جایئے گا۔"

یوسف نے کہا "میں اتنا بزدل نہیں ——— کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے آزادی کی جو جنگ شروع کی ہے ہم اس کی آگ میں نہتے مسلمانوں کو دھکیل کر خود پہاڑوں میں چھپ جائیں گے آپ انشاء اللہ دیکھیں گے کہ ایسا نہیں ہو گا۔"

یہ الفاظ کہنے کے فوراً بعد وہ تیزی سے پلٹا اور کوئی پندرہ منٹ کے وقفے میں ایک تنگ سی گلی میں گم ہو گیا۔

مجھے دوسرے دن ہی یوسف کے جن حالات کا علم ہوا وہ بے حد جرأت مندانہ اور سبق آموز تھے۔ یوسف جب ریستوران سے نکلا تو اس کے کانوں سے ایک لرزا دینے والی چیخ اٹھی

اس کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو گئی، ایک بار اور چیخ گونجی یوسف اپنے انجام سے بے پروا ہو کر چیخ کی طرف بھاگا، گلی چونکہ اندھیری تھی اس لئے یہ معلوم ہو سکا کہ چیخ کی آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔ ایک بار اور چیخ ابھری وہ اب اس دل دوز آواز کے نزدیک تھا۔ اس نے گلی کی طرف مڑنے کے بعد لرزا دینے والا منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی خون میں لت پت پڑا ہے اور فرانسیسی سپاہی اس کے جسم سے اعضا الگ کر رہے ہیں۔ پاس ہی ایک نو عمر لڑکے کی لاش پڑی ہے اس لاش کا سر دھڑ سے قریباً الگ ہو چکا ہے ان دو لاشوں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک معمر خاتون پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ ہولناک منظر دیکھ رہی ہے۔"

یہ منظر دیکھ کر یوسف کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ ایک فرانسیسی سپاہی نے معمر عورت کے پاس آکر کہا۔ "کیا تو یہ نہیں بتائے گی کہ وہ الجزائری کہاں چھپے ہیں، نہیں بتائے گی تو تیرا حال بھی ایسا ہی کر دیا جائے گا جیسا اِن لاشوں کا ہے۔"

بڑھیا نے کہا۔" مجھے علم نہیں۔"

یہ جواب انھیں مطمئن نہ کر سکا، وہ بڑھیا کے بال نوچنے کے لئے آگے بڑھے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلیں جنھوں نے تینوں سپاہیوں کو لاشوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ گولیاں یوسف نے چلائی تھیں۔ وہ اب معمر عورت کے پاس آکر کہنے لگا۔" اے میری قوم کی ماں! میں تیرے شوہر اور تیرے بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ یہ زمین جس پر ظلم روا رکھا جا رہا ہے ہماری ہے اس پر زندہ رہنے کے لئے ظالموں سے ہم برسر پیکار آزما ہوں گے۔ جنگ خواہ کتنی طویل ہو مگر فتح انشاء اللہ ہماری ہو گی۔"

یہ الفاظ ختم ہوئے تو سیٹیوں کی آوازیں آئیں۔ یہ سیٹیاں فرانسیسی سپاہیوں کی تھیں معمر خاتون نے کہا۔ "بیٹا خدا کے لئے بھاگ جاؤ۔ کہیں درندے اس طرف نہ آجائیں۔"

یوسف نے کہا۔" اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اب میں زندہ رہنے کا عزم کر

چکا ہوں ۔"

پانچ منٹ کے بعد یوسف پولیس کے نرغے میں تھا، موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے، پاس ہی مین ہول کھلا ہوا تھا جس میں اس نے چھلانگ لگادی اور پھر بدرو کے راستے کہیں کا کہیں نکل گیا ۔"

"یہ ہے کہانی یوسف بن خذہ کی ۔ خدا اسے ہر جگہ محفوظ رکھے"۔ عقیل اور کرامت نے کہا خدا ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے ۔ آپ نے یہ کہانی سنا کر ہمارے شوقِ جہاد میں اضافہ کر دیا ہے ۔ آپ کی اجازت سے ابھی ہم آپ کے ریستوران کے مہمان ہیں اور جب حالات کچھ درست ہوئے تو یہاں سے چلے جائیں گے ۔"

منیجر نے کہا "جس طرح آپ لوگوں کی مرضی ۔ یہ ریستوران بہر حال آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے ۔"

۱۰

جوں جوں تحریک آزادی زور پکڑتی گئی توں توں الجزائر کے شہروں میں قتل و غارت کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ تحریک آزادی دس قدم اٹھاتی تو اس کے مقابلے میں حکومت کی طرف سے بیس قدم اٹھتے۔ تحریک تیس قدم اٹھاتی تو حکومت چالیس قدم آگے بڑھا دیتی۔ مقابلے کا بازار ماہ بہ ماہ نہیں روز بروز گرم سے گرم تر ہوتا رہا۔ جو ٹولی بھی جلوس کی شکل میں نکلتی اس کا بموں، گولیوں اور توپوں سے صفایا کر دیا جاتا۔ یہی نہیں بلکہ پُرامن بازاروں اور گلیوں میں بم پھینکے جاتے جس کے نتیجے میں بیسیوں نہیں سینکڑوں نفوس داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیتے۔ اس قسم کی روزانہ کارروائی نے اب تک (۱۹۵۶ء کے آخر میں) سات آٹھ لاکھ الجزائریوں کی جانیں تلف کر دیں۔ اس اتلاف میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ ان کے مقابلے میں نہتے ایمانداروں کے ہاتھوں مقابلتاً بہت کم مخالفین مارے گئے۔ حکومت فرانس نے الجزائریوں کو ملیامیٹ کرنے سے

کام لیا اس کے نتیجے میں اب تک سات آٹھ لاکھ نفوس کا ختم ہو جانا کوئی تعجب انگیز واقعہ نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جن گھروں کے چراغ گل ہو رہے تھے ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا تھا لیکن بہت سے ایسے خوش قسمت گھر ضرور تھے جو اپنی اولاد، اپنے بھائی بہنوں اور اپنے ماں باپ کی قربانی دینے کے بعد آزادی حاصل ہو جانے کے سودے کو ارزاں خیال کرتے تھے، یہ سارا احساس اس جذبے کا مرہونِ منت تھا جو وسائلِ زندگی پر اصولِ زندگی کو غالب سمجھتا تھا الجزائریوں کا اس وقت اصولِ زندگی حصولِ آزادی تھا، وہ محض اس لیے کفن بردوش ہوئے تھے کہ انھیں ہر لحظہ شہادت پانے کی امید تھی۔ وہ اپنے لئے بھی زندہ رہنا چاہتے تھے مگر اپنے سے زیادہ دوسروں کے لئے زندہ رہنے میں انھیں زیادہ لطف آتا تھا۔ انھوں نے زندگی کا راز ان پودوں میں پالیا تھا جو انھیں نہیں بلکہ ان کی اولاد کو درخت کا منظر دکھا سکتے تھے۔

مظالم کی انتہا ان دنوں الجزائر کے ذرّے ذرّے کو بیدار کر چکی تھی، شوقِ شہادت نے خواتین کو بھی مردانہ وار مقابلے کی ترغیب دے دی۔ سکولوں اور کالجوں کی لڑکیوں کے علاوہ بہت سی ان پڑھ گھریلو لڑکیوں نے بھی حالات سے متاثر ہو کر اپنے والدین سے تحریکِ آزادی میں شمولیت کی اجازت حاصل کر لی اور طرح طرح کے مصائب جھیلتی ہوئی تحریک کو مضبوط بناتی چلی گئیں۔ کئی خواتین نے جانیں تک قربان کر دیں لیکن اس قربانی سے دوسری خواتین میں اور زیادہ قربانی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ نڈر ہو کر آگے بڑھتی چلی گئیں۔

زبیدہ گو اپنے سکول میں حاضری دینے کو تیار تھی لیکن والدین نے اس سے یہ بات منوالی کہ اس سکول کو چھوڑ کر مدرسہ عالیہ میں داخل ہو جائے گی کیونکہ سکول کے طلبا اور طالبات کا جوش اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور زبیدہ کے والدین اس کی زندگی سے فائدہ اٹھا کر ملک اور قوم کو مدد دینے کے حق میں تھے۔ چنانچہ قتل و غارت کے حالات معمول پر آنے کے بعد زبیدہ کو مدرسۂ عالیہ میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کے داخل ہونے کی دیر تھی کہ مدرسے کی ایک ایک لڑکی اور ایک ایک لڑکا اسے دیکھنے کے لئے قریب آگیا۔ دعا کے بعد طالب علموں نے الجزائر زندہ باد اور

زبیدہ زندہ باد کے نعرے بھی لگائے ۔ زبیدہ کو مخالف طلبا نے سکول سے باہر جلسہ کر کے مشہور کر دیا تھا ۔ مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل اور اساتذہ نے اس کی بڑی قدر کی اور کہا کہ اس مدرسہ میں صرف تعلیم نہیں دی جاتی، مجاہد بھی بنایا جاتا ہے ۔

اس جملے سے زبیدہ کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں اور چمک اس کے چھپے ہوئے آنسوؤں نے پیدا کی ۔ مدرسہ عالیہ سے یوں محسوس کیا جیسے اسے ہیرا ہاتھ آ گیا ہے ۔

داخل ہونے کے بعد زبیدہ جب اپنے گھر آئی اور اس نے کہا کہ مدرسہ عالیہ مجاہدین کا سکول ہے تو والدین خوش ہونے کی بجائے فکر مند ہوئے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے اپنی فکر مندی ظاہر نہ ہونے دی ۔ عام طور پر یہی فقرہ دہرانے کے عادی ہو گئے کہ "قدم ضرور رکھنا چاہیئے مگر سوچ سمجھ کر" اور زبیدہ ہمیشہ یہی جواب دیتی رہی "انشاءاللہ ایسا ہی ہو گا۔"

"فرانسیسیوں کے سکول میں تقریر کرنے کے لئے جب زبیدہ کے والد جلیل صاحب راضی ہو گئے تھے تو اس کی والدہ اپنے شوہر کے سخت خلاف ہو گئی تھی ۔ اس نے یہ اختلاف رات کو زبیدہ کے سو جانے کے بعد علیحدگی میں کیا تھا، والدہ کا خیال تھا کہ اگر لڑکی کو اس طرح تقریریں کرنے کی اجازت دے دی جاتی رہی تو وہ جلد ہی تحریک آزادی میں شامل ہو کر اس کی باقاعدہ رکن بن جائے گی اور ہماری پروا چھوڑ دے گی ۔ لیکن والد کا خیال اور تھا ۔ وہ کہتے تھے ۔ اگر اتنی بھی اجازت زبیدہ کو نہ دی جاتی تو وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی اور من مانی کارروائیاں کرنے لگتی ۔ کیا تم نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ میں دفتر سے رخصت لے کر اس کے ساتھ سکول کیوں گیا تھا ۔ مجھے موجودہ نازک حالات میں اس کی تقریر سننے کا شوق تھوڑا تھا، میں تو اس کی تقریریں امن کے زمانے میں سننا چاہتا تھا لیکن اس پر میں نے تقریر سننے کا شوق محض اس لئے ظاہر کیا کہ وہ میرے ساتھ چلنے کے معنی کچھ اور نہ سمجھ سکے ۔"

ان خیالات کی سماعت کے بعد زبیدہ کی والدہ مطمئن ہو گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے سامنے بہت حد تک ہاں میں ہاں ملانے پر وہ اب معترض نہ ہوتی تھیں بلکہ جلیل صاحب

کے خیالات کی تائید کر کے اپنی بیٹی کے دل میں اپنا اطمینان بحال کرنا چاہتی تھیں والدین یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ان کی صاحب زادی کا دل و دماغ الجزائر کی تحریک آزادی سے وابستہ ہو چکا ہے مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ جب آزادی مل جانے کی زیادہ سے زیادہ توقع ہے پھر ان کی لاڈلی کے شہید ہونے کی بجائے غازی ہی بنا رہنا اچھا ہے تاکہ ان کی اس محبت کو ٹھیس نہ پہنچے جو انھیں اس ذہین اور شریف لڑکی کے ساتھ ہے۔ اس قسم کا خیال انھیں اگرچہ محبت کے باعث تھا لیکن یہ ان کے ایمان کی کمزوری تھی، اور اس کمزوری کا زبیدہ کو علم نہ ہو سکا۔

۱۱

یوں تو الجزائری اپنی تحریکِ آزادی کے راستے میں پہلے ہی بیش از بیش قدم بڑھا رہے تھے لیکن مراکش اور تیونس کے اعلانِ آزادی کے بعد ان کے قدم اور بھی تیز ہو گئے۔ حکومتِ فرانس دل میں تو پوری طرح سمجھ چکی تھی کہ مراکش اور تونس کو آزادی دینے کے بعد الجزائر کو بھی آزادی دینی ہی پڑے گی لیکن وہ چاہتی تھی کہ کسی سیاسی چال سے یہ لونڈی بچ جائے تو کیا بُرا ہے۔

تونس کے صدر حبیب بورقیبہ اور سلطان مراکش نے جب یہ دیکھا کہ الجزائر کے معاملات میں الجھاؤ پیدا ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے حکومتِ فرانس سے گفت و شنید جاری کر دی۔ سلطان مراکش اور صدر تیونس، الجزائر کی آزادی کے اس طرح خواہاں تھے جس طرح اپنے ممالک کے تھے جب انھوں نے فرانس سے بات چھیڑی تو اس نے سمجھوتے سے دو ٹوک انکار کر دیا ان دنوں الجزائر کے رہنما جلا وطن تھے، فرانس جلا وطنوں کو جلا وطن ہی رکھنے پر مصر تھا کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری، لیکن ہمسایہ

ممالک کی دوبارہ کوشش کامیاب ثابت ہوئی چنانچہ ۲۲ - اکتوبر ۱۹۵۶ء کو الجزائری رہنماؤں کو رہا کرنے کے بعد کہا گیا کہ وہ آزادی کے مسئلہ پر بات چیت کرنے کے لئے تیونس پہنچ جائیں چنانچہ پانچوں رہنما رباط سے تیونس تک بحری جہاز میں سفر کرنے کے لئے آمادہ ہوئے لیکن ابھی وہ الجزائر کے ساحل پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ فرانسیسی بیڑے کے ایک جہاز نے اسے اپنی حراست میں لے لیا۔ کوئی بات نہ بنی تو یہ الزام لگا دیا کہ یہ لوگ اسلحہ سمگل کرنے آئے تھے۔

اس پر پانچوں رہنما غصے اور مجبوراً ہوائی جہاز کرایہ پر لیا ہوائی جہاز کی پرواز شروع ہوئی۔ اس جہاز میں امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کا نامہ نگار ٹامس ایف بریڈی بھی موجود تھا، اس نے الجزائری رہنماؤں سے جن میں بن باللہ بھی تھے، گفتگو کی۔ ان کی گفتگو نہایت خوش کن اور اطمینان بخش معلوم ہوتی تھی۔ وہ گفتگو میں ایسے محو ہوئے کہ انھیں آنے والے انقلاب کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ درحقیقت اس ہوائی جہاز کے ہواباز کو الجزائر میں مقیم فرانسیسی فوجوں کے صدر مقام سے یہ پیغام بھیجا گیا تھا کہ ہوائی جہاز کو بحیرۂ روم کے اوپر ہی چکر دیتے رہو اور اتنا وقت صرف کر دو جتنے میں تیونس پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس سازش میں ہواباز شریک ہو گیا اور سمندر ہی پر لمبے لمبے چکر کاٹنے لگا۔ لیکن جب تیونس پہنچنے کا وقت قریب معلوم ہوا تو الجزائر ہی میں اتر گیا۔ ہوائی جہاز کے اترنے کی دیر تھی کہ جہاز کے پیچھے سے بکتر بند گاڑیاں جن کی تیز روشنی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھی، آتی نظر پڑیں۔ ناگہاں ایک سپاہی ٹامی گن لے کر جہاز میں آیا اور گرفتاری کے احکام سنائے۔ الجزائری رہنماؤں کے علاوہ مراکش اور تیونس کے لوگ بھی سخت برہم ہوئے لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے، تیار کی ہوئی سکیم کے بعد پانچوں رہنماؤں کو ہتھکڑیاں پہنا کر فرانس بھیج دیا گیا۔

سلطان مراکش اور صدر تیونس سخت برافروختہ ہوئے۔ سلطان نے یہ الفاظ کہے "جن رہنماؤں نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا انھیں گرفتار کر کے حکومت فرانس نے میری ذاتی بے عزتی کی ہے اس سلوک سے جو الجزائری رہنماؤں سے کیا گیا ہے یہ بہتر تھا کہ مجھے تخت سے اتار دیا جاتا۔"

حبیب بورقیبہ بھی انتہائی طور پر غصے میں آئے اور انھوں نے فرانسیسی سفیر کو بلا کر سخت تنبیہ

کی اور یہ کہا کہ "اب شمالی افریقہ فرانس سے ٹکرائے بغیر نہ رہے گا۔"

الجزائری رہنماؤں کی اِس انداز میں گرفتاری ایک ایسا واقعہ تھا جس نے الجزائر تو الجزائر مراکش اور تیونس کے عوام میں بھی انقلاب کی آگ لگا دی۔ اِس آگ کا اندازہ حکومتِ فرانس کو یوں ہوا کہ وہ اپنے خیال سے جس قدر زیادہ تشدد کرتی، الجزائری اِس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مقابل آکھڑے ہوتے۔ انھیں نہ تو بندوقیں ڈرا سکیں، نہ بم خوف دلا سکے، نہ ٹامی گن اور نہ گن مشینیں حکومت حیران تھی کہ سات آٹھ لاکھ نفوس کو ختم کرنے کے بعد بھی الجزائری جانیں ہاتھوں پر لئے چلے آرہے ہیں، یہ ماجرا کیا ہے۔

درحقیقت حکومت فرانس چھ سال کی مسلسل جنگ سے اکتا چکی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح جھگڑا ختم ہونا چاہئے لیکن ایسا سوچنے کے فوراً بعد اس کی نظر اپنے جدید اسلحہ پر پڑتی اور وہ اسے استعمال کرنے میں لگ جاتی۔

یہ دن ۱۹۵۷ء کے آغاز کے تھے اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ وہ "تخت یا تختہ" کہتے ہوئے گروہوں کی شکل میں بڑھتے ہی چلے آرہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خداتعالیٰ نے انسانی شکل میں زمین پر آکر مجاہدین کو یقین دلا دیا تھا کہ تمہاری شہادت تمہارے ہاتھ میں جنت کی چابی دے دے گی جبھی تو وہ والہانہ بڑھے چلے جا رہے تھے جن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی، بوڑھے اور جوان بھی بلکہ نوعمر لڑکے اور لڑکیاں بھی۔ اس قسم کے گروہوں کی تعداد بڑھتی گئی اور وہ الجزائر کے مختلف شہروں میں پھیل گئے، حکومت فرانس نے بموں اور مشین گنوں سے سب کا صفایا کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنگامے سو گئے اور نفوس کی جگہ لاشوں کے ڈھیر نظر آنے لگے۔

شام کا وقت ہوا تو ایک بازار میں ایک لاش زندہ ہوتی معلوم ہوئی، وہ لاش گرتی پڑتی ایک طرف کو چلتی دکھائی دی، ایک کے بعد دوسرا قدم مشکل سے اٹھتا تھا مگر وہ گرتی پڑتی دور پہنچ گئی اور پھر کسی گلی میں مڑ گئی۔ وہاں سے چلتے چلتے ایک مکان کے سامنے گر گئی۔

لاش کے گرتے ہی ایک خاتون مکان سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکلی اور اِس

نے لاش کا سر اپنے زانو پر ڈال لیا، دودھ لانے کے لئے آواز دی دودھ آگیا۔ اس نے زخموں سے چور آدمی کا منہ کھول کر چمچ سے آہستہ آہستہ یوں دودھ پلانا شروع کیا جیسے بچے کو پلایا جاتا ہے۔ گرم گرم دودھ پینے کی دیر تھی کہ لاش نے آنکھیں کھول دیں۔ سر کے کئی حصوں پر خون سے بال جم گئے تھے، سارا جسم چھدا اور کٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کپڑے خون سے شرابور تھے۔ چہرے کے نقوش خاک و خون کی وجہ سے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ آنکھیں کھلیں تو مرجھایا ہوا چہرا حیرت اور خوشی میں چمک اٹھا۔ لاش کا سر جن مرمریں بازوؤں میں تھا اس کا نام زبیدہ تھا۔ لاش جب تک لاش تھی، تب تک زبیدہ بھی بے جان تھی۔ لاش نے آنکھیں کھولیں تو زبیدہ کی جان میں جان آگئی، وہ خوش ہو گئی جیسے یہ اس کا بھائی، باپ یا کوئی اور قریبی عزیز تھا۔ اس نے کھلی ہوئی آنکھوں کو دیر تک تسلّی دی اور کہا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں، یہ گھر آپ کا ہے، آپ جب تک بالکل اچھے نہیں ہو جائیں گے تب تک آپ یہیں رہیں گے۔"

کھلی ہوئی آنکھیں تسلّی کے الفاظ سے اور زیادہ کھُل گئیں، زخموں سے چُور جسم اٹھ بیٹھنے کی کیا، ہلنے جلنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ٹکٹکی سے صاف عیاں تھا کہ وہ اپنے تیماردار کی کس قدر ممنونِ احسان ہیں۔ کھلی ہوئی آنکھیں بار بار بھیگ گئیں زبان کچھ لفظ ادا کرنا چاہتی تھی مگر نقاہت کی وجہ سے ادا نہ ہو پاتے تھے۔ آخر کوئی بیس تیس منٹ کی جدوجہد کے بعد زبیدہ کے طاقتور بازو بڑی احتیاط سے زخمی آدمی کو اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے، نرم بستر پر لٹا دیا اور ڈاکٹر کو بلوالیا۔ ڈاکٹر کے معائنے میں بہت دیر لگی کیونکہ جسم کے مختلف زخم دیکھنے کے لئے اسے ہلانے جلانے کی ضرورت تھی اور اس کا ہلنا جلنا بہت مشکل تھا۔ بڑی مشکل سے ایک پہلو بدلانا چاہا مگر اس کی چیخیں آسمان تک پہنچنے لگیں ڈاکٹر نے اسے اسی حالت میں رہنے دیا اور زخموں کے اندمال کے لئے دوا دے دی۔ ڈاکٹر یہ فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکا کہ اس کی کوئی ہڈی بھی ٹوٹی ہے یا نہیں۔ اجنبی اس قدر زخموں سے چور تھا کہ وہ ڈاکٹر کی کسی بات کا جواب

نہ دے سکتا تھا۔ دوا لینے کے دو گھنٹے بعد زبیدہ کمرے میں آئی تو وہ سو گیا تھا۔ سب نے یہی محسوس کیا کہ یہ آرام ہو جانے کی علامت ہے۔ وہ تین گھنٹے تک میٹھی نیند سویا رہا۔ جب جاگا تو اس کے آس پاس زبیدہ اور اس کے والدین کھڑے تھے۔ زخمی نے منہ کھولنے کی کوشش کی —— "میں —— کہاں —— ہوں؟"

زبیدہ اور اس کے والدین خوشی سے پاگل ہو گئے: "بول پڑا، بول پڑا، یا اللہ تیرا شکر ہے، بول پڑا" ——

"آپ یہ سمجھے کہ آپ اپنے گھر میں ہیں"۔ یہ جواب جلیل صاحب کا تھا۔

اس جملے کے ادا ہونے کی دیر تھی کہ اجنبی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ زبیدہ نے اپنے والد سے کہا: "یہ آنسو احسان مندی کے ہیں۔ ایسے ہی آنسو مکان سے باہر نکلے تھے"۔

زخمی کی آنکھیں اور زیادہ بھیگ گئیں، زبیدہ اور اس کے والدین تسلی کے الفاظ کچھ اس انداز میں کہے کہ اجنبی کے چہرے پر جو مسکراہٹ پھیل گئی۔

اجنبی نے ایک بار اور بولنے کی کوشش کی "میں آپ کو ——" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا، اس وقت اس نے جتنی مشکل سے زبان کھولی، اس سے کہیں زیادہ مشکل میں اپنی انگلی اٹھا کر زبیدہ کی طرف اشارہ کیا"۔

زبیدہ اس کے چہرے کے بالکل قریب آگئی۔ "کہئے کہئے آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے کیا آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے، کیا آپ مجھ سے کوئی خدمت لینا چاہتے ہیں"۔

مگر زخمی کچھ بھی نہ کہہ سکا، زبیدہ کوئی بات نہ سمجھ سکی تو وہ اس کے لئے گرم دودھ لے آئی۔ اسے چمچ سے دودھ پلایا تو وہ خوشی سے پینے لگا۔ زبیدہ اس بات سے خوش ہو گئی کہ وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

دودھ پینے کے بعد کچھ اور طاقت پیدا ہوئی تو اجنبی نے پھر ایک بار بولنے کی جرأت کی، اس وقت پھر اس کی انگلی زبیدہ کی طرف اٹھ رہی تھی۔ "میں آپ کو ——"

زبیدہ پھر اس کے قریب آگئی "مجھے آپ کہہ رہے تھے" میں آپ کو ——" آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟

اجنبی جلدی سے بول اٹھا "میں کہاں ہوں؟"

"آپ الجزیرہ میں ہیں۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" زبیدہ نے کہا کافی توقف کے بعد اجنبی کی زبان کھلی "میں بھی الجزیرہ کا ——"، اس سے زیادہ وہ نہ بول سکا۔

اجنبی نے پوچھا "حرتیت پارک کہاں ہے؟"

"زبیدہ نے جواب دیا کوئی دو میل کے فاصلے پر، کیا آپ وہاں کے رہنے والے ہیں؟"

اجنبی نے سر کے اشارے سے ہاں میں جواب دیا۔ اتنے میں ربڑ کی بوتل آگئی جس میں گرم پانی تھا۔ زبیدہ نے یہ بوتل پہلو میں رکھنے کے لئے اجنبی کے جسم کو ذرا اونچا کرنا چاہا مگر اجنبی نے نہ کرنے دیا۔ ناچار بوتل کو جسم کے ساتھ رکھ دیا گیا تاکہ جلتی گرمی پہنچ سکتی ہے پہنچ جائے۔

چوتھے روز بڑی مشکل سے زخمی اجنبی کا چہرہ صاف کیا گیا۔ چہرہ صاف ہوا تو زبیدہ جھجھک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ خون آلود چہرہ کو زخموں کی وجہ سے زیادہ صاف نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے نقوش صاف طور پر ظاہر نہ ہو سکے تھے، اب چہرہ صاف کیا تو پتہ چلا کہ وہ کوئی بوڑھا نہیں جوان آدمی تھا۔ زبیدہ کو جوں جوں اپنی تیمارداری کا سلوک اور انداز یاد آنے لگا جو وہ اجنبی کے ساتھ روا رکھ چکی تھی، توں توں وہ شرم کے مارے زمین میں گڑتی گئی۔ اس نے اس احساس کے ساتھ یہ بھی سوچا کہ اگر وہ اب پہلے رویے میں فرق کر بیٹھی تو اس کی پوزیشن اور بھی خراب ہو جائے گی۔ اس کی اچانک پیدا ہونے والی حیا نوجوان اجنبی کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دے گی اس لئے اسے اپنے

روپئے میں سرِمو فرق پیدا نہ کر کے خدمت کا ثواب حاصل کئے جانا چاہیئے۔ دوسری بار جب زبیدہ اجلبنی کے کمرے میں حال پوچھنے آئی تو بے اختیار بول اٹھی "چہرہ صاف ہونے کے بعد آپ بالکل بدل گئے ہیں، پہلے تو بڑی مکروہ صورت تھی"

یہ جملہ زبیدہ نے اپنے والدین کی موجودگی میں کہا تھا۔ اسے فوراً احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا، چنانچہ ایک دو لمحوں کے بعد فوراً بولی "میرا خیال ہے آپ کے چہرے کے زخم بہت حد تک صاف ہو گئے ہیں"

"ہاں خدا کا فضل ہے" اجلبنی نے کہا "آپ کی محنت اور دعاؤں نے مجھے دوبارہ زندگی دی ہے"

زبیدہ اس فقرے سے شرما گئی اور بغیر جواب دیئے دوسرے کمرے میں چلی گئی

اجلبنی کو کچھ کچھ افاقہ ہو گیا تھا لیکن وہ ابھی اس حالت میں بالکل نہیں تھا کہ اپنے گھر جا سکے البتہ آج ہی اس کے گھر اطلاع کر دی گئی۔ اس سے پہلے پتہ صحیح طور پر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اطلاع نہ ہو سکی تھی۔

زبیدہ دروازے کی اوٹ سے اپنے والد اور اجلبنی کے سوال جواب سننے لگی۔

"آپ نے اپنا نام عقیل بتایا تھا —— والد صاحب کا کیا نام ہے؟"

عقیل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، وہ بہت دیر بعد جواب دے سکا۔

وہ "انتقال فرما گئے ہیں"

"اوہو بہت افسوس ہے —— اور والدہ؟"

"وہ بھی" اس کی آنکھوں سے برکھا برسنے لگی۔

زبیدہ بھی دروازے کی اوٹ میں گھڑی آنسو بہانے لگی۔

بہت دیر بعد آنسو پونچھ کر عقیل نے خود ہی بتایا کہ اس کی پونجی اب اس کا بھائی اور ایک بہن ہے۔ بھائی کا نام کرامت اور بہن کا عزیزہ ہے۔

جلیل صاحب نے کہا" اور تمہارا گھر کس جگہ واقع ہے؟"

عقیل نے جذباتِ تشکر سے مجبور ہو کر عیزارادی طور پر کہا" محترم میرا حقیقی گھر تو یہی ہے جہاں آپ لوگوں نے بھائی بہنوں سے بڑھ کر خدمت کی ہے۔ میں آپ کا تاعمر احسان نہ اتار سکوں گا۔"

جلیل صاحب نے کہا" برخوردار نادانوں ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، بھلا اس میں ہمارے احسان کی کیا بات ہے، البتہ اگر ہم تمہاری خدمت نہ کرتے تو یہ ہمارا ناقابلِ معافی جرم ہوتا۔ اچھا تو کہاں ہے تمہارا گھر؟"

زبیدہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی اپنے والد اور عقیل کی گفتگو سے بہت محظوظ ہو رہی تھی، اب دوبارہ اس کے والد نے گھر کا پتہ معلوم کیا تو زبیدہ نے دل میں کہا۔ "ابا جان کہہ جو دیا ہے انھوں نے کہ یہی میرا گھر ہے" —— یہ جملہ کہہ کر وہ شرما گئی اور اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں میچ لیں اور پھر فوراً انگلیاں کھول کر ان کے دریچوں سے گفتگو کا منظر دیکھنے لگی۔

حرّیت پارک کے ساتھ والی گلی میں تیسرا مکان ہمارا ہے اور مکان نمبر ۵/۱۴ ہے۔ وہاں کرامت کا نام لے کر پکار دیجئے" ——

"خدا کرے وہ سب محفوظ ہوں"۔ عقیل کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں ——

جلیل صاحب چھڑی کے سہارے اٹھے اور چٹکی بجا کر کہنے لگے، " برخوردار تم دیکھو گے کہ تمہارے بہن بھائی پہنچے کہ پہنچے، یوں سمجھو کہ میں ہوائی جہاز میں جاؤں گا اور راکٹ سے واپس آؤں گا۔"

"عقیل کو یہ فقرہ پورا کرنے کی حسرت ہی رہ گئی کہ ان کے آنے سے آپ کو مزید تکلیف ہو گی ؟"

جلیل صاحب گھر سے جا چکے تھے۔ البتہ زبیدہ کی والدہ نے جواب دیا۔" بیٹا ہمارے

پاس خدا کا دیا بہت کچھ ہے ۔ تم یہ بالکل خیال نہ کرو کہ ہم تم پر کوئی کسی قسم کا احسان کر رہے ہیں ۔ نہیں، ہرگز نہیں بلکہ یہ تو ہمارا فرض ہے ۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں خدا تمہیں جلد آرام دے گا ۔ اور ہاں آج میں نے تمہارے لئے ساگ تیار کیا ہے ۔ وہ میں تمہیں ضرور کھلاؤں گی ۔"

یہ کہہ کر والدہ نے زبیدہ کو آواز دی ۔ زبیدہ نے جلدی میں کہا "میں ایک صفحہ پڑھ کر آئی ۔"

زبیدہ کو اپنے آپ پر سخت غصہ آیا کہ وہ جھوٹ کیوں بولی، اس کے ہاتھ میں کتاب کب تھی ۔ وہ تو دروازے کی اوٹ میں کھڑی اسی اجلنی کی باتیں سننے میں محو تھی جس کے لئے ساگ تیار کیا گیا تھا ۔

والدہ نے ایک اور آواز دی " بیٹی ! کتاب پھر پڑھ لینا ساگ اور چپاتی جلدی سے لے آؤ ۔"

" بہت اچھا " زبیدہ نے کہا ۔ اور تھوڑی دیر بعد ٹرے میں کھانے کے برتن سلیقے سے رکھے ہوئے لے آئی ۔ اجلنی کی چارپائی کے پاس ہی تپائی پڑی تھی اس پر کھانا رکھ دیا، اور خود دوسرے کمرے میں جانے لگی ۔ والدہ نے کہا " زبیدہ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا، تمہارا مہمان از خود لقمہ اٹھانے کے قابل ہے، جو تم بھاگ رہی ہو ۔ یہاں اپنے بھائی کے پاس بیٹھو اور چھوٹے چھوٹے لقمے منہ میں ڈالو ۔"

حقیقت میں تو زبیدہ شرم کے باعث بھاگی تھی مگر اسے فوراً بہانہ سوجھ گیا، کہنے لگی " امی جان ! کیا آپ یہ خیال کر سکتی ہیں کہ میں خدمت سے بھاگ جاؤں گی ۔ میں تو پانی لینے چلی تھی ۔"

والدہ کھسیانی سی ہو کر بولی ۔ " اچھا اچھا ! میں کیا سمجھ رہی تھی ۔ اصل میں عمر زیادہ ہو جائے تو سمجھ اور عقل کا یہی حال ہوتا ہے ۔"

زبیدہ کو اب پانی لانا ہی پڑا اور پانی آگیا تو شرم کو بالائے طاق رکھ کر لقمے دینے پڑے ۔ والدہ اپنی لڑکی کی یہ خدمت گزاری دیکھ کر تعریفی کلمات کہتے ہوئے اٹھی اور یہ کہہ کر چل دی " میں ابھی آئی ہوں ۔"

زبیدہ کو اجلنی کی خدمت میں کبھی اتنی شرم محسوس نہ ہوئی تھی، جتنی اس وقت ہوئی

وہ اس خدمت سے خوش بھی تھی اور ناخوش بھی۔خوش کسی دوسرے جذبے کے تحت اور ناخوش اپنی والدہ کے اس حکم سے کہ اسے لقمے دینے پڑے۔

"آپ کا احسان کبھی نہیں بھلا سکوں گا" اجنبی کی زبان سے اچانک نکلا۔

زبیدہ خاموش رہی۔

"زیادہ تکلیف کے زمانے میں، میں نے آپ سے ایک بات کہنا چاہی مگر پوری نہ کرسکا"

زبیدہ گھبراگئی، اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں بالکل ٹھیک ہے زخم اچھے ہوجائیں تو میں اپنے گھر جاسکوں۔ میں آپ سب پر بوجھ بنا ہُوا ہوں"

زبیدہ نے فوراً کہا "خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہم پر بوجھ ہیں۔ میں نے تو محض آپ کا حال دریافت کیا تھا"

"ہاں خدا کا فضل ہے، میں کہہ رہا تھا میں اپنی بات پوری نہ کرسکا، اب سنئے"

زبیدہ پھر گھبراگئی "کیا بات ہے؟"

عقیل زبیدہ کی بے وجہ پریشانی دیکھ کر مسکرایا۔ "کوئی پریشانی کی بات نہیں، صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس سے پہلے آپ کو دیکھا ہے اور میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں"

"وہ کیسے" زبیدہ نے اپنی گھبراہٹ دُور کرتے ہوئے کہا "کہاں دیکھا ہے آپ نے؟"

اور عقیل اس کا جواب دینے ہی کو تھا کہ اس کی والدہ نے پکارا "بیٹی تمہارے والد آگئے ہیں"

زبیدہ کھانا کھلانے کی خدمت سے سبکدوش ہوکر باہر آگئی۔

"لو بیٹی تمہارے مہمان کے بھائی بہن آ گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِن سے پردہ کرانے کی کیا ضرورت ہے ——— آجائیے کرامت صاحب آجائیے عزیزہ بیٹی کو بھی لے آئیے۔"

۱۲

اب وہ وقت آچکا تھا جب کہ حکومت اور باغیوں کی آپس میں پوری طرح ٹھن چکی تھی۔ حکومت تو اپنے اسلحہ کی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے تھی لیکن اس کی الجزائری رعایا کا تکیہ خدا پر تھا۔ حکومت نے الجزائری رہنماؤں کو دھوکا دینے کے بعد فرانس میں نظربند کر رکھا تھا لیکن ان کی نظربندی الجزائری حریت پسندوں کے تیز سے تیز تر اقدامات کا موجب بن رہی تھی۔ الجزائریوں کی ایک خفیہ تنظیم ایسی تھی کہ اس میں کام کرنے والے مکمل طور پر بااعتماد لوگ تھے۔ بعض افراد ایسے تھے کہ بظاہر ان پر اعتماد کرنا مذاق معلوم ہوتا تھا لیکن قریباً روزانہ کے قتل و غارت نے غیر ذمہ داروں کو بھی ذمہ دار بنا دیا تھا اور وہ اپنے بارے میں یہ یقین کر کے بھی اس تنظیم میں شامل ہو گئے تھے کہ ان کی جانیں ہر وقت خطرے میں ہوں گی۔ اس خفیہ تنظیم نے حکومت کے مختلف اداروں پر ایسی دہشت پھیلائی کہ حکومت دنگ رہ گئی۔ اس تنظیم کے

کارکنان نے اِس بات کے بار بار حلف اٹھائے کہ وہ اپنی تنظیم کے راز کو کسی پر ظاہر نہ کریں گے یہاں تک کہ جانیں بھی تلف ہو گئیں تو وہ تنظیم کے راز اپنے ساتھ قبروں میں دفن کر دیں گے۔

جمیلہ بوزہ (Jamila Bouazza) نامی ایک نوجوان لڑکی جس کی عمر ۱۸، ۱۹ برس تھی اور جون ۱۹۵۶ء میں ایک سکول کی طالبہ تھی، الجزائر میں انقلاب کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر سکول چھوڑ بیٹھی اور الجزائریوں کی انقلابی تحریک میں شامل ہونے کیلئے الجزائر سنٹرل پوسٹل سروس میں ملازم ہو گئی۔ تحریک آزادی کے آغاز ہی میں وہ تحریک کے ساتھ منسلک ہو کر ڈاکخانہ میں اپنی حیثیت میں انقلاب کے خفیہ شعبوں کے لئے کام کرتی رہی۔ اِس کا یہ خفیہ کام ۱۹۵۷ء کے اوائل تک رہا اور اس نے اپنی تحریک کو معتد بہ فائدہ پہنچایا۔ اِس سال کے آغاز میں اِسی نام کی ایک اور نوجوان لڑکی جو اس سے دو سال بڑی تھی تحریک میں شامل ہوئی اور اس نے بھی تحریک کے لئے ناقابلِ فراموش کام کا آغاز کیا۔ اس کا نام جمیلہ بوحائرڈ (JAMEELA BOHIRED) تھا۔ یہ اگرچہ گوشت پوست کا پیکر تھی، مگر اپنے عزائم میں چٹان سے بھی زیادہ سخت تھی۔

جمیلہ بوحائرڈ کو حصولِ تعلیم کا بہت شوق تھا، وہ فیکلٹی آف لٹریچر (Faculty of Literature) میں سالِ اوّل کی طالبہ تھی، وہ اپنی تعلیم میں دلچسپی تو ضرور لے رہی تھی مگر سیاسی حالات کے زلزلے اس کی توجہ بانٹتے چلے جا رہے تھے۔ ایک روز وہ اپنی سیٹ پر سر نگوں کئے بیٹھی تھی کہ استاد نے اِس اپنے سبق کے متعلق ایک سوال کر دیا۔ پہلے تو اس نے استاد کے خطاب کو سمجھا ہی نہیں پھر جب سمجھا تو اٹھ کر کہنے لگی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آج کل اپنا سبق یاد نہ کر سکوں گی۔"

استاد نے پوچھا "سبب؟"

اور سبب بتانے کے لئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو مکمل جواب دے رہے تھے۔ لیکن کافی توقف کے بعد اس کی بھرائی ہوئی آواز نکلی۔ "الجزائر کی آزادی"

تعلیمی ادارے میں یوں تو قریباً سب طالب علم تحریک آزادی سے متاثر تھے مگر جمیلہ

جیسا تڑپتا تلملاتا ہوا احساس اس کے مقابلے میں کسی اور میں نہیں تھا۔

اساتذہ نے بلکہ خود پرنسپل نے اس کی توجہ کا مرکز تعلیم کو بنانا چاہا مگر اس کے دل و دماغ میں احساسِ فرض کی ایسی آگ روشن ہو چکی تھی کہ اسے بجھانا آسان کام نہ تھا۔

تعلیم سے بنیادی طور پر اس قدر شغف رکھنے والی جمیلہ کی طبیعت تعلیم سے بالکل اچاٹ ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے تصوّر میں یہ نقشہ دیکھتی رہی کہ وہ تحریک آزادی کے مجاہدین کے ہم رکاب اڑی چلی جا رہی ہے اور الجزائر کو آزاد کرانے کے لئے بموں، بندقوں اور توپوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ جو مجاہدین شہید ہو جاتے ہیں، وہ ان کی لاشوں کے سامنے کھڑی ہو کر فوجی سلام کرتی ہے اور جو زخمی ہو کر غازی بن جاتے ہیں ان کی مرہم پٹی میں مصروف ہو جاتی ہے۔ تحریک آزادی میں مردانہ وار ساتھ دیتے ہوئے خود اس کو بہت سے زخم آجاتے ہیں مگر وہ اپنے زخموں کی پروا نہ کرتی ہوئی دشمنانِ آزادی پر خود ساختہ بم پھینکتی چلی جاتی ہے۔ ایک وقت اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے مگر وہ ایک ہوائی جہاز پر بیٹھی دشمنوں کے مورچوں پر بے شمار بم پھینک کر تباہی لا رہی ہے ——— مگر یہ سب کچھ محض اس کے تصوّر میں ہوتا رہا جس سے اس کے دردِ قومی کے شدید احساس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وہ پہلی بار جب خفیہ تنظیم کے مجاہدین سے ملی تو انھوں نے اسے اپنی تحریک میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔

"تمہارا جذبہ حریت اپنی جگہ بہت صحیح ہے مگر تمہیں معلوم نہیں کہ اس راستے میں تمہارے قدم کس قدر جلد ڈگمگا جائیں گے۔"

جمیلہ نے کہا "میرے قدم ڈگمگانا نہیں جانتے۔"

"مگر جب مصائب کا سامنا ہوگا تو ڈگمگائے بغیر نہ رہیں گے اس تحریک میں حصّہ لینے کا مطلب مصائب کو خود آواز دینا ہے۔"

"یہ میں جانتی ہوں اسی لئے جب سے میں نے راہِ آزادی میں قدم اٹھانے کا عزم

کیا ہے' یقین کرلیا ہے کہ مجھ کو قید کرلیا جائے گا' مجھ پر بم پھینکے جائیں گے۔ مجھے گولی سے اڑا دیا جائے گا' میرا ایک ایک عضو کاٹ لیا جائے گا' اور جب تک زبان نہیں کٹ جائے گی مجھ سے اِس بات کا اقرار لینے کی بے کار کوشش کی جائے گی کہ میں اپنے اقدامات سے باز آجاؤں ——— لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اُس وقت بھی میری زبان کی کانپتی ہوئی آواز الجزائر کی آزادی ہی کا مطالبہ کرے گی "

جمیلہ کے اِس قسم کے بے خوفی اور ایثار پیشگی کے الفاظ سن کر مجاہدین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اُنھوں نے اِسے اپنی تحریک میں شامل کرلیا اور اس کے ذمے کام کر دیئے جن کی تکمیل کے لئے وہ اسی وقت مستعد ہوگئی۔ اس نے دو مہینے کی مدت میں اس قدر وفاداری اور اعتماد کا ثبوت دیا کہ مردوں کو اپنی مردانہ وار کوششوں سے شرم محسوس ہونے لگی۔ اُس نے تھوڑے سے عرصے میں خفیہ تحریک کے ساتھ شامل ہو کر حکومتِ فرانس کے کئی حملوں کو ناکام بنا دیا۔ حکومت پریشان ہوگئی کہ جس قوم کی عورتوں کا یہ حال ہے اُس قوم کے مرد کتنے بہادر اور جاں فروش ہوں گے۔

جمیلہ بوحائرڈ اپنے نام کی طرح نہایت حسین وجمیل دوشیزہ تھی لیکن اسے خفیہ تحریک کا کٹھن اور خطرناک کام کرتے ہوئے اپنی جوانی اور اپنے حسن پر ذرا بھی ترس نہ آتا تھا۔ قومی کام کے سلسلے میں اس کا واسطہ ہر عمر کے آدمی سے پڑتا ان میں اس کی طرح کے صحت مند نوجوان حسین بھی ہوتے لیکن اس کی نگاہوں کا کوئی حصہ ترغیبِ جنسی کا شکار نہ ہوتا گویا اِس کی نگاہیں یہ کہتی نظر آتیں کہ ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب ابھی حیات کا ماحول ساز گار نہیں

حکومت کی فوج الجزائر کے ایک ایک حصّے پر منظم طور پر پھیلی ہوئی تھی اور وجہ بے وجہ بم پھینکتی اور گولیاں چلاتی رہتی تھی،

الجزائری خفیہ تحریک حکومت کی اِس کارگذاری کا جواب تھی' اس تحریک کا کوئی ممبر بھی ایسا نہ تھا جو فوج کے حملے کا جواب بے خوفی سے دینے کی جرأت نہ رکھتا ہو۔ اِس تحریک میں ویسے

تو دوسرے بھی بڑے بڑے رہنما اپنے اقدامات میں جرأت مندی اور بے خوفی کا ثبوت دے رہے تھے لیکن یوسف سعدی پُراسرار طریقے پر بم پھینکنے میں کمال رکھتا تھا۔

ایک روز فوج کا ایک بڑا دستہ پلاسٹک کے بم پھینکنے کے لئے مارچ کرتا ہوا آیا لیکن اُس کے اقدام سے پہلے یوسف سعدی کے پُراسرار ہاتھ نے اقدام کر لیا، فوج کو پتہ بھی نہ چلا اور اس کی جمعیت پر بم بھی پھینکے گئے جس سے بہت سی فوج موت کا شکار ہو گئی۔ الجزائریوں کی اس طرح کی خفیہ حرکت دیکھ کر وہ خود حرکت میں آئے اور مکانوں، ہوٹلوں اور دکانوں پر جوابا" بم پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس کے نتیجے میں الجزائری خفیہ تحریک پہلے سے بھی زیادہ انتقامی جوش لئے ہوئے خفیہ طور پر مقابلے میں ڈٹ گئی۔

حکومت ویسے تو تحریک آزادی کے ہر معمولی محرک کو بھی گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی متجسس نگاہیں تحریک کے غیر معمولی افراد کی تلاش میں رہتی تھیں۔ حکومت کو یوں تو ہر باغی لیڈر کی تلاش تھی لیکن سب سے زیادہ تجسس اس جری نوجوان خاتون کا تھا جو قومی محاذ کو زیاد سے زیادہ طاقتور اور پُراسرار بنانے کے لئے چھلاوا بنی ہوئی تھی۔ کبھی مشرق میں ہوتی، کبھی مغرب میں، کبھی شمال میں اور کبھی جنوب میں۔ اسے اپنے ساتھی چھاپہ ماروں کے پروگراموں کا ہر وقت علم ہوتا مگر وہ اپنی قومی وفاداری کا اس درجہ پاس اور لحاظ رکھتی کہ ان پروگراموں سے اپنے بھائی بہنوں اور والدین تک کو آشنا نہ ہونے دیتی۔

ایک روز وہ اپنے گھر میں اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ ان میں زیر بحث صرف سیاسی اور ملکی حالات آتے تھے۔ ابھی وہ اپنے باپ کے سوال کا جواب دینے کو تھی کہ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اس نے کہا "صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں اس لئے میں چلتی ہوں" ایک منٹ کے وقف میں بھائی بہنوں سے ملی والدین سے دعائیں لیں اور یہ کہہ کر ہوا ہو گئی۔ "دعا کیجیے خدا الجزائر پر سے غلامی کا تسلط ہٹا لے۔"

مکان سے نیچے اتری اپنا حلیہ اس قدر بدل رکھا تھا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا، ایک

طرف جیپ کھڑی تھی اس میں سوار ہو کر ہوا ہو گئی ۔ وہ گھر سے چار روز غائب رہی مگر ان چار دنوں کے اندر اس کی خداداد سوجھ بوجھ نے حکومت کی پولیس کو ایسا ہراساں کیا کہ ان کی زبانیں خواہ کچھ کہتیں مگر دل مانتے تھے کہ خفیہ تحریک کا مقابلہ آسان نہیں ۔

حکومت کے اس حملے میں بہت سے الجزائری مارے گئے ۔ ان میں ایک ایسی عورت بچ گئی جس کی اولاد میں سے کوئی بھی نہ بچا ۔ وہ اپنی اولاد کی لاشوں پر آنسو بہانے کے بعد فوج کی موجودگی میں بول اٹھی ۔

"اولاد ماں کے دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں ٹکڑوں کو کوئی اپنے سے الگ نہیں کر سکتا مگر ستمگر حکومت کی پولیس نے انھیں مجھ سے الگ کر دیا ہے ۔ بلا شبہ میں نے ان کی دائمی جدائی پر بہت آنسو بہائے ہیں لیکن یہ آنسو ان کی شہادت پر نہیں بہائے گئے ، ان کی شہادت سے تو میرا رواں رواں خوش ہے ۔ کیونکہ ایک شہادت سے سو غازی پیدا ہوتے ہیں ، اب تک حکومت الجزائر کی سرزمین پر نو لاکھ مسلمانوں کو شہید کر چکی ہے ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری اولاد کا شمار نو لاکھ شہیدوں میں ہے ۔ ان لاکھوں شہادتوں کا نتیجہ میرے سامنے ہے ، میں آئینہ کی طرح ان شہادتوں کے خوشگوار نتائج صاف صاف دیکھ رہی ہوں کہ .... "

فوج کے نزدیک بولتی ہوئی اس جانِ ناتواں کو پل بھر میں مسل دینا کیا مشکل تھا لیکن اس کی گونجتی ہوئی آواز کے سامنے نہ کوئی بم بول سکا نہ بندوق بول سکی اور نہ توپ دھاڑ سکی ۔ ایک سپاہی نے اس کی بات کاٹ کر غصہ میں کہا " وہ کونسا آئینہ ہے جس میں تم نتائج دیکھ رہی ہو "

اس نے کڑک کر جواب دیا " میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری توپوں بندوقوں کا رخ تمہاری طرف ہو گیا ہے ۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری حکومت کا تسلط دم توڑ رہا ہے ۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے بڑے بڑے جرنیل جمیلہ بو حائرڈ کے نام سے کانپ رہے ہیں "

ایک دوسرا سپاہی قریب آکر زیادہ سختی سے بولا ۔

" بتاؤ اس وقت تمہاری جمیلہ کہاں ہو گی ؟ "

خاتون نے کڑک کر جواب دیا "جہاں بھی ہوگی تمہاری حکومت کا تختہ الٹنے کی تدبیریں کر رہی ہوگی"
وہ سپاہی سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔ "کیا تمہیں اپنا انجام معلوم نہیں؟"

"ہاں معلوم ہے۔" اس نے کہا "زیادہ سے زیادہ موت —— اور اس کے لیے میں ہر لمحہ تیار ہوں۔"

سپاہی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بندوق سیدھی کر لی اور بجلی ہی کی تیزی کے ساتھ خاتون اپنا گریبان چاک کر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "ہم موت سے کبھی نہیں ڈرے۔"

عورت کی اس جرأت اور بے خوفی نے سپاہیوں پر اثر ڈالا۔ دوسرے سپاہی کے منع کرنے پر اس نے بندوق کی نالی نگوں کر لی "اس کو چھوڑ دو، یہ بھی کیا یاد کرے گی۔"

تیسرا سپاہی کہنے لگا۔ "تم نے اسے زندہ چھوڑ کر اچھا کیا۔ ہم اس سے جمیلہ کا پتہ لگائیں گے۔"

خاتون ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "میں ہرگز پتہ نہیں بتاؤں گی۔"

ایک اور سپاہی کہنے لگا "ہم پتہ معلوم کرنے کے ڈھنگ جانتے ہیں کیونکہ راز کی باتیں اگلواتے وقت جسم کے جوڑ الگ الگ کرتے ہوئے ہمیں کبھی تکلیف نہیں ہوئی ——"

اس پر ایک اور سپاہی نے فوراً کہا —— "بلکہ خوشی ہوتی ہے۔"

خاتون نے کہا "ہاں میں جانتی ہوں کہ ایسی حرکتوں سے درندوں کو ہمیشہ خوشی حاصل ہوتی ہے"

خاتون کے اس جواب کو سپاہی برداشت نہ کر سکے اور اسے پیٹنے کے لئے اس پر پل پڑے۔ لیکن اس عورت نے اپنی بھرپور طاقت کے بل پر ان سب کو دھکا دے کر گرا دیا۔ یہ بے عزتی فرانسیسی سپاہی کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اٹھتے ہی اس پر فائر کر دیا گولی سینے میں لگی۔ خاتون ٹھنڈی ہونے والی تھی مگر سپاہی کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہ ہوا اس نے اپنی بندوق کا سرا اس کی زخمی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم جمیلہ کا پتہ کیسے نہیں بتاتی تھیں؟"

خاتون زندگی اور موت کی کش مکش میں گرفتار تھی۔ بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی، اس

نے جھکے ہوئے سپاہیوں پر ٹکٹکی لگاتے ہوئے کہا۔ "آؤ میں جمیلہ کا پتہ بتاؤں۔"

سپاہی اس کے قریب ہو گئے تو وہ یہ کہہ کر جاں بحق ہو گئی کہ "جمیلہ الجزائر کے تخت پر۔"

فرانسیسی سپاہی ایک مدت سے مسلمانوں کا صفایا کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ان کے نزدیک بچوں کا کھیل بن گیا تھا۔ زندہ انسانوں کو منٹ دو منٹ کے اندر لاشوں میں تبدیل کر دینا ان کا مشغلہ بن چکا تھا، لیکن آج اس خاتون کے مختصر الفاظ نے، جو اس نے مرنے سے چند لمحے پہلے کہے تھے، ان سپاہیوں کی قلبی حالت منقلب کر دی اور وہ ایک جگہ کھڑے دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے۔ آخر کار ایک سپاہی نے لاش کے قریب آ کر سیلوٹ کیا جس کی سب سپاہیوں نے باری باری تقلید کی اور پھر وہ اسلحہ لئے ہوئے اس طرح روانہ ہوئے جیسے میدانِ کارزار میں شکستِ فاش حاصل کر کے جا رہے ہیں۔

۱۳

الجزائر کے ایک تھانے کے سپاہی اسلحہ سے لیس ہو کر روانہ ہونے ہی والے تھے کہ جیپ سے ایک سپاہی نکلا، اس نے تھانیدار کو سیلوٹ کرنے کے بعد ایک سرکلر پیش کر دیا۔ یہ سرکلر ہیڈ کوارٹر کی طرف سے آیا تھا جس کے ساتھ منسلکہ کئی فوٹوگراف تھے۔ نصف فوٹوگراف جمیلہ بوحائرڈ کے تھے اور نصف یوسف سعدی کے ——— وہ یوسف سعدی جو الجزیرہ میں مسلم قوم پرستوں کی خفیہ تحریکِ آزادی میں مخالفین پر بم پھینکنے میں کمال رکھتا تھا۔

سرکلر میں یہ احکام درج تھے کہ چھاپے مارتے وقت جمیلہ بوحائرڈ اور یوسف سعدی کا کا مقابلہ کرنے کی بجائے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ جان کا خطرہ ہو تو مقابلہ ضرور کیا جائے لیکن اگر خود زخمی ہو کر بھی ان کی گرفتاری عمل میں آسکے تو انھیں گرفتار کر کے پیش کر دیا جائے۔

تھانہ دار نے چھاپہ مار سپاہیوں کو سرکلر کا مضمون سمجھانے کے بعد یوسف

اور جمیلہ بوحائرڈ کی چند تصویریں دے دیں جنھیں حفاظت سے رکھنے کے بعد پولیس کا دستہ مشین گنوں کے ساتھ جیپوں میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ یہ زمانہ ۱۹۵۷ء کے اوائل کا تھا جب کہ نو لاکھ سے زیادہ مسلمان جامِ شہادت پی چکے تھے۔ پولیس اور فوج اس کے سوا چارا نہیں دیکھ رہی تھی کہ چھاپوں پر چھاپے مار کر الجزائری مسلمانوں کو اس قدر ہراساں اور خوف زدہ کر دیا جاتے کہ وہ الجزائر کی آزادی کا نام لینا چھوڑ دیں، یہی وجہ ہے کہ الجزائر کے طول و عرض میں ہر گھر اس بات کا ہر وقت متوقع رہتا تھا کہ ان پر اچانک کوئی نہ کوئی مصیبت آسمانی بجلی کی طرح آپڑے گی اور وہ اپنے بچاؤ کا کوئی سامان نہ کرسکیں گے۔ الجزائر کے مختلف شہروں میں کہیں چھاتہ فوجیں اتر کر بموں اور گولیوں کی موسلا دھار بارش کی طرح بوچھاڑ کرنے کے بعد روانہ ہوجاتیں اور کہیں پولیس کے دستے مسلمانوں کے نعروں کے جواب میں اسلحہ استعمال کرنے لگتے الجزائر کے کسی حصے پر کوئی وقت ایسا نہ آتا جب کہ قتل و غارت کا بازار گرم نہ ہو رہا ہوتا۔ الجزائری حفیہ تحریک کے کارکن چھاتہ فوجی دستوں اور چھاپہ مار دستوں کے پروگراموں سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو کر ان کے مقابلوں کا سامان کرتے رہتے۔ علاوہ اس کے خود بھی مختلف تھانوں چوکیوں اور اڈوں پر خفیہ طور پر بم پھینکتے رہتے جس سے فوج اور پولیس تنگ آگئی کیونکہ اگر پولیس یا فوج دس مقامات پر قتل و غارت کا بازار گرم کرتی تو خفیہ قومی تحریک پندرہ مقامات پر اس کے ردِ عمل کی مثالیں پیدا کر دیتی۔ مجموعی طور پر خود پولیس اور فوج کا بھی ایک حصہ موت کا شکار ہو جاتا اور فرانسیسی آبادی کے علاوہ یورپی آبادکاروں میں بھی ایسی بے چینی اور بے اطمینانی پھیل جاتی کہ وہ سکون و قرار کو ترس ترس جاتے عمل اور ردِ عمل کی یہ مثالیں اپنی اپنی جگہ درست لیکن پولیس اور فوج اپنی حکومت ہی کے احکامات پر عمل کر سکتی تھی اور اس میں اس سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہو رہا تھا۔ جمیلہ بوحائرڈ ان دنوں، جب کہ موسم بہار کی آمد آمد تھی، اپنی خفیہ کارگذاریوں میں ضرورت سے زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ پولیس اور فوج نے اس کی تلاش کے لیئے اس کے ماں باپ بھائی بہنوں اور دوسرے اعزہ کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن کسی نے اس کا پتہ نہ بتایا۔ دراصل وہ پتہ بتا بھی نہ سکتے تھے

کیونکہ خود انھیں اپنی جمیلہ کے نت نئے پروگراموں سے واقفیت نہ ہوتی تھی۔

ایک روز جمیلہ نے بہت سے بم ایک کار میں رکھ کر ایک نامعلوم مقام کا قصد کیا، راستے میں اس نے ایک دوسرے شخص کو ہمراہ لیا اور ہوا ہوگئی۔ اس کار میں بیٹھے ہوئے دو مرد معلوم ہوتے تھے کیونکہ جمیلہ نے بھیس بدل کر اپنے آپ کو مکمل نوجوان لڑکا بنا رکھا تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز بھی لڑکوں ہی کی طرح تھا اس لئے جمیلہ کے متلاشی اسے دیکھ کر بھی اسے پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ پولیس اور فوج کو یہ احکامات مل چکے تھے کہ جمیلہ کو جلد از جلد گرفتار کر لیا جائے کیونکہ اس کے بغیر بغاوت فرو نہیں ہو سکتی۔ جن مقامات پر پولیس کا خفیہ طور پر کامیاب مقابلہ ہوتا تھا، پولیس کو معلوم ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اس میں جمیلہ اور اسکے ساتھیوں کا مخفی ہاتھ کس قدر کام کر رہا ہے۔ جمیلہ کی دیکھا دیکھی سکول اور کالج کی لڑکیوں کے علاوہ گھریلو خواتین کو بھی قومی تحریک میں شامل ہو کر کام کرنے کا شوق پیدا ہو رہا تھا۔ اور وہ چاہتی تھیں کہ جمیلہ سے ملاقات ہو تو اپنا منشا ظاہر کریں لیکن جمیلہ ایسے نازک حالات سے دوچار تھی کہ وہ سوا اپنی جماعت کے کارکنوں کے کسی سے نہیں مل سکتی تھی۔ ایک مقام پر جب کہ چھاتہ فوج زمین پر اتر کر مسلمانوں کے نعرۂ آزادی کا جواب دے رہی تھی، جمیلہ اور اس کے کارکنوں کی مشینری بھی وہاں ایک مکان میں اپنا کام کر رہی تھی، چھاتہ فوج پر بم ایسی سمت سے پھینکے جاتے کہ اسے اس مکان پر کچھ شبہ نہ ہوتا جو ان کے لئے بارود خانہ بنا ہوا تھا۔ جس سمت سے اب تیسری مرتبہ بم پھینکنے کا پروگرام تھا وہاں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں یوسف سعدی بموں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس مکان کے نزدیک ہی چھاتہ فوج پہرہ لگائے کھڑی تھی۔

آج یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ اگر مکانوں سے لوگ نکل پڑے تو چھاتہ فوج کی گولیاں اور بم انھیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہر گھر کے لوگ نعرۂ آزادی بلند کرنا چاہتے تھے۔ لیکن فوج کے اسلحہ کو مستعد پا کر خاموش تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس علاقہ کے مکانوں میں کوئی متنفس موجود نہیں۔ خفیہ قومی تحریک کا خیال تھا کہ اگر اس فوج کا آج مقابلہ نہ کیا گیا تو وہ چٹان کی طرح

اس علاقہ میں ڈٹی رہے گی اور کسی نہ کسی دن یہاں کے شہریوں کو بیس ڈالے گی۔ جمیلہ کو اسلامی تاریخ کی ایک شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی سچائی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ یعنی انھوں نے اپنے سفر میں اپنی ماں کی اس نصیحت پر پوری طرح عمل کیا تھا کہ ڈاکوؤں کے نرغے میں پھنس کر بھی سچائی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ تمھارے پاس کیا ہے۔ اس نے جواب دیا تھا کہ "میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں" ڈاکو اس کے اس سچے بیان کو جھوٹا سمجھنے لگ گئے۔ جمیلہ کو خیال آیا کہ آج جب کہ اس علاقہ کی حفاظت ضروری ہے وہ کیوں نہ حضرت شیخ عبدالقادر کے صدق آموز عمل کی تقلید کرے۔ چنانچہ اس نے لڑکے کے لباس میں حلیہ بدلنے کے بعد ایک بیگ ہاتھ میں لیا اور یوسف سعدی کی طرف چل دی۔ پہلے تو پولیس کو اس پر کوئی شبہ نہ ہوا کیونکہ وہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ ایسے خطرناک ماحول میں کوئی شخص اپنے گھر سے باہر آسکتا ہے اس لئے ضرور کوئی اپنے کام سے جارہا ہوگا لیکن کچھ سپاہیوں کو شبہ ہوا تو ان میں سے ایک قریب آتے ہوئے کڑک کر بولا۔

"ٹھہرو! تم کون ہو؟"

جمیلہ جس نے ایک تاریخی گرانقدر شخصیت کے عمل کو اپنا راہنما بنانے کا عزم کیا تھا بالکل نہ گھبرائی اور رُکنے کے بعد جواب میں کہنے لگی۔

"کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"اس بیگ میں کیا ہے؟"

"اس میں بم بھرے ہوئے ہیں بم"

سپاہی جس نے سختی سے سوال کیا تھا اس جواب پر اچانک ہنس دیا جمیلہ نے بیگ آگے کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"لینا چاہتے ہیں تو لے لیجے۔"

سپاہی کو اب یقین ہو گیا کہ اس میں بم ہرگز نہ ہوں گے چنانچہ اس نے کہا "اتنے

سے لڑکے اور بم رکھنے کی جرأت! جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔"

چنانچہ جمیلہ وہاں سے چل دی۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے جمیلہ کے روانہ ہونے کا منظر بھی دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے کہ وہ کس طرح بچ گئی ہے۔ حالانکہ اس کے مکان سے اترنے پر ہی انھیں اس کی موت صاف نظر آرہی تھی۔

جمیلہ بیگ اٹھائے قدم بڑھاتی بہت آگے نکل گئی اور پھر دور جاکر واپس ٹوٹے پھوٹے مکان کی طرف آنا شروع ہوئی۔ فوج کو پتہ بھی نہ چلا اور بموں سے بھرا ہوا بیگ یوسف سعدی کے پاس پہنچ بھی گیا۔ بم حوالے کرنے کے بعد وہ خالی بیگ لے کر واپس اسی مکان کی جانب روانہ ہو گئی جہاں سے چلی تھی۔ جب فوجی پہرے کے قریب پہنچی تو سپاہیوں کو شبہ ہوا کہ کیا معلوم اس کے بیگ میں بم موجود ہی ہوں۔ کیوں نہ تحقیق کرلی جائے۔ چنانچہ فوج کے دو سپاہیوں نے اسے آواز دے کر ٹھہرا لیا۔ سپاہی قریب آئے اور انھوں نے اس کے ہاتھ سے بیگ چھین لیا۔ "دکھاؤ اس میں کیا ہے؟"

"اس میں بم ہیں بم" جمیلہ نے دوبارہ مسکراتے ہوئے کہا۔ بیگ یوں بھی ہلکا معلوم ہوتا تھا۔ جب اسے کھول کر دیکھا تو وہ خالی تھا۔ ایک سپاہی نے جمیلہ کو چپت رسید کر کے کہا۔ "تمہیں ہم سے مذاق کیوں سوجھا ہے؟"

جمیلہ نے چپت کھانے کے بعد بھی ہنس کر جواب دیا۔ "اس لئے کہ آپ لوگ ہر وقت پریشان کن کاروائی میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی وقت ہنسی مذاق کا بھی ہونا چاہیئے۔

جمیلہ کے اس جملے سے سپاہیوں کے غصیلے چہروں کے آثار مسکراہٹ میں بدل گئے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت پر لطف لونڈے ہو۔"

اور جمیلہ نے کہا "اس میں شک ہی کیا ہے۔"

اس پر سپاہی نے اس کا بیگ لوٹاتے ہوئے کہا۔ "تو لو پھر تمہیں ہم یہ بیگ انعام

ییں دیتے ہیں "

بیگ حاصل کرنے کے بعد جمیلہ نے شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر کو روانہ ہوگئی۔ مکان کے نزدیک آتے ہوئے اسے یونہی خیال آیا کہ وہ اب کسی دوسرے مکان میں چلی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے۔ قزج کو اس مکان پر شبہ ہو جائے، چنانچہ وہ دور جا کر ایک دوسرے مکان میں داخل ہوگئی۔ داخل ہوئی ہی تھی کہ اس کی ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے ہوئی جو میز کے سامنے کرسی پر بیٹھی ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ جمیلہ نے داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

"السلام علیکم"

لڑکی ایک حسین و جمیل لڑکے کو دیکھ کر جھینپ سی گئی۔ "کہیئے کس سے ملنا ہے، آپ کو شاید معلوم نہیں اس گھر میں پردہ ہے"

جمیلہ نے کہا۔ "ہاں آپ سے معلوم ہوگیا کہ یہ گھر باپردہ ہے مگر میں مجبوری میں کیا کرسکتا تھا"

لڑکی نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔ "یہی کہ آپ اجازت لے کر کمرے میں آتے"

"خیر اب تو میں آگیا ہوں اور مجھے ملنا بھی آپ ہی سے ہے"

"کیا مطلب"؟ لڑکی حیرت سے بولی۔ "مجھ سے ملنا ہے "کیوں؟"

"یہ دریافت کرنے" جمیلہ نے کہا "کہ آپ کو ایسے خطرناک حالات میں مطالعہ کی کیا سوجھی ہے"

"اس لئے کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ پھر میں وقتِ عزیز کو بے کار کیوں جانے دوں ——— مگر آپ کہئے آپ کو مجھ سے کیا کام ہے"

"مجھے آپ سے پہلے تو وہی کام تھا جو میں بیان کر چکا ہوں اور اب یہ کام ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے"

لڑکی اپنے غصے پر قابو نہ پا سکی۔ "کیا آپ یہاں سے جا نہیں سکتے؟"

"بالکل نہیں" جمیلہ نے کہا "کیا میں خوبصورت نہیں ہوں کہ آپ میری محبت کو یوں ٹھکرا رہی ہیں"۔

"کیا میں اپنے ماں باپ کو بلاؤں تاکہ آپ اپنی محبت کا مزا چکھ سکیں، آپ کو شرم نہیں آتی۔ آپ کو شاید اپنا انجام معلوم نہیں" لڑکی کے منہ میں جو کچھ آیا کہہ گئی۔

جمیلہ مسکرا کر بولی "ہاں مجھے اپنا انجام معلوم ہے مگر میں اس دعویٰ سے باز نہیں آ سکتا۔ کہ آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ لیجیے پستول تاکہ میری محبت کا امتحان ہو سکے" جمیلہ نے اپنی کمر سے پستول نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

باتوں کی آواز سن کر لڑکی کے والدین اور بھائی اس طرف آ گئے۔ "کیا بات ہے" وہ گھبرا کر بولے۔

لڑکی نے کہا "یہ نوجوان اچانک بغیر اجازت کے یہاں آ گیا ہے اور مجھ سے عجیب قسم کی باتیں کر رہا ہے"۔

جمیلہ نے اپنے سر سے ٹوپی اتارنے کے ساتھ ہی کہا۔ "میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے اور انھوں نے برا مان لیا"۔

ٹوپی اترنے کے بعد جب نسوانی بال نظر آئے تو سب حیران ہو کر ہنسنے لگے اور لڑکی نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ "بہن آپ نے بہت پُر لطف مذاق کیا ہے"۔

جمیلہ نے کہا "مشکل یہ ہے کہ یہی لفظ فوجی سپاہی کہتے تھے......... خیر اب وقت زیادہ نہیں، میں قومی تحریک سے تعلق رکھتی ہوں۔ اور ہم نے نزدیک ہی اس فوج کو ہمیشہ کی نیند سلا دینے کا انتظام کر رکھا ہے۔ چونکہ میں فوج کی نظروں میں آ چکی ہوں اس لئے مصلحت اس میں دیکھی کہ کسی دوسرے مکان میں چلی جاؤں"۔

لڑکی کے والدین نے کہا "آپ بصد شوق یہاں قیام کر سکتی ہیں۔ ہماری اس سے بڑی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ قومی کارکنوں کو پناہ دیں۔ آپ جب تک رہنا چاہیں رہیں"۔

"آپ کا نام؟" جمیلہ نے لڑکی سے پوچھا۔

"میرا نام رابعہ ہے .... اور آپ کا نام؟"

"میرا نام بھی رابعہ ہے" جمیلہ نے کہا۔ "خوب اتفاق ہے ..... آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟"

رابعہ نے کہا "اب تو آپ ہی میری بہن ہیں، میں اکیلی تھی اور یہ میرے بھائی ہیں ناصر اور باقر"

"خوب" جمیلہ نے کہا۔ "پڑھتے ہوں گے سکول میں"

"کیا پڑھیں گے، الجزائر آزاد ہو تو اطمینان سے پڑھ سکیں" رابعہ نے جواب میں کہا۔

"مگر الجزائر تو آزاد ہو کر رہے گا" جمیلہ نے کہا اور رابعہ بولی

"بہن آپ نے یہ جملہ جمیلہ بوحائرڈ کی طرح کہا ہے، سنا ہے اس کی زبان پر ہر وقت یہی جملہ رہتا ہے"

جمیلہ نے کہا "ہاں میں نے بھی سنا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے آزادی مل جانے کا پورا ــــــــ"

جمیلہ نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ بم چلنے کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ جمیلہ نے کہا۔ "تو بہن اب اجازت چاہتی ہوں، امی جان! اور ابا جان، آپ کا شکریہ، موقع ملا تو پھر بھی آؤں گی۔ اچھا ننھے بھائیو! السلام علیکم"

وہ جلدی سے لڑکا بن کر روانہ ہو گئی۔ رابعہ اور اس کے والدین چھت پر چڑھ گئے، دیکھا تو سامنے کا کشادہ بازار دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ بہت دیر بعد دھواں ختم ہوا تو فوجیوں کی لاشیں نظر آئیں۔ ان میں کچھ راہ گیر بھی خاک و خون میں تڑپ رہے تھے۔ انھوں نے دور کچھ سائے ابھرتے دیکھے جو لاشوں کے انبار میں جا کر کچھ چیزیں تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر گزری تو لوگ مکانوں سے باہر نکل آئے اور نعرہ آزادی لگانے لگے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان ایک دوسرے

نوجوان کو آفرین کہہ رہا ہے۔ آفرین کہنے والے کی آواز باریک تھی اور وہ جمیلہ تھی۔ اور آفرین لینے والا نوجوان یوسف سعدی تھا۔ جلدی ہی یہ لوگ مختلف گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ یہ لوگ کون تھے، سوائے اس بات کے کہ وہ الجزائر کو آزاد کرانے والے مجاہد ہیں۔

رالعبہ کے والد کی نظر کار میں بیٹھی ہوئی دوسری رالعبہ پر پڑی جس نے دور سے سلام کیا اور پھر اس کی کار پوری رفتار کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

برتھائین ایک عیسائی لڑکی تھی جو عیسائیت کو آباؤ اجداد کا ورثہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ہر اتوار کو گرجے میں جاتی تھی۔ ہر عیسائی حکومتِ فرانس کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتا تھا مگر برتھائین ظاہراً صورت میں شامل رہنے کے ساتھ یہ دعا مانگتی تھی کہ حکومتِ فرانس کو کامیابی بھی ہو اور عقیل کی جان بھی بچی رہے۔

برتھائین کی ایک ہم جماعت میڈلین لیگراند تھی، اسے بھی ایک مسلمان الجزائری سے محبت ہو گئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ یہ لڑکی بھی اپنے مذہب پر سختی سے پابند تھی۔ وہ بھی برتھائین کی طرح عیسائی حکومت کی فتح کے ساتھ اپنے محبوب کی سلامتی کی خواہاں تھی۔ برتھائین ایک صبح میڈلین لیگراند سے جا ملی، وہ اپنے بھائی جیولز کلیرٹیک کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اس کا بھائی اوباش طبع تھا۔ برتھائین کو آتے دیکھ کر میڈلین کی طرح فوراً کھڑا ہو گیا۔

"گڈ مارننگ"

"ہیلو گڈ مارننگ" یہ جواب جیولز کلیرٹیک کا تھا۔ میڈلین لیگرانڈ نے بھی اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اپنے نزدیک بیٹھنے کو جگہ دینا چاہی لیکن اس کے بھائی نے اخلاقی انداز میں اسے اس کے مرمریں بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھالیا۔ اگرچہ عیسائی معاشرہ میں اس قسم کی اخلاقی بے تکلفی کو صحیح معاشرت سمجھا جاتا تھا، لیکن برتھائین دو اسباب سے اس بے تکلفی کو پسند نہ کرتی، ایک اس لیے کہ وہ اپنی ہم جماعت کے بھائی کی بدعادات سے اچھی طرح واقف تھی دوسرے وہ اپنے آپ کو عقیل کی امانت سمجھتی تھی۔ ان دو وجوہ کی بنا پر اس وقت خاموش اور جھجکی ہوئی بیٹھی تھی۔

بجائے اس کے کہ سہیلیاں آپس میں گفتگو کرتیں، میڈلین لیگرانڈ کے بھائی نے بات چیت شروع کردی۔ اس نے کافی کا ایک کپ بنا کر برتھائین کے ہاتھ میں تھمانا چاہا۔ برتھائین نے کہا۔

"میز پر رکھ دیجیے!"

"اس سے میری پیشکش کی توہین ہوگی۔"

اس کی بہن نے کہا "تم کیوں نہیں میز پر رکھ دیتے۔"

لیکن اتنا کہنے کے ساتھ ہی برتھائین محض دل نہ توڑنے کی خاطر اپنا ہاتھ بڑھا چکی تھی۔ اس نے جس وقت پیالی پکڑی اسی وقت جیولز کلیرٹیک نے اپنی انگلی سے اس کے ہاتھ کی انگلی کو دبا دیا اور پیالی کی گرفت ذرا توقف سے ڈھیلی کی۔ برتھائین ہر چند اپنی سہیلی کی وجہ سے خاموش رہی پھر بھی اُس نے اس کے بھائی کی طرف نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ خودداری ہوتا تو وہاں سے اٹھ جاتا مگر وہ تو ڈھیٹ بنا ہوا ڈٹا رہا، کافی ختم کرنے کے بعد بولا۔

"ڈارلنگ آج تھیٹر دیکھنے ضرور چلنا ہے۔"

برتھائین نے کہا۔ "آج نہیں پھر کبھی سہی" ٹالنے کے انداز میں یہ جملہ بھی وہ اپنی سہیلی کے لحاظ کی وجہ سے کہہ گئی ورنہ دوٹوک جواب دے دیتی۔ اب سوچنے لگی کہ وہ جس مقصد کے لیئے آئی ہے اس کی راہ کس طرح نکالے لیکن فوراً ہی اسے بات سُوجھ گئی۔ اس نے اپنی سہیلی سے کہا۔

"میں آج ایک پرائیویٹ کام سے تمہارے پاس آئی ہوں، کیا تم کچھ وقت نکال سکتی ہو؟" سہیلی نے کہا "کیوں نہیں تم کام بتاؤ میں دل و جاں سے حاضر ہوں۔ اگر بھائی جان کی موجودگی میں نہیں بتا سکتیں تو چند منٹ کے لیئے باہر چلے جائیں گے۔"

بھائی نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کیا میں ایسا ہی بُرا ہوں کہ میرا بیٹھنا ناگوار گذرتا ہے۔"

"ناگوار نہیں بھائی جان! بہت سی باتیں مصلحتاً سب کے سامنے نہیں کی جاتیں۔" بہن نے کہا۔

بھائی کو شرارت سوجھی، اس نے سوچا کہ اسے جب کمرے سے اٹھنا ہی ہے تو کیوں نہ عزت سے خود ہی اُٹھ جائے، وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا "بہت اچھا بعد میں مجھے بھی برتھائین سے مصلحتاً پرائیویٹ باتیں کرنا ہیں اور اس میں تم شامل نہیں ہو گی۔"

برتھائین اس کے اِس متجاوز فقرے سے شرما اور گھبرا سی گئی لیکن اپنی شرم اور گھبراہٹ کو دُور کرنے کے لیئے اس نے اُس کے جانے کے فوراً بعد اپنا معاملہ چھیڑ دیا۔

"سناؤ بھئی آج کل تمہارے عشق کا کیا حال ہے؟"

"وہی پہلے والا حال، بلکہ اُس سے کچھ زیادہ ——— اور تم اپنی سناؤ!"

"میں اِس معاملہ میں تم سے برعکس ہوں ——— تم تو ہنسی خوشی کافی پی رہی تھیں مگر مجھے اِس کے گھونٹ زہر معلوم ہو رہے تھے۔"

"کاش ہمارے محبوب عیسائی ہوتے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن اب کیا کیا جائے معاملہ ٹھہرا محبت کا، پتھر پر دل آگیا ہے تو ہم پتھر کو موم کس طرح بنا سکتے ہیں؟"

"بھئی میرا پتھر تو موم ہو گیا ہے"

"کیا مطلب؟ عیسائی ہو گیا ہے۔"

"نہیں عیسائی تو نہیں ہوا البتہ اُس نے میرا ہو جانے کا وعدہ کر لیا ہے۔"

برتھائین نے ایک آہ بھری۔ "تم بہت خوش قسمت ہو۔"

"کیا میری خوش قسمتی پر تمہیں افسوس ہوا ہے"! سہیلی نے پوچھا۔

"افسوس نہیں" برتھائین نے کہا "رشک آیا ہے —— افسوس تو مجھے اپنی قسمت پر ہے کہ میں اپنے محبوب کے لئے مسلمان ہونے کی بھی پیشکش کر چکی ہوں مگر وہ میرا بننے کو تیار نہیں"۔

"کیا نفرت کرتا ہے"۔ سہیلی نے پوچھا

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "نفرت بھی نہیں اور محبت بھی نہیں"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گی"۔

سہیلی کے ایسا کہنے پر برتھائین خوشی سے اچھل پڑی جیسے اسے اقرارِ محبت کا خط مل گیا ہو۔ اس نے کہا۔ "سچ بتاؤ پیاری کیا میری کوشش کامیاب ہو سکتی ہے"

سہیلی نے جواب دیا۔ "کوشش بشرطیکہ پُر خلوص ہو تو ناکام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

برتھائین فرطِ مسرت سے اپنی جگہ سے اٹھ کر سہیلی کے بالکل قریب آگئی اور پیار سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر کہنے لگی۔ "تمہیں قسم ہے یسوع مسیح کی، مجھے اپنے محبوب کے دل میں گھر کرنے کا طریقہ بتاؤ"۔

سہیلی نے کہا "واہ یہ بھی خوب ہے، قسم کھا رہی ہو یسوع مسیح کی اور ہو رہی تھیں مسلمان —— خوب" —— اپنے اپنے مذہب پر قائم رہ کر محبت کو کامیاب بناؤ تو کوئی بات بھی ہو"۔

برتھائین نے کہا "لیکن اگر مجھے اپنا محبوب مذہب چھوڑنے کی شرط پر ملے تو کیا کروں؟"

"کیا تمہارے محبوب نے یہ مطالبہ کیا ہے؟" سہیلی نے پوچھا

"نہیں کبھی نہیں" اس نے کہا "بلکہ میری پیشکش پر اس نے یہ کہا تھا کہ تمہیں میری وجہ سے مذہب تبدیل نہیں کرنا چاہیئے ہاں اگر اسلام کو سچا مذہب سمجھنے کا تمہیں یقین ہو جائے تو ضرور تبدیل کرو"۔

"لیکن کیا" سہیلی نے مزید پوچھا "تمہارے محبوب نے تمہارے مسلمان ہونے پر اقرارِ محبت کا وعدہ کیا تھا"۔

"نہیں یہ بھی نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں بہت محنت کرنی پڑے گی ——— لیکن میں کہتی ہوں تم اِسے بھلا کیوں نہیں دیتیں"

برتھائین نے ترک الفت کے لفظ سُن کر اضطراری کیفیت میں سہیلی کو چپت رسید کر دی "بکواس نہ کرو، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

برتھائین کی آنکھوں میں یکایک آنسو آ گئے "میں نے اسے بھلانے کی انتہائی کوشش کی ہے مگر اِس کا اثر الٹا ہی پڑا ہے ——— بالکل الٹا"

برتھائین کی سہیلی چپت کھانے کے بعد بجائے خفا ہونے کے ہنس دی "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم ضرور اپنی محبت میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ بس کسی نہ کسی صورت میں اسے اپنانے کی کوشش کرو۔"

برتھائین نے چپت رسید کرنے کی معذرت چاہتے ہوئے کہا "پیاری کیا کروں، میں پاگل ہو گئی ہوں، مجھ سے ایسی حرکتیں اکثر سرزد ہو جاتی ہیں کہ میں اپنی سہیلیوں کو خفا کر بیٹھتی ہوں ایک تم ہو جس نے بُرا نہیں مانا بہرحال میں تم سے معافی مانگتی ہوں"

تم سچ مچ پگلی ہو گئی ہو۔ سہیلی نے کہا "بھلا میں تم سے خفا کیوں ہونے لگی، البتہ جب تمہارے محبوب سے ملوں گی تو اس سے ضرور شکایت کروں گی کہ تم اس کے بن گئے ہوتے تو میں کاہے کو چپت کھاتی"

روتے روتے برتھائین کی ہنسی نکل گئی۔ اب کے اس نے سہیلی کی اِس گال کے بے شمار بوسے لینے شروع کر دیئے جس نے کراری کراری چپت کھائی تھی۔ "تم بہت اچھی سہیلی ہو دیکھو اب میں تم سے کبھی خفا نہ ہوں گی"

سہیلی نے بے اختیار ہنسی ہنستے ہوئے کہا "تم بھی مجموعۂ اضداد ہو۔ ابھی تم خفا تھیں اور ابھی راضی بھی ہو گئیں، یہاں تک کہ جان نچھاور کرنے لگیں، ہٹو مجھے تم پر کوئی اعتبار نہیں رہا"

برتھائین نے اجازت چاہی اور محبت کا بوسہ لے کر اپنے گھر کو چل دی۔

۱۵

عقیل کو بستر پر پڑے بہت دن ہو گئے، زبیدہ کے والدین اور عقیل کے بھائی بہن اس کے علاج کے لئے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار تھے مگر مشکل یہ تھی کہ اس کا ہسپتال لے جانا ناممکن سا ہو گیا کیونکہ وہ دن رات سیدھا پڑا رہتا اور ذرا سی جنبش سے آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ اسے ہسپتال میں لے جانا ممکن ہوتا تو ایکسرے کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا کہ کہیں اس کی کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹ گئی۔ پسلیوں پر تو ضرب نہیں آئی، ریڑھ کی ہڈی کو تو صدمہ نہیں پہنچا، چونکہ ہسپتال پہنچانا ممکن نہ تھا اس لئے آرام آنے سے پہلے یہ وسوسہ ہر وقت جان کا عذاب بنا رہنے لگا کہ شاید ہڈیوں کو ضرب پہنچی ہو اور ان کا علاج نہ ہونے کی وجہ سے تکلیف میں اضافہ ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سہ بارہ معائنہ کرنے کے بعد ایک بات کا کسی حد تک اطمینان دلایا تھا کہ کسی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مریض کبھی چین کی نیند نہ سو سکتا، پندرہ بیس روز میں صرف چار دن بے آرامی اور بے

خوابی کے آئے تھے۔ اس کے بعد اسے گہری نیند آجاتی ہی۔ اگر وہ جسم کو ابھی تک ہلا جلا نہیں سکتا تھا تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسم کے اندرونی حصے بہت زیادہ متاثر ہو چکے ہوں گے۔ علاوہ ازیں چونکہ سوجن بھی کہیں نظر نہ آتی تھی اس لئے یہی خیال کیا جاتا تھا کہ آرام تو آجائے گا لیکن زیادہ سے زیادہ وقت لے کر۔

عقیل کے بارے میں یہ معلوم کر کے کہ اسے اگرچہ بہت دیر میں لیکن آرام ضرور ہو جائے گا اس کے میزبان بہت خوش تھے ان کی خوشی زیادہ تر اس میں تھی کہ آرام ہو جانے میں بہت دیر لگے گی۔ اس تاخیر کا انھیں یہ فائدہ حاصل تھا کہ ان کی عزیز بیٹی زبیدہ تیمارداری کی خدمت میں مگن رہنے کے باعث مجاہدین کی تحریکوں میں حصہ لے کر اپنی جان خطرے میں نہ ڈال سکے گی۔ اسی لئے وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتے تھے کہ عقیل زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لئے ان کا مہمان بنا رہے۔

عقیل اور اس کے بھائی بہن جہاں اپنے میزبانوں کی بے مثال خدمت کے معترف اور ان کے شکر گذار تھے وہاں ان سے شرمندہ بھی کم نہ تھے کہ قدرتی طور پر عقیل کو ایک اجنبی گھر پر بوجھ بننا پڑ گیا ہے۔

ایک شام جب کہ عقیل کی چارپائی کے نزدیک میز کے آس پاس دونوں گھر کافی پینے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، زبیدہ کے والد نے خود بخود بات چھیڑ دی۔

"کرامت بیٹا! آج میں تمہیں، تمہارے بھائی عقیل اور تمہاری بہن عزیزہ کو چند ضروری باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تم لوگ میرے خیال کو ہم سب کے دلوں کی آواز سمجھو گے میں کچھ روز سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم لوگ عقیل کے یہاں رہنے کو اچھا نہیں سمجھ رہے شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ جیسی اس کی خدمت ہونی چاہیئے وہ ہم لوگوں سے نہ ہو رہی ہو، اگر یہ سبب ہے تو پھر تم لوگ بے تکلفی سے ہمیں بتا سکتے ہو کہ ہمیں تمہارے بھائی کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔"

کرامت نے کچھ کہنا چاہا تو عقیل نے روک لیا اور عقیل کچھ کہنے لگا تو عزیزہ بول اٹھی "ہمارے محترم بزرگ آج آپ نے یہ کیا کہہ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان چند روز میں ہم خاموش دکھائی دیتے رہے ہوں گے لیکن ہماری خاموشی کی صرف یہ وجہ ہے کہ ہم آپ لوگوں کے سامنے اپنی آنکھیں اونچی نہیں کر سکتے۔ ہم پر آپ کا جتنا عظیم احسان ہے اس نے ہم سب کے دلوں پر شرمساری کا اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا ہے کہ اس سے عہدہ برا ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ باقی آپ کا یہ فرمانا کہ شاید عقیل کی خدمت میں آپ لوگوں کی طرف سے کمی رہ گئی ہو جس کے باعث ہم خاموش نظر آتے ہیں تو یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ لوگوں نے عقیل بھائی کی جس قدر زیادہ خدمت کی ہے اس کا اظہارِ تشکر ہمارے امکان سے باہر ہے، بس خدا تعالیٰ ہی اجر دے سکتا ہے۔ ہماری خواہش ضرور ہے کہ آپ ہم عزیزوں سے نقدی کی صورت میں کچھ پونجی ضرور قبول فرمالیں جس کا انتظام چند روز میں ——"

زبیدہ کی والدہ نے عزیزہ کی بات پوری نہ ہونے دی۔

"عزیزہ بیٹی تم نے یہ کیا کہہ دیا۔ میں تم سے بہت خفا ہوں اور جب تک تم اس کی مجھ سے معافی نہیں مانگو گی تب تک میں تمہیں معاف نہیں کروں گی، یہاں تک کہ قیامت کے روز میرے ہاتھ میں تمہارا گریبان ہوگا —— کیا تم سمجھتی ہو کہ ہماری عاجزانہ خدمت معاوضہ طلب ہے؟ انسان اپنی چند روزہ زندگی میں زندگی کا یہ اہم مقصد بھول جاتا ہے کہ وہ دوسرے کی خدمت کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اگر ہم دوسرے کی خدمت کرنے میں تکلیف محسوس کرتے ہیں تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی بے مقصد ہے۔ خبردار آئندہ اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کرنا۔"

زبیدہ کی والدہ کی بات ختم ہوئی تو اس کے والد سگریٹ کا کش لینے کے بعد بولے "اب عقیل اور کرامت بھی کوئی بیان دینا چاہیں تو خوشی سے دے سکتے ہیں۔ ان کے جواب کے لئے ہم پوری طرح تیار ہیں۔"

اس جملے پر عقیل کرامت اور عزیزہ ہنس پڑے۔ عقیل نے بس اتنا کہا "میں تو بزرگم اپنی بہن کے خلاف ہوگیا ہوں جس نے شرمساری کا ذکر کیا۔ میں تو اس گھر کو اپنے والدین کا گھر سمجھتا ہوں اور مجھے خدمت کراتے ہوئے کوئی شرمساری محسوس نہیں ہوتی، اس لئے بھی کہ اگر ہوئی تو والدہ محترمہ قیامت کے روز میرا گریبان نہ چھوڑیں گی۔"

"دیکھئے خدا تعالیٰ نے ہمیں بہت پیسہ دیا ہے۔ جو ہماری ضرورت سے زیادہ ہے ضرورت سے زیادہ دولت پر شرعاً ہمارا حق نہیں بلکہ مستحقین کا حق ہے۔ تم لوگ صحیح مستحقین ہو۔ اگر ہمیں تم لوگوں کی خدمت کا موقع نہ ملتا تو گویا ہم اس ثواب سے محروم رہتے جس سے انشاءاللہ اب محروم نہ رہیں گے۔ اس لئے تم لوگ مہربانی کر کے ہمارے ثواب کی کمی کا باعث نہ بنو۔"

"اور میں بھی صاف صاف کہہ دوں کہ تم لوگوں کے ساتھ چونکہ تعلقات زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے عقیل بیٹا کے مکمل طور پر صحت یاب ہونے پر بھی میں تم لوگوں کو جلد تمہارے گھر بھیجنے کو تیار نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے نزدیکی مکان کا انتظام بھی ہم خود کئے دیتے ہیں۔"

کرامت نے کہا "میری زبان تو گنگ ہے، اس میں اب اتنی ہمت نہیں رہی کہ بول سکے۔"

زبیدہ جو اب تک خاموش تھی، کہنے لگی "اگرچہ اب بھی بولے جا رہی ہے۔"

اس پر سب ہنس پڑے۔ لیکن اس ہنسی کو کرامت کے ان چند جملوں نے توقف میں ڈال دیا۔ "حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کے علاوہ جو خدمت بہن زبیدہ نے اپنے بھائی عقیل کی سرانجام دی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہم سب اس کے بہت ہی شکر گزار ہیں۔ عقیل بھائی نے بارہا مجھے بتایا ہے کہ بہن زبیدہ نے ان کی خدمت کی خاطر اپنا سکول جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہم اگر ساری عمر اس خدمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیں تو ——————"

زبیدہ اپنے ذکر سے زمین میں گڑی جا رہی تھی، آخر اس نے کہا۔

"کرامت بھائی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ بھلا میں اس قابل کہاں ہوں یہ تو محض مبالغہ ہے آپ رائی کا پہاڑ بنا رہے ہیں۔"

اس طرح کی گفتگو دیر تک ہوتی رہی، آخر میں زبیدہ کے والدین نے ان سے اس بات کا وعدہ لے لیا کہ وہ ان کے گھر سے جلد نہ جائیں گے۔

زبیدہ اس طرح کا وعدہ لینے سے بہت خوش ہوئی اگرچہ وہ چاہتی تھی کہ عقیل بہت جلد اچھا ہو کر چلنے پھرنے لگے لیکن اسے اس کے ساتھ جو محبت ہو گئی تھی اس کا ایک نازک مقام یہ تھا کہ وہ اسے جلد تندرست نہیں دیکھنا چاہتی تھی وہ سوچتی کہ اگر عقیل جلد اچھا ہو گیا تو وہ لمحات کہاں جائیں گے جو محض اس کی خدمت کے ذریعے حاصل ہو رہے ہیں۔
عقیل نے اپنی تکلیف کے دوران بھی اور اس وقت بھی جب کہ پہلی بار عزیزہ اور کرامت اس مکان میں آگئے تھے، یہ جملہ پورا کرنے کی کوشش کی تھی کہ "میں آپ کو ——————"، مگر وہ یہ جملہ پورا نہ کر سکا تھا۔ اگرچہ اس جملے کے پورا ہوتے وقت زبیدہ سخت گھبرا گئی تھی اور چاہتی تھی کہ پورا نہ ہو لیکن اب وہ یہ چاہنے لگی کہ عقیل کو خود بخود وہ جملہ پورا کرنے کا خیال آجائے۔ کئی مواقع دونوں کے علیحدہ طور پر مل بیٹھنے کے پیدا ہوئے لیکن عقیل نے وہ جملہ اپنی زبان سے نہ کہا۔
زبیدہ نے کئی روز کے بعد فیصلہ کر لیا کہ اب جب بھی تنہائی میسر آئی تو وہ اس نامکمل فقرے کو پورا کرنے کی یاد دہانی کرا دے گی۔ لیکن تنہائی کے کتنے ہی موقع آئے اور خالی چلے گئے۔ زبیدہ کو اپنے آپ پر سخت غصہ آیا اس نے حلف اٹھا لیا کہ وہ اب موقع کو کبھی ضائع نہ جانے دے گی، اگر اس نے ضائع جانے دیا تو ہرجانے کے طور پر پچاس فرانک غریبوں میں تقسیم کرے گی۔

اس کے بعد تنہائی کا ایک موقع آیا تو اسے بڑی آسانی سے ضائع کر دیا۔ دوسرا آیا تو وہ بھی ضائع ہو گیا، تیسرا آیا تو اس سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ آخر اس نے اپنے حساب سے پچاس فرانک نکالے اور محلے کے غریبوں میں تقسیم کرا دئے۔ ان فرانکوں کی تقسیم کا علم جب عقیل کو ہوا تو اس نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

"یہ خیرات کس لئے زبیدہ صاحبہ؟" اس وقت اتفاق سے کمرے میں کوئی نہ تھا۔ زبیدہ نے اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کے اچھا ہونے کی خوشی

ہیں۔"

عقیل نے حیران ہو کر کہا "کیا واقعی؟ لیکن میں ابھی اچھا کہاں ہوا ہوں؟"

زبیدہ نے کہا "پہلی تکلیف کے مقابلے میں موجودہ تکلیف تو بہت ہی کم ہے۔ اور اس کا شکریہ ہمارے لئے ضروری ہے۔"

عقیل نے کہا "حقیقت یہ ہے میرا نام نہیں تمہارا نام عقیل یا عقیلہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ تم روز عقل کی باتیں کرتی رہتی ہو۔"

زبیدہ شرما گئی، اس نے خیال کیا خدا جانے بعد میں موقع ملے یا نہ ملے آج نامکمل فقرے کو مکمل کرانے کی جرات کر ہی دے۔ خواہ اس جرات مندی پر اسے نتیجے کے طور پر زمین میں گڑ جانا پڑے۔ اس نے کہا "آپ نے ایک بار کہا تھا ——— ایک بار نہیں بلکہ دو یا تین بار ———"

اچھا ہوا کہ زبیدہ کی زبان کو مزید تکلیف نہ اٹھانی پڑی اور عقیل نے بات کاٹ لی "اسی لئے میں کہتا ہوں کہ عقیل میں نہیں تم ہو، ایک بات مکمل کرنے کی بار بار کوشش کرتا رہا مگر نہ ہو سکی ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اچھا!" زبیدہ نے اپنے مصروف ہاتھوں کو اچانک روک کر اور گردن موڑتے ہوئے عقیل کی طرف دیکھ کر کہا "کیسے جانتے ہیں آپ مجھے؟"

عقیل نے کہا "اس طرح کہ میں نے تمہیں ایک اہم موقع پر دیکھا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارا گرویدہ ہو گیا تھا۔"

اب پھر زبیدہ کو شرمانا پڑا۔ عقیل اس بات سے حیران تھا کہ وہ آخر کس بات سے شرما رہی ہے مگر یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی یہ شرم بحال رہے۔ اس نے کہا۔ "تمہیں یاد ہو گا ایک ریستوران میں ایک سپاہی نے بلا وجہ ایک الجزائری کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا غالباً تم ہی اس وقت اپنے والد کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھی کہیں سے آ رہی تھیں کہ اچانک یہ منظر سامنے آ گیا

اسوقت فرانسیسی سپاہی نے مقتول الجزائری کی لاش کو مخاطب کیا تھا کہ "بتاؤ الجزائری کی آواز ختم ہوئی یا نہیں" ——— اور تم اپنی گاڑی سے باہر نکل کر سپاہی کے سامنے آگئیں اور بلند آواز سے کہا۔ "کبھی ختم نہیں ہو سکتی الجزائری کی آواز مرد تو مرد الجزائری عورتیں بھی جاں سپاری میں انشاءاللہ پیچھے نہ رہیں گی۔"

زبیدہ نے فوراً کہا "ہاں مجھے بھی یاد آگیا کیا آپ ہی نے بلند آواز سے انشاءاللہ کہا تھا؟"

"ہاں وہ میں ہی تھا" عقیل نے کہا "پھر تمہارے والد تمہیں مشکل سے کھینچ کر گاڑی میں واپس لے گئے تھے اور گاڑی ہوا ہو گئی تھی۔"

زبیدہ نے کہا۔ "ہاں مجھے اچھی طرح یاد آگیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں خوب یاد رکھا۔" عقیل نے کہا

"کیا میں نے آپ کو یاد نہیں رکھا۔" زبیدہ جھینپتے ہوئے بولی "آپ نے صرف ایک لفظ منہ سے نکالا اور وہ میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا؟"

عقیل نے سنجیدہ ہو کر کہا "مجھے حقیقتاً اس بات کی بہت خوشی ہے کہ میں ایک مجاہدہ کا مہمان ہوا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ خیالات اور جذبات کے لحاظ سے تم اور میں ایک ہیں۔"

زبیدہ نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ اس اعتراف پر عقیل کو زبیدہ بڑی اچھی لگی۔ اس نے ایک اور بات کہہ دی۔

"سچ سچ بتانا' میرا یہاں ٹھہرے رہنا تمہاری پڑھائی میں ہرج کا باعث تو نہیں ہوتا۔"

زبیدہ نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ "ہوتا ہے۔"

"تو پھر میری لاش کو تم میرے گھر بھجوا کیوں نہیں دیتیں" عقیل نے کہا

زبیدہ نے اس کا جواب سر کی جنبش سے دیا جو نفی کے مفہوم میں دائیں بائیں ہل رہا تھا۔

"گویا تم چاہتی ہو کہ خواہ تمہاری تعلیم کو نقصان پہنچے مگر میں رہوں تمہارے ہی گھر ——— اس

کی وجہ؟"

نہ جانے زبیدہ کس طرح جرأت کر سکی، ایک کاغذ پر لفظ "محبت" لکھ کر جو اس کے سامنے پڑا تھا، کمرے سے نکل گئی۔ سامنے اس کی والدہ آرہی تھی۔ "امی میں کل سے سکول جانا شروع کر دوں گی۔ اب تو عقیل بھائی کو بہت آرام ہو گیا ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس کی والدہ نے کہا اور وہ برآمدے سے نکل کر تیسرے کمرے میں جاکر اپنی کتابوں کے اوراق الٹ پلٹ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اب وہ واقعی اپنی تعلیم کی طرف راغب ہونا چاہتی تھی کیونکہ اظہارِ محبت کا کٹھن کام جو اس کے نزدیک مشکل ترین بلکہ محال ترین تھا، اسی کے قلم سے پورا ہو چکا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی عمرِ عزیز حصولِ تعلیم میں گذارے۔ وہ آج بے حد خوش تھی۔ اس کا انگ انگ انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اسے آج اپنا گھر بہت اچھا لگ رہا تھا اور اس گھر کا وہ کمرہ بے حد حسین معلوم ہو رہا تھا جس میں عقیل موجود تھا۔ اب وہ چاہنے لگی کہ عقیل بہت جلد اچھا ہو جائے تاکہ وہ اپنے والدین اور دوسرے عزیزوں سے چھپ کر اس سے تنہائی میں باتیں کیا کرے۔ اسے خیال آیا کہ آج ایسا خوش قسمت دن ہے جب کہ وہ سکول میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عقیل کی ہمیشہ کے لئے ہو جانے کے سامان کرے گی۔ وہ یہ ساری باتیں سوچتے وقت ایک کتاب کے ورق بار بار پلٹ رہی تھی مگر ہر جگہ اسے عقیل ہی کی شکل نظر آرہی تھی۔ اس کامل تصور کی دنیا میں رہتے ہوئے وہ اچانک واپس آگئی۔ اچانک اس کے چہرے پر فکر کے آثار چھا گئے۔ "میں بھی کیسی پگلی ہوں، کیا یہ ضروری ہے کہ جس سے مجھے محبت ہے اسے بھی ——"

اس کے لئے اس کا یہ وہم صحیح ثابت ہوا۔ اس نے اپنے والد کو والدہ سے یہ کہتے ہوئے سنا، "زبیدہ کہاں ہے اس سے کہو کہ وہ کافی تیار کرے۔ عقیل کی ایک کلاس فیلو اس سے ملنے آئی ہے۔"

یہ سُن کر زبیدہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، اسے پاکستانی شاعر کا شعر یاد آگیا جس کا ترجمہ یہ

تھا کہ "تمنائے اظہار پر یہ کشمکش کس قدر جانکاہ ہے کہ اگر میں اقرارِ محبت کر بیٹھی تو کیا معلوم کہ میرا محبوب انکار کر دے۔" اس نے دل میں کہا "میں پگلی اظہارِ محبت سے کتنی خوش ہو رہی تھی۔ مگر یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اُس کی طرف سے بھی منشا معلوم ہونا چاہیئے۔"

والدہ نے زبیدہ کو ایک طرح سے ڈانٹ کر کہا "میں نے پہلے بھی آواز دی ہے، تم نے سنا نہیں، مہمان کے لئے کافی تیار کرو۔"

زبیدہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکی کہ "بہت اچھا" لیکن اس کا جی بالکل نہ چاہتا تھا۔ وہ گرتی پڑتی انگیٹھی کی طرف گئی، آگ روشن کی اور پانی کی کیتلی رکھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ کافی کا ٹرے خود نہیں لے جائے گی۔ لیکن فوراً ارادہ بدل لیا "کیوں نہ خود جا کر اپنی رقیب کا دیدار کر لوں دیکھوں تو کیا وہ واقعی اس قدر خوبصورت ہے کہ عقیل کا دل اس پر لٹو ہو گیا ہے۔"

کافی تیار ہونے سے پہلے زبیدہ کے والدین اور عزیزہ عقیل کے کمرے میں بیٹھ کر اندر آ گئے، کافی تیار ہوئی تو زبیدہ ٹرے میں برتن رکھے دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی نہ جانے کس طرح سنبھل سکی، میز پر ٹرے رکھا اور مہمان کو سلام کیا، مہمان نے کچھ اس طرح غور اور انہماک سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ "اچھا تم ہی میری رقیب ہو"۔

زبیدہ کافی کے برتن ٹرے سے نکال کر میز پر رکھ چکی اور واپس جانے لگی تو عقیل نے اسے روک لیا "زبیدہ یہاں بیٹھو میں تمہارا تعارف کرا دوں۔"

یہ ہیں میری پرانی کلاس فیلو برتھا ہیٹ۔ باوجود اس کے کہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں لیکن انھیں مجھ مسلمان سے بڑی ہمدردی ہے ——— اور یہ ہیں مس زبیدہ جنھوں نے مجھ زخمی کو گرتا ہوا دیکھ کر اٹھا لیا تھا اور اپنے اس گھر میں لے آئی تھیں، اب تک اگر میں اچھا ہو گیا ہوں تو اس کی ساری وجہ یہ خود اور اس کے دردمند والدین کی لازوال خدمت ہے۔ میں ان کا احسان کبھی نہیں اتار سکتا ——— لو بھئی تعارف کے بعد کافی پیو۔ میرا خیال ہے زبیدہ کافی پیالیوں میں ڈالنے کی تکلیف کرے گی۔"

وہ زبیدہ جو عقیل کی ہر خدمت کے لئے دل وجان سے ہر وقت تیار رہتی تھی اس کی موجودہ خدمت کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگی۔ مہمان نوازی کا تقاضا پورا کرنا ضروری تھا اسی لئے با دلِ ناخواستہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کافی پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔

کافی پینے سے پہلے اور پینے کے دوران، زبیدہ نے دیکھا کہ مہمان لڑکی کی نگاہیں عقیل کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ بار بار اس کے جسم کے مختلف حصوں کو مس کر کے کہتی تھی "وہ دن کب آئے گا جب تم چلتے پھرتے نظر آؤ گے۔"

اور زبیدہ کی خود غرضی نے اپنے دل میں کہنا شروع کیا "خدا کرے وہ دن کبھی نہ آئے کہ عقیل چلنے پھرنے کے قابل ہو کر برتھائین کے ساتھ آئے جائے۔"

کافی پیتے ہوئے برتھائین نے کہا "عقیل صاحب کیا خیال ہے ایک ہفتے تک آپ تندرست ہو جائیں گے، میں آپ کی صحت یابی پر ایک بہت بڑی پارٹی دینا چاہتی ہوں۔"

عقیل نے مسکرا کر کہا "تم جتنی بھی بڑی پارٹی دو گی اس کے لئے میں تمہارا شکر گذار رہوں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مس زبیدہ بلاناغہ جس قدر اچھا اور مزاج کے مطابق کھانا کھلاتی ہیں اس کا جواب ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔"

عقیل کے اِس جملے سے زبیدہ خوش نہ ہوئی کیوں کہ وہ یہی سمجھی کہ عقیل نے برتھائین کی موجودگی میں اسے لفظوں سے خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ برتھائین نے عقیل کے کہنے پر کہا۔

"عقیل صاحب اِس میں تو شک نہیں کہ مس زبیدہ کے خلوصِ محبت کا مقابلہ ناممکن ہے لیکن میرے دِل میں جو ایک مدت سے آپ کی محبت چلی آتی ہے اس کے خلوص کی بھی کوئی قیمت ضرور ہے۔"

"کیوں نہیں" عقیل نے کہا "مگر موجودہ سیاسی حالات میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مل بھی سکا کریں گے۔"

کافی پی جا چکی تھی، زبیدہ نے برتن ٹرے میں رکھے اور اندر لے گئی۔ پھر وہ دوسرے

کمرے میں دروازے کی اوٹ سے ہم جماعتوں کی باتیں سننے میں مگن ہو گئی۔ اس نے بہت ہوشربا مناظر دیکھے۔

"میں آپ سے سچ کہتی ہوں کہ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

عقیل خاموش تھا، زبیدہ کو غصہ آرہا تھا کہ کیا اس کے منہ میں زبان نہیں جو برتھائین کی زبان بند کر دے؟

تھوڑی دیر بعد برتھائین نے جوشِ محبت میں عقیل کا ہاتھ تھام کر اپنے گال سے لگا لیا۔ اور پھر ہوئے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ "خدا جانے تمہیں مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا، میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں، کیا تم پھر بھی مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے؟"

عقیل نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "تمہیں خیال ہونا چاہیئے کہ تم کہاں بیٹھی ہو اور کس قسم کی گفتگو کر رہی ہو"

"بس میں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم نے مجھے اپنی محبت کے قابل نہ سمجھا تو میں خودکشی کروں گی۔"

"تو پھر کر لو" یہ جواب اوٹ میں کھڑی زبیدہ نے اپنے دل میں دیا۔

"ایسا خیال دل میں نہیں لانا چاہیئے" عقیل نے کہا۔

زبیدہ بہت باتیں سننا چاہتی تھی مگر برتھائین کی باتیں برداشت نہ کر سکنے کے باعث کمرے میں آ گئی۔ برتھائین نے بات بدلنے کے لئے کہا "تو کیا میں آپ کے پاس ڈاکٹر بھیجوں؟"

بجائے اس کے کہ عقیل کوئی جواب دیتا، زبیدہ چلّا اٹھی "آپ کی مہربانی یہاں ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔"

"اچھا تو میں اب چلتی ہوں" برتھائین نے اچانک عقیل سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "پھر کبھی آؤں گی —— مس زبیدہ سلام۔"

وہ وہاں سے چلی گئی اور عقیل کے سینے پر پڑا ہوا وہ کاغذ اٹھا کر جس پر "محبت" لکھا تھا زبیدہ نے پرزے پرزے کر دیا اور خود غصہ کی حالت میں کمرہ سے باہر نکل گئی۔

۱۶

جمیلہ بوحائرڈ نے الجزائر کی آزادی کے سلسلے میں خفیہ قومی تنظیم کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اسے اپنے جوش مگر مخفی عمل سے پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہ مدافعت ہی کے موقعوں پر نہیں جارحیت میں بھی دشمنوں کے ساتھ برزو آزما ہونے میں بہت سے مردوں کو پیچھے چھوڑ گئی۔ جمیلہ بوحارڈ خود طبعاً نہایت بامروت، رحمدل اور با اخلاق نوجوان لڑکی تھی لیکن جب کوئی کسی کے سر پہ تلوار مارنا چاہئے تو یہ موقع مروت، رحمدلی یا اخلاق کا نہیں ہوتا بلکہ بہ امر مجبوری مقابلہ کرنے کا ہوتا ہے۔ جمیلہ الجزائر کے مختلف شہروں اور دیہات میں گھومتی پھرتی رہی اور کہیں مدافعت کر کے اور کہیں جارحیت کی دہشت پھیلا کر حکومت پر یہ ثابت کرتی رہی کہ جس طرح انگریزوں کو پاکستان دینا پڑا تھا یا جس طرح فرانسیسیوں کو مراکش کی آزادی دینی پڑی اسی طرح انھیں بھی الجزائر کی آزادی دینی ہی پڑے گی۔ ان دنوں پولیس اور فوج کو الجزائر کے چپے چپے پر جمیلہ کی تلاش تھی، وہ اس جمیلہ کی تلاش

کے ساتھ جمیلہ بوحائرڈ کی تلاش میں بھی تھی، لیکن زیادہ تر تلاش جمیلہ بوحائرڈ کی تھی جو دن رات کا کوئی وقت بھی حصولِ آزادی کی جدوجہد میں صرف کئے بغیر بیکار نہیں جانے دے رہی تھی۔ وہ جس طرح الجزائر کے ایک حصے میں فوج کے حملے کے پروگرام کا پتہ لگانے کے بعد چل کھڑی ہوتی تھی اسی طرح وہ دوسرے بہت سے علاقوں میں جاکر پولیس اور فوج کی یورش کا جواب دے چکی تھی، وہ پولیس اور فوج کے درمیان رہ کر بھی گرفتار نہ ہو سکتی تھی۔ جس وقت وہ قومی تحریک میں شامل ہوئی تھی۔ اِس وقت تحریک کے پاس اسلحہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر خدا پر بھروسہ کر لینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ سعودی عرب اور کئی ممالک نے اسلحہ روانہ کرنا شروع کر دیا۔ اب ان کے پاس دوسرے اسلحہ کے علاوہ دستی بموں کی بھی کوئی کمی نہ تھی، جمیلہ اتنی بہادر نوجوان تھی کہ بے شمار موقعوں پر خود جاکر بم رکھ آتی تھی اور وہ بم حملہ کرنے والی فوج کو کئی مرتبہ حملہ کرنے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیتے تھے۔

مراکش اور تیونس کے امن پسند جب حکومت کی پولیس اور فوج کے ہاتھوں جان و مال کا خطرہ محسوس کرنے لگے تو انھوں نے اپنی طبیعت کے خلاف گھر میں بندوقیں اور بم رکھ لیے۔ الجزائری قومی تحریک نے بھی جب یہ دیکھا کہ حکومت فرانس کسی بھی صورت میں الجزائر کی آزادی کا خیال دلوں سے محو کر دینا چاہتی ہے اور اس مقصد کے لئے وہ بے وجہ حملوں سے بھی باز نہیں آتی۔ تو اس کا یہی ردِ عمل قدرتی ہے کہ حکومت کے نظام میں بھی گڑبڑ پیدا کی جائے چنانچہ الجزائری منظم سکیموں کو بروئے کار لاکر یہ ثابت کر دیتی رہی کہ تم روزانہ چھوڑ دن میں دس دس حملے الجزائر کے ہر حصے پر کرتے رہو مگر ہم بھی آزادی کے لئے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ چنانچہ حکومت کے دفتروں، فرانسیسی ہوٹلوں اور ریسٹورانوں پر الجزائری مجاہد جوابی حملے کرتے رہے۔ الجزائر کی خفیہ تنظیم کے کارکن الجزائر کے گوشے گوشے پر پھیلے رہے۔ جمیلہ ان سب سے زیادہ پھرتیلی، چوکس اور نڈر ثابت ہوئی۔ وہ تنظیم کے احکام اور اشارات پر بجلی کی طرح گھومتی رہی، اس کی بدولت پولیس اور فوج پر ایسی دہشت چھا گئی کہ وہ اپنی کارروائیوں میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔

کچھ عرصہ گذرا جمیلہؔ نے فوج کے پیہم حملوں کے ایسے دلخراش مناظر دیکھے تھے کہ وہ کسی وقت بھی اِن کی یاد اپنے دل سے محو نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا کہ پلاسٹک کے بموں اور مشین گنوں نے اچانک بستے گھروں کو رونے کے بھی قابل نہ چھوڑا تھا کیونکہ موت کے حملے سے کوئی بچتا تو کسی پر روتا۔ کسی گھر میں عزیز رشتہ دار بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کسی گھر میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے، کسی گھر میں کچھ ہو رہا تھا اور کسی میں کچھ۔ اِس میں شک نہیں کہ الجزائر کی سرزمین پر اس وقت قیامت ٹوٹ رہی تھی لیکن انسان کی طبعی فطرت اپنا راستہ نکالے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ خطرات میں گھری ہوئی ہونے کے باوجود اِنسانی معمولات میں فرق نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ اِس وقت کئی گھر ایسے تھے جہاں بچے کیرم بورڈ کھیل رہے تھے کئی بچے لائبریری کتب کے مطالعہ میں مستغرق تھے لیکن فرانسیسی فوج کو اِن سب اِنسانوں کے اطمینان سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ تو ایسی کارروائی کرنا چاہتی تھی جس سے الجزائری حریت پسندوں کے دل دہل جائیں اور وہ مشین گنوں، بموں اور بندوقوں کی تاب نہ لاکر اپنے اقدامات سے باز آجائیں۔ فوج نے پیہم حملوں کے بعد دیکھا کہ نعرۂ آزادی کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ فوج اپنی اِس کارگذاری پر خوشی منانے لگی کہ اس نے نعرۂ آزادی کی آوازیں سلب کردیں۔ مگر وہ بھولی ہوئی تھی۔ اِسے معلوم نہ تھا کہ جو لوگ وسیع و عریض حملوں کی وجہ سے موت کی خاموش وادی میں چلے گئے تھے وہ اپنی آوازیں کیسے نکال سکتے تھے۔ البتہ فوج کا یہ خیال غلط تھا کہ نعرۂ آزادی کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گی، اسے معلوم نہ تھا کہ جس وسیع و عریض علاقے پر حملہ کیا گیا ہے، اس سے پرے بھی جاندار بستے ہیں اور ان جانداروں میں ہر ایک مجاہد ہے۔ چنانچہ تھوڑے سے عرصہ کے بعد نعرۂ آزادی کی بلند و برتر آوازیں پھر سنائی دینے لگیں، فوج ان آوازوں کے پیچھے بھاگتی رہی اور مزید آوازیں پیدا ہوتی رہیں۔ جمیلہؔ نے مختلف حملوں میں اپنے ملک کی ماؤں بہنوں، بھائیوں، نوجوانوں بوڑھوں اور بچوں تک کے پرخچے اُڑتے دیکھے تھے۔ بھلا ایسے جانکاہ مناظر دیکھنے کے بعد اس کے سینے میں انتقام کی آگ کیوں نہ روشن ہو جاتی۔ جمیلہؔ کا سینہ تو چیر کر دیکھا

نہیں جاسکتا تھا لیکن چہرہ ضرور دیکھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا صاف دکھائی دینے لگا، اس کی گالوں کی واضح سرخی اس کے آئندہ انتقامی اقدامات کا صاف پتہ دینے لگی۔ اس کی اضطراری کیفیت اس کے عزائم کی صاف آئینہ داری کرنے لگی۔ ان دنوں اس کی یہ کیفیت تھی کہ دسترخوان پر بیٹھی ہوئی جلد جلد لقمے منہ میں ڈالنے لگ جاتی تھی۔ کسی وقت لقمے لیتے لیتے بے حس و حرکت ہو جاتی، کسی وقت گہری سوچ میں پڑ جاتی، کبھی لقمہ اٹھانے کے بعد کسی کے سوال کا تفصیلی جواب دینے لگ جاتی ——— جواب اتنا طویل ہو جاتا کہ اس کا لقمہ ہاتھ میں دس دس منٹ تک رہ جاتا۔ کبھی وہ کھڑی ہو جاتی کبھی اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیتی، کبھی گھورنے لگتی اور کبھی دیوار سے باتیں کرنے لگ جاتی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ جب تک اپنے دل کا غبار نہیں نکال لے گی تب تک معمول پر نہیں آسکے گی چنانچہ وہی ہوا کہ اس نے اپنے تصور میں حالیہ حملوں کے دلخراش مناظر کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے مشیروں سے مشورہ کے بعد جوابی حملے کا ایک عظیم الشان پروگرام مرتب کر لیا۔ موجودہ پروگرام کا مقصد براہ راست فوج پر ایسی زبردست دہشت پھیلا دینا تھا کہ اس کی سنسنی فرانس کے پایۂ تخت کو بھی متزلزل کر دے۔

جمیلہ نے سرے سے مستعد ہو کر مرتب شدہ پروگرام کے مطابق روانگی کے لئے پر تول رہی تھی کہ ایک اطلاع نے اس کے قدم روک لئے۔ وہ ڈگمگا سی گئی۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سیلاب تھا، اس سے ایک مجاہد نے آکر کہا۔

"جمیلہ! تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہزاروں مجبور انسان لقمۂ اجل بن گئے ہیں، تم نے اپنی تنظیم ہی کے بہت سے مجاہدین کو سوئے عدم رواں ہوتے دیکھا ہے۔"

جمیلہ نے اسے آگے بات ذکر نے دی اور یہ سمجھ کر کہ اس کا مخاطب کارکن اسے بہت بڑے حادثے کی خبر دینے کے لئے اس کے حوصلے پر آہستہ آہستہ بوجھ ڈالنا چاہتا ہے، اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ چونک اٹھی "تم کیا کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو، بن باالله سلامت ہیں، ابن خدہ کا تو بال بیکا نہیں ہوا کہو جواب دو۔"

جمیلہ کے چونکنے پر مخاطب کارکن خوف زدہ سا ہو گیا لیکن اس نے زبان کا تیر چھوڑ دیا۔ "تمہارے چچا کو حکومت نے قتل کرا دیا ہے۔"

جمیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ماتھے پر زور سے ہاتھ مار کر چلائی "میرے چچا ایک لحاظ سے بن باللہ اور بن۔ خذہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں ان کا احسان مرتے دم تک نہیں بھول سکتی۔ میں آج جس مبارک مشن پر مستعد دکھائی دے رہی ہوں اس پر پہنچانے والے میرے وہی چچا تھے جنہوں نے مجھ سے جدا ہو کر میری کمر توڑ دی ہے۔ اگر وہ مجھے قومی محاذ آزادی سے روشناس نہ کراتے تو آج میں اپنے قومی فرض کو فراموش کئے ہوئے ہوتی۔"

وہ آخری الفاظ بہت مشکل سے ادا کر سکی، رقت کی وجہ سے اس کی آواز بھرا گئی جو بعد میں چیختے ہوئے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئی۔ آنسو اگرچہ خاموش ہوتے ہیں اور اس کے آنسو بھی خاموش تھے مگر ان کی جانکاہ خاموشی دل و دماغ کو اپنی چیخیں سنا رہی تھی۔

کئی منٹ کے سیلاب بلا کے بعد وہ آنسو خشک کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "آج میں اپنے چچا کی موت پر رو رہی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ اس پر اور مجھ پر بہت ظلم ہوا ہے لیکن مجھ خود غرض کو یہ یاد نہیں رہا کہ سینکڑوں اور ہزاروں گھر کئی چچاؤں کئی ماموؤں کئی بھتیجوں بھتیجیوں کئی بھانجوں بھانجیوں اور کئی معصوموں سے خالی ہو کر سنسان ہو گئے ہیں اور ان کی جدائی میں آنسو بہانے والے شہید فرانسیسی بموں سے التجا کر رہے ہیں کہ وہ اپنی کارگزاری کرا دھورا نہ چھوڑیں بلکہ پسماندگان کو بھی لقمۂ اجل بنا ڈالیں۔"

جمیلہ کے آنسو ابھی تک خشک نہ ہوئے تھے وہ کھڑی کھڑی پھر بیٹھ گئی "اسے کہتے ہیں ایمان کی کمزوری، میں اپنے چچا کی محبت میں اپنے قومی فرض سے دور ہٹی جا رہی ہوں مجھے اس کی سزا ملنی چاہیئے" اس نے اپنا ہاتھ وحشت میں دیوار کے ساتھ جھٹک دیا "ہاتھ سے خون بہ نکلا"۔ مگر اس نے کچھ محسوس نہ کیا۔ اب مجھے نصیحت آ گئی ہو گئی۔ اب مجھے فوج کے مقابل ڈٹ جانا چاہیے۔ اب مجھے اس کے سامنے ہو کر یہ کہنا چاہیئے کہ تم میرے چچا کی پیٹھ میں تو چھرا گھونپ کر اپنی نامردی کا ثابت دے سکتے ہو لیکن

میرے سینے میں گولی نہیں مار سکتے۔ جرأت کر کے دکھاؤ، میرے سینے میں آزادی کی سچی تڑپ موجود ہے۔ میرے دل کی گھڑی اپنی ٹک ٹک کی آواز سے تمہاری حکومت کے لمحات شمار کر رہی ہے۔ میں ایک معمولی لڑکی ہوں لیکن میرا دل تمہاری سنگینوں سے زیادہ مضبوط ہے آؤ مجھے قتل کرنے کی ہمت ہے تو آگے بڑھو مجھے قتل کر کے دکھاؤ۔ ساری الجزائری قوم پلاسٹک کے بموں میں تبدیل ہو جائے گی یہ بم تمہاری ساری آبادی کو خاکستر بنا دے گی ——— میں یہ کیا باتیں بنا رہی ہوں، قدم کیوں نہیں اٹھاتی؟"

جمیلہ آخری الفاظ کے بعد تیزی کے ساتھ نکل بھاگی۔ تنظیم کے کارکن کہنے لگے "یہ جری اور نڈر لڑکی آج قیامت صغریٰ کا نقشہ پیدا کرنے والی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھئے قدرت کو کیا منظور ہے۔ آج اس کے عزائم توپوں کے گولوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔"

۱۷

عقیل کو زبیدہ کی مہربانیوں سے اِس قدر لطف نہیں آیا تھا جس قدر اس کی شدید قسم کی خفگی سے آیا۔ جس وقت وہ "محبت" والا کاغذ پرزے پرزے کر کے کمرے سے نکل بھاگی تو عقیل کا قہقہہ نکل گیا۔ اِس قہقہے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ زبیدہ نے غصّے میں آ کر حلف اٹھا لیا کہ وہ آئندہ سے عقیل کو اپنا دشمن سمجھے گی اور اس کی خدمت سے یک لخت کنارا کرے گی۔ اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے دوسرے دن سے سکول جانا شروع کر دیا۔ اس کے اس اچانک ارادے پر بھی نے تعجب کا اظہار کیا لیکن اس نے بڑی چابکدستی سے سب کو یقین دلا دیا کہ وہ مہمانوں کی خدمت سے گریزاں نہیں بلکہ کرامت بھائی اور عزیزہ بہن کے آجانے سے اپنی تعلیم پورا کرنے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔

زبیدہ سکول حاضر ہونے کو تو ہو گئی لیکن اسے سکول کا ماحول کاٹنے لگا، تصور کے تیز

احساس نے سکول کے ماحول کو گھر کی چار دیواری میں بدل دیا اسے اساتذہ کا استقبال محبت یہ مفہوم سمجھانے لگا کہ جیسے قدرت نے عقیل کا بازو کسی دوسری لڑکی کے ہاتھ میں تھما کر اس کو سمجھا دیا ہے کہ اب تو تعلیم میں ہی دل بہلا - اِسے بلیک بورڈ پر عقیل کی تصویر نظر آنے لگی - اسے اپنی تمام ہم جماعتوں کے چہروں میں عقیل کا قہقہہ زن چہرہ نظر آنے لگا - ہم جماعت لڑکیاں اور لڑکے حیران تھے کہ جس لڑکی نے صرف کچھ دن میں اساتذہ اور طلبا کے دلوں پر ہر دلعزیزی کا سکہ بٹھا لیا تھا وہ آج اس قدر منقلب کیوں ہو گئی ہے - ایک استاد جو فرانسیسی سکول سے استعفاد دینے کے بعد ادارۂ عالیہ میں آ گئے تھے اور جو زبیدہ کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے ، وقفے کے دوران راستے میں زبیدہ کو بلا کر پوچھنے لگے - "بیٹی کیا سبب ہے کہ تم آج زبیدہ معلوم نہیں ہو رہیں ـــ خیریت تو ہے -"

اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا - "میرا ایک عزیز فرانسیسی حملے میں زخمی ہو گیا تھا اسے ابھی تک پوری طرح افاقہ نہیں ہوا اس لیئے خاموش ہوں -"

استاد نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا "خدا تمہارے عزیز کو کلی آرام بخشے ، میں کبھی تمہارے گھر آؤں گا -"

یہ کہہ کر استاد آگے نکل گیا مگر زبیدہ اپنے آپ سے یوں کہتی ہوئی اپنی ایسی دنیا میں کھوئی رہ گئی جو سکول کی چار دیواری سے تعلق نہیں رکھتی تھی "میری بے سمجھی ملاحظہ ہو کہ ایک تو عقیل سے قطع تعلق کیے بیٹھی ہوں دوسرے اپنی خاموشی کی وجہ بتانے کے لیئے اس کا نام استعمال کر رہی ہوں ..... تف ہے مجھ پر"

اس نے اِس تصور سے اپنے آپ کو نکالنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ ناکام رہی - "میں بھی کیسی پگلی ہوں کہ اس بے مروت کو خواہ مخواہ اِس قابل سمجھ رہی ہوں کہ اس کی وجہ سے اپنے اوپر خاموشی طاری کر رکھی ہے ، بھلا مجھے ایسے آدمی سے کیا واسطہ جو میری لازوال محبت کو یوں ٹھکرا دے جیسے اِس کا مجھ سے پہلے واسطہ ہی نہ تھا ..... لیکن واقعی مجھے کیوں کر اندازہ ہوا کہ اسے مجھ سے

واسطہ تھا۔ کیا معلوم وہ ایک ہی سے محبت کرتا ہو اور میں اس کی غاصب ثابت ہو رہی ہوں جبھی تو اس نے کاغذ کے پرزے ہوتے دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا ——— لیکن وہ اتنا شریف تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ میری محبت کا مذاق نہیں اڑا سکتا ——— پھر وہ قہقہہ زن کیوں ہوا ——— خدا جانے کیا بات ہے ——— مجھے اب واقعی اپنی تعلیم کی طرف راغب ہونا چاہئے ——— مگر کیا کروں میری طبیعت اچاٹ ہو گئی ہے ——— بار بار وہی بے وفا یاد آرہا ہے، ہائے اللہ میں اسے تصور سے کیسے نکالوں"

تفریح کا وقفہ ختم ہوا تو زبیدہ اپنے چہرے پر مصنوعی تبسم بکھیر کر اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ استاد نے جغرافیہ پڑھانا شروع کیا۔ ابھی چار ہی صفحے پڑھائے تھے کہ اس نے زبیدہ پر ایک معمولی سا سوال کر دیا۔ زبیدہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "آج میری طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے مجھے آپ کے پڑھائے ہوئے سبق کا کوئی حصہ بھی یاد نہیں۔ میں معذرت چاہتی ہوں"۔

"اس کا سبب؟"

استاد نے پوچھا اور زبیدہ نے کہا "قدوس صاحب سے دریافت کر لیجئے گا"۔ قدوس اس کے عربی کے استاد تھے جن کو اس نے اپنے عزیز کے زخمی ہونے کا واقعہ بتایا تھا۔

استاد زبیدہ کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے "مگر بیٹی! تمہیں اس وقت تک سکول میں نہیں آنا چاہئے جب تک تمہیں اپنے سبق پر توجہ دینے کا ہوش نہ ہو"۔

"مگر ماسٹر صاحب" زبیدہ نے کہا "میں آج دل بہلانے آگئی تھی۔ لیکن کل سے انشاء اللہ زیادہ توجہ دینے کے قابل ہو سکوں گی"۔

استاد نے زیادہ بات نہ کی، خاموش ہو گئے اور پھر پہلے والا سوال انہوں نے کسی دوسرے طالب علم پر کر دیا۔

اسی وقت تصور میں عقیل آگیا جو زبیدہ سے کہنے لگا "دیکھا میرا نام لئے بغیر تمہیں چین کہاں آئے گا"۔

زبیدہ کو خیال آیا کہ اگر وہ سکول بند ہونے کے وقت گھر گئی تو اس کے ہم جماعت اس پر سوالات

کی بوچھاڑ کر دیں گے کہ "تمہاری پریشانی کا سبب کیا ہے۔" اور پھر اسے سبب بتانے کے لئے بے وفا کا ذکر کرنا پڑے گا۔ اِس لئے وہ اسی وقت اپنی جگہ سے اٹھی اور استاد سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر آگئی ——

گھر آئی تو سب نے پوچھا "تم جلد آگئیں، کیا وجہ ہے؟"

اب کے بھی اس کی زبان سے نکل گیا "طبیعت خراب ہوگئی تھی۔"

عقیل کے پاس اس کی بہن عزیزہ بیٹھی تھی، عقیل نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبیدہ آئی ہے"

عزیزہ نے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "نیت تو خراب نہیں ہوگئی؟"

عقیل نے مسکرا کر جواب دیا "نیت خراب نہیں طبیعت خراب ہے۔"

عزیزہ نے کہا "معلوم ہوتا ہے، دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔" میں نے سنا ہے وہ اپنی والدہ کو اپنی ناسازیٔ طبع کی خبر دے رہی تھی —— ادھر آپ بھی طبیعت کی خرابی کا ذکر کر رہے ہیں خدا خیر کرے۔"

عقیل نے بہن سے کہا "اگر میں اٹھ سکتا تو تمہاری وہ مرمت کرتا کہ آئندہ ایسی واہیات باتیں نہ کرتیں۔ اچھا ذرا بلا کر تو دیکھو زبیدہ کو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اِس کمرے میں کبھی نہ آئے گی۔"

عزیزہ نے ایک بلے اور بھائی کی آنکھوں میں ٹکٹکی لگانے کے بعد کہا "کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے —— لو میں زبیدہ کو بلاتی ہوں۔"

"زبیدہ ذرا ادھر آنا، بھائی جان بلا رہے ہیں۔"

زبیدہ نے وہیں سے جواب دیا "عزیزہ بہن میری طبیعت ٹھیک نہیں" یہ فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں چارپائی پر لیٹ گئی تاکہ بہانہ پورا ہو سکے۔

عزیزہ نے کہا "بھائی جان! ذرا میں آپ پر احسان کر آؤں۔"

"کیا مطلب؟" عقیل نے پوچھا

"یہی کہ زبیدہ کا حال معلوم کر آؤں" ۔ عزیزہ یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پڑی تو عقیل نے کہا" ذرا میری طرف سے بھی پوچھ لینا ۔ تمہیں ثواب ہو گا ۔"

عزیزہ نے ہنستے ہوئے کہا" بہت خوب تو یہ بات ہے" ۔ عزیزہ زبیدہ کے کمرے میں گئی تو زبیدہ لیٹی ہوئی تھی ۔ عزیزہ نے نبض دیکھی" بخار تو معلوم نہیں ہوتا، تکان ہوگی"

"کیسی تکان" زبیدہ نے فوراً پوچھا ۔

اور عزیزہ کو بھی خوب سوجھی" یہی بھائی جان کی ان تھک خدمت کی تکان"

زبیدہ جھینپ سی گئی اور دل میں غصہ بھی آگیا ۔" نہیں بہن خدمت سے کون تھکتا ہے"

عزیزہ نے کہا" تب ہی تو بھائی جان کہہ رہے تھے کہ زبیدہ بڑی ان تھک لڑکی ہے ۔ ہاں پہ سچ وہ آپ کا حال پوچھتے تھے"

زبیدہ نے کہا" کہہ دیجئے گا بس یونہی تکان سی ہے تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی"

اتنے میں زبیدہ کی والدہ اور کرامت آ گئے ۔

"کہو بہن خیریت تو ہے"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی" بس تکان سی ہے دور ہو جائے گی"

والدہ نبض دیکھ کر بولیں" شکر ہے خدایا، میری بیٹی چہچہاتی رہے تو اچھی لگتی ہے"

زبیدہ نے دل میں کہا" اب یہ چہچہا چکی، اس کے چہکنے کے دن بیت گئے"

کرامت نے کہا" زبیدہ تم لیٹ جاؤ عزیزہ تمہارا بدن داب دیتی ہے"

زبیدہ نے کہا" نہیں اس کی ضرورت نہیں، کچھ مجھے تکلیف ہو تو بدن دبواؤں —— میں تو بالکل ٹھیک ہوں، بس یونہی تکان سی ہے، سونے کی کوشش کرتی ہوں، نیند آ گئی تو تکان بھی دور ہو جائے گی"

کرامت عزیزہ اور والدہ اٹھ کر عقیل کے کمرے کو چل دیئے" ہاں تم اب سونے کی کوشش کرو" اور زبیدہ نے دل میں کہا" نیند کسے آتی ہے" اس نے جھوٹ موٹ آنکھیں بند

کریں، گویا نیند آگئی ہے حالانکہ وہ عقیل کے ظالم تصوّر کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

تصوّر میں اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ گھر کے ماحول میں اس کی قطع تعلق کی قسم تو پوری ہونے سے رہی، اس لئے وہ اب کیا کرے۔ قسم پوری کرنا چاہیے تو وہ ممکن نہیں اور قسم توڑے تو اس کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے ـــــ اسے مشورے کی طلب ہوئی۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے باپ سے مشورہ کرے گی، چنانچہ وہ اپنے باپ کی راہ دیکھنے لگی، اس نے اپنے آپ سے کہا کہ "جب ابا جان! آجائیں تو آنکھیں کھول لینا، گویا تم نیند پوری کر کے تکان دور کر چکی ہو، پھر تم ابا جان کے ساتھ کافی پینا تاکہ رہی سہی کسر جاتی رہے ـــــ" مگر یہ کیا ابا جان تو عقیل کے پاس کافی پیا کرتے تھے۔ "میں ان سے مشورہ نہیں کروں گی۔" زبیدہ اب سچ مچ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

۱۸

الجزائر کے یورپی آباد کار اور فرانسیسی باشندے الجزائری مجاہدین کی نمایاں سرگرمیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے، وہ تین باتوں کے سبب حیران تھے۔ ایک اس بات سے کہ مجاہدین حکومت کا مقابلہ کرتے وقت برابر کی چوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔ دوسرے اس بات سے کہ ان کا زور حملہ ہو جانے کے بعد اور بڑھ جاتا ہے۔ تیسرے اس بات سے کہ عام طور پر امن پسند یورپی آباد کار اور فرانسیسی ان کے جوابی حملے کا شکار نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے کتنے ہی یورپی آباد کار اور فرانسیسی باشندے الجزائری مجاہدین کی جانیں تلف کرنے کے موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔

بہار اپنے شباب پر تھی، موسم کی لطافت اور شگفتگی سبزہ زاروں کو پھلواریوں میں تبدیل کر رہی تھی ہواؤں میں خمار تھا، اگرچہ ان دنوں الجزائری باشندے سخت امتحان میں مبتلا تھے لیکن ہواؤں کے لطیف جھونکے آنکھوں کو طراوت پہنچانے کے ساتھ ہی دلوں کو سدا بہاریت کے جاں فزا پیغام برابر

دے رہے تھے۔ اپریل کی جس خوشگوار صبح کی بوجھل ہوائیں کلیوں کو غنچوں میں اور غنچوں کو معصوم پھولوں میں تبدیل کر رہی تھیں، اسی صبح الجزائری مجاہدین خفیہ طور پر الجزائر کے فوجی علاقہ قصبی میں فوجی طاقت کو ہمیشہ کی نیند سلا دینے کی کارروائی میں مگن تھے۔ صبح کے خوش گوار جھونکے ان کے کانوں کو خوشگوار پیغام دیتے تو وہ جواب میں کہہ دیتے کہ اس کا ابھی موقع نہیں۔ صبح کے جھٹپٹے میں کئی سائے ابھرے اور دیواروں میں گم ہو گئے۔ اس وقت فرانسیسی فوج کے گشتی دستے اپنے علاقے کی حفاظت کیلئے حرکت کر رہے تھے۔ اس دستے کی نظر اچانک ایک متحرک سایہ پر پڑی۔ وہ یہی سمجھے کہ یہ سایہ جاسوسی کرنے آیا ہوگا۔ دستہ اس سائے کے تعاقب میں بڑھا، سایہ چابک دستی سے ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ فوجی دستے نے فوراً گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، سپاہی گلی میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے زمین پر ایک نوجوان لڑکی تڑپ رہی تھی۔ اس کے کندھے پر ایک گولی لگی تھی جس سے وہ خون میں لت پت ہو رہی تھی۔ اس کے پاس ایک محفوظ فائیل تھی جسے ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا۔

"تم کون ہو"

"ایک انسان"

"تمہارا نام کیا ہے"

"جمیلہ" جمیلہ نے اپنا نام خوف زدہ ہو کر نہیں بلکہ بے خوف ہو کر نام بتایا تھا اس لئے دیا کہ اب وہ گرفتار ہو چکی تھی اور ایسے موقع پر نام کا اخفا مناسب بھی نہ تھا اور جرأت کے بھی خلاف۔ وہ اب سیدھی کھڑی تھی، اس کے شانے کا خون اس کے چہرے پر اس کے بالوں میں اور اس کے کپڑوں پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اسی حالت میں گرفتار کر لیا گیا اور ہسپتال پہنچانے سے پہلے اس کی مرہم پٹی کا انتظام کرنے کے بجائے اس پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ آخر جب وہ ہسپتال پہنچ کر اپریشن کی میز پر لیٹی تو فوج نے بھی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ جمیلہ نے اس موقع پر ہنس کر جواب دیا "آپ لوگ مطمئن رہیں۔ میں مرتی نہیں اپریشن سے فارغ ہو کر بیانات دے دوں گی" لیکن فوج نے اس جواب کی ذرا پروا نہ کی اور اپنی

پوچھ گچھ جاری رکھی۔

"مس جمیلہ! قصبے کا فوجی دستہ اپنے اس کارنامے پر بہت فخر کر رہا ہے کہ تم جیسی چالاک لڑکی کو گرفتار کر لیا ہے۔"

جمیلہ نے کہا "ہمارے ہاں چالاک کو ہوشیار کا نام دیتے ہیں۔"

ایک سپاہی نے کہا "مگر تمہاری کارگذاری سے ہوشیاری ثابت نہیں ہوتی چالاکی ثابت ہوتی ہے۔"

جمیلہ نے مسکراتے ہوئے فوراً کہا "چالاک ہوں یا ہوشیار میں آپ لوگوں کے لئے ایک آئینہ ضرور ہوں جس میں آپ لوگ اپنی صورتیں دیکھ سکتے ہیں۔"

دوسرے سپاہی کو یہ بات بُری لگی "معلوم ہوتا ہے تم اپنے انجام سے بے خبر ہو۔ ورنہ اس قسم کا جملہ استعمال کرنے کی جرأت نہ کرتیں۔"

جمیلہ کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا "میں نے جس روز روشن میں میدان سیاست میں قدم رکھا تھا اسی روز میرا انجام میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اب بھی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے موت کی سزا مل سکتی ہے۔ اور وہ مجھے منظور ہے۔"

سپاہی اس جواب کی توقع نہ رکھتے تھے، وہ اتنا ہی کہہ کر اکتفا کر گئے کہ "دیکھا جائے گا۔"

دوسرا سپاہی کہنے لگا "اچھا مس جمیلہ میں تم سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

جمیلہ نے کہا "آپ اپنے سوالات کے جواب اطمینان بخش صورت میں چاہتے ہیں یا بے اطمینانی میں۔"

اس نے کہا "اطمینان بخش صورت میں۔"

"تو پھر" اس نے کہا "مجھے اپریشن کے مرحلے سے گذر لینے دیجئے اس کے بعد آپ کو مطمئن کر دوں گی۔"

ایک سپاہی کہنے لگا "اچھا اتنا بتا دیجے کہ آپ کا پورا نام جمیلہ بوحائرڈ ہے نا؟"

جمیلہ نے ذرا خفگی میں کہا "ہاں میرا یہی نام ہے، میں ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہوں میرے مزید چار بہن بھائی ہیں۔"

یہ الفاظ اس نے ختم ہی کئے تھے کہ اس کا سٹریچر اپریشن روم میں لے جایا گیا جہاں اس کا اپریشن کر دیا گیا۔

اپریشن سے پہلے جمیلہ کو بے ہوش کیا گیا اور پھر اپریشن کر لینے کے بعد اس کے ہوش میں آنے کا شدت سے انتظار ہونے لگا۔ یہ انتظار حریص فرانسیسی سپاہیوں کو تھا، آخر جب جمیلہ ہوش میں آئی تو اس کا حال پوچھنے سے پہلے یہ سوال پوچھا گیا۔

"اچھا مس جمیلہ کیا آپ کا تعلق مجاہدین کی خفیہ تنظیم سے تھا؟"

جمیلہ نے ہنس کر کہا "ظاہر ہے، میرے ان دستاویزی کاغذات سے صاف ظاہر ہے کہ کہ میرا اس تنظیم سے زبردست تعلق ہے۔"

"آپ کے ذمہ تنظیم کی طرف سے کیا کام تھا" سپاہی نے پوچھا۔

"میرے ذمے بہت اہم کام تھا" جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔

"مثلاً"

"مثلاً یہ کہ میں الجزیرہ میں مسلمان قوم پرستوں کے خفیہ رابطے قائم کرنے کی ذمہ دار تھی۔"

"مسلمان قوم پرستوں کے نام بتاؤ" ایک سپاہی نے کہا۔

جمیلہ نے جھٹ جواب دیا "میں یہ نہیں کر سکتی، میرا یہ فعل اپنی جماعت سے غداری کی دلیل ثابت ہوگا۔"

سپاہی نے کہا "لیکن اگر فوج آپ کی زبان کو مجبور کر دے تو پھر؟"

"ایسا ناممکن ہے" جمیلہ کے چہرے پر عزم کے آثار پیدا ہو گئے۔ "اگر آپ لوگ میرے پاؤں کاٹنے کے بعد زبان کے علاوہ ہر عضو کاٹنا شروع کر دیں تو جب تک زبان نہیں کٹ جائے گی

آپ کے کان اپنے اس سوال پر انکار ہی کے الفاظ سنتے چلے جائیں گے۔"

ایک خاموش سپاہی نے زبان کھولی "لیکن جمیلہ یہ ساری باتیں کہنے کی ہوتی ہیں، عمل میں اکثر دوسری صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا ہمیں بہت تجربہ ہے۔"

جمیلہ نے کہا: "میں آپ لوگوں کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا تجربہ نیا تجربہ ثابت ہوگا، نہایت دلچسپ نہایت جرأت آموز اور نہایت جانکاہ"۔

پہلا سپاہی بولا "خیر دیکھا جائے گا، تمہیں نئے تجربے کے لگانے کے لئے ضروری ہے کہ تمہارے پہلے زخم اچھے ہو جائیں اور اس کا ہم شدت سے انتظار کریں گے۔"

جمیلہ نے طنزاً کہا۔ "عربی میں انتظار کی شدت کو "الانتظار اشد من الموت" کہتے ہیں۔

سپاہی یہ کہہ کر خفگی میں اٹھ کھڑے ہو گئے۔ "ہم عربی زبان سننا گوارا نہیں کر سکتے"

جمیلہ کے اچھا ہونے میں کئی دن لگے اور پھر جب وہ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو اس پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"مس جمیلہ تم نے تو نہیں بتایا لیکن تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ہم بتائے دیتے ہیں کہ تمہاری خفیہ تنظیم کا ایک لیڈر یوسف سعدی بھی ہے۔"

جمیلہ نے کہا "یہ معلومات میرے لئے نئی نہیں، واقعی یوسف سعدی بہت اہم شخصیت ہے"

سپاہی نے کہا "اس کا پتہ درکار ہے۔"

جمیلہ نے فوراً جواب دیا "مگر مجھے اس کا پتہ بتانے سے صاف انکار ہے۔"

سپاہی آگ بگولا ہو گیا "تمہیں اس کا پتہ بتانا ہی ہوگا۔"

جمیلہ نے بھی سیخ پا ہو کر کہا "ہرگز نہیں"

"کیا "ہرگز نہیں" کا انجام معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم ہے زیادہ سے زیادہ موت۔"

"تم اسے برداشت نہ کر سکو گی۔"

"آزمائش شرط ہے"۔

اب جمیلہ کی آزمائش شروع ہو گئی۔ اسے زبردستی پوری طرح برہنہ کر دیا گیا اور پھر اسے ایک بنچ کے ساتھ بھیگے ہوئے کپڑے سے باندھ دیا گیا۔ اب اس سے پھر سوال کیا گیا۔ "کیا تم یوسف سعدی کا پتہ نہیں بتاؤ گی؟"

اس نے اپنی پوری آواز کے ساتھ جواب دیا۔ "ہرگز نہیں، تہذیب و اخلاق کا خون کرنے والو! ہرگز نہیں"۔

اب فوج نے بجلی کے تار کا اس کے برہنہ جسم کے ساتھ تعلق قائم کیا اور اس کی مدد سے اس کے مختلف اعضا مثلاً منہ، کان، چھاتی، زبان اور ہتھیلیوں پر بجلی کے کرنٹ لگائے۔ اس کارروائی کے ردِ عمل کی کیفیت کو چند سپاہی ایک کاغذ پر رقم کرتے رہے۔ بجلی کے جھٹکوں کا یہ عمل آٹھ روز تک رہا اور آٹھوں روز وہ رات گئے تک بیہوش ہو جاتی رہی۔ بیہوشی سے پہلے پہلے اس کے منہ سے اتنی بلند چیخیں نکلتی رہیں کہ معلوم ہوتا تھا وہ اب یوسف سعدی کا پتہ ضرور بتا دے گی۔ لیکن جب بھی کسی وقت بجلی کا تعلق ہٹانے کے بعد پتہ دریافت کیا جاتا تو وہ پہلے سے زیادہ عزم و استقلال کا ثبوت دیتی اور کہتی "یہ بات ذہن نشین کر لو کہ میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں مگر یوسف سعدی کا پتہ نہیں بتا سکتی"۔

جمیلہ کے اس جواب پر فوجی اور زیادہ برافروختہ ہو جاتے اور اسے غلیظ گالیاں دیتے ہوئے شرمناک سزائیں دینا شروع کر دیتے۔ تھپڑ رسید کرتے، لاتیں مارتے، ہنٹریوں کی ضربوں سے ننگے بدن کو سخت ترین ایذا پہنچاتے مگر وہ اپنی زبان سے یہی لفظ کہتی نظر آتی کہ "یوسف سعدی کا پتہ میری زبان سے معلوم نہیں کیا جا سکتا"۔

آٹھ دس روز بعد چند نئے فوجی تھانے میں داخل ہوئے اور پوچھا "جمیلہ نے کتنے باغیوں کا پتہ بتلایا ہے؟"

تھانیدار جس کے ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی، فرش پر پھینکتے ہوئے بولا "ایک کا بھی پتہ نہیں بتایا۔ یوسف سعدی کا بھی نہیں"۔

فوجی بولا " معلوم ہوتا ہے، آپ نے اسے ایذا نہیں دی جس کے جواب میں اس کی زبان ایک ایک باغی کا نام اور پتہ اگلنے لگے جاتی "

تھانے دار کے پاس کھڑے ایک سپاہی نے کہا " ہم سے تو یہ ہو نہیں سکا تم کر کے دیکھو — البتہ ہم صرف ایک بات میں کامیاب ہو سکتے ہیں " — یہ کہہ کر اس نے کمر سے پستول نکالی۔

فوجی نے جواب دیا " کسی کو گولی مار دینا تو کوئی کارنامہ نہیں۔ کارنامہ تو جتیے جی ناقابل برداشت عقوبتیں پہنچانا ہے۔ لیجیے اگر آپ اس کی زبان سے باغیوں کے نام نہیں اگلوا سکتے تو میں اگلوا کر دکھاتا ہوں "

تھانے دار اپنے ماتحت سپاہیوں کی موجودگی میں بولا " اگر آپ اس میں کامیاب ہو سکیں تو میری طرف سے ذاتی طور پر ایک بہت بڑی پارٹی حاصل کریں گے "

فوجی نے کہا " مگر میں حیران ہوں کہ عورت ذات تو بہت کمزور ہوتی ہے، اس کی کمزوری سے طرح طرح کے فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں "

تھانے دار نے کہا " اچھا تو پھر آپ ہی فائدہ اٹھا کر دیکھئے "

فوجی جمیلہ کے پاس آیا اور بہت نرمی سے کہنے لگا۔

" مس جمیلہ! میں تمہارا بہت ہمدرد ہوں میں نہیں چاہتا کہ تمہیں مزید سزائیں ملیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ آخر کار تمہاری خفیہ تنظیم کے تمام لیڈر گرفتار ہو جائیں گے، اگر تم آج ان کے پتے بتا دو، تو میں تمہیں تمہاری جلد از جلد رہائی کا انتظام کرانے کا شریفانہ وعدہ کرتا ہوں "

جمیلہ نے برس کر کہا " تم لوگ وعدہ ایفا کرنا نہیں جانتے اور پھر مجھے اپنی رہائی کی چنداں ضرورت بھی نہیں، ضرورت ہے، تو صرف آزادی کی "

جمیلہ کے جواب پر فوجی مصلحت کے طور پر بھی توقف نہ کر سکا، کرسی سے اٹھ کر یہ کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں آگیا " بہت اچھا تمہاری مرضی "

دوسرے کمرے میں آیا تو تھانے دار نے پوچھا " کہئے کامیاب ہوئے یا نہیں؟ "

فوجی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا "میں اپنے کام کا آغاز کرنے والا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ پھر جمیلہ کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں وہ برہنہ بندھی پڑی تھی، فوجی نے اپنے جلتے ہوئے سگریٹ کو اس کے جسم کے بہت سے حصوں سے لگانا شروع کیا، وہ ہائے ہائے کراٹھتی مگر کسی رہنما کا پتہ نہ بتاتی۔ فوجی سگریٹ کا ایک کش لیتا اور ایک بار جلا ہوا حصہ اس کے جسم کے کسی حصے سے لگاتا، اس نے کتنے ہی سگریٹ پیئے اور اسی کے جسم کے بہت سے حصوں کو مس کیا، پھر دوسری شرارت جو سوجھی تو دیا سلائیاں جلا کر جسم کے مختلف حصوں پر لگاتا رہا۔ تھپڑوں، ڈنڈوں، ہنٹروں کے علاوہ بجلی کے مسلسل جھٹکوں سے پہلے ہی سارا جسم داغدار ہو گیا تھا، اب رہی سہی کسر جلتے ہوئے سگرٹوں اور دیا سلائیوں نے پوری کر دی

فوجی نے پیٹھ پر سگریٹ لگائے تو اس کی چیخ نہ نکلی اس نے پوچھا "مس جمیلہ تم تو بہت بہادر نکلیں، اب تو تم چیختیں ہی نہیں"۔

جمیلہ نے کہا۔ "شکر ہے کہ میں عادی ہوتی جا رہی ہوں"۔

فوجی نے کہا۔ "اچھا تو کیا تم یوسف سعدی کا پتہ نہیں بتاؤ گی؟" فوجی اچانک سخت غصّے میں آگیا۔

"نہیں ہرگز نہیں"۔ اس نے چیخ کر دو ٹوک جواب دیا۔

اس پر فوجی نے زناٹے کا تھپڑ رسید کیا جس سے جمیلہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ لیکن اس کی بے ہوشی کی ذرا پروا نہ کی گئی۔ فوجی ہار کر جب تھانے دار کے پاس گیا تو اس نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ اس پر تھانے دار نے قہقہہ زن ہو کر کہا "اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ میں آج کامیاب نہیں ہوا تو اس کا میں نے اعتراف کر لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد چند روز میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا"۔

فوجی نے کہا "لیجئے صاحب! اب میرا دعویٰ یہ ہے کہ آپ اس عورت سے کچھ بھی معلومات لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مجھے اس پر غصہ آنے کی بجائے رشک آرہا ہے، یہ تو ایک چٹان ہے چٹان"۔

تھانے دار نے پورا سگریٹ جس کا اس نے ایک ہی کش لگایا تھا، غصے میں پھینک کر اور اپنے پاؤں تلے روند کر کہا" اچھا تو پھر آپ بھی کچھ روز میں یہ سن لیں گے کہ یہ چٹان ہماری ضربوں سے ٹوٹ چکی ہے۔

"ایسا ہوا تو میں استعفا دے دوں گا" فوجی سٹر طبیش کر کے تھانے سے باہر نکل گیا۔"

۱۹

جس روز جمیلہ گرفتار ہوئی تھی، اس روز سے اب تک سارے الجزائر میں ایک شور مچ گیا تھا۔ خفیہ تنظیم کے لیڈر اور کارکن اگرچہ جمیلہ کی گرفتاری سے دل گرفتہ تھے لیکن اس کے اُس کیریکٹر پہ فخر یا ناز کا اظہار بھی کرتے تھے کہ وہ کس قدر بااعتماد اور بات کی پکی ثابت ہو رہی ہے۔ اخبارات میں جمیلہ کے خیالات کی تفصیل شائع ہو رہی تھی جس کے باعث الجزائر کے ایک ایک شہر، ایک ایک گاؤں اور ایک ایک گھر میں اسی کا تذکرہ جاری تھا۔

عقیل نے جب پہلے روز اس کی گرفتاری کی خبر پڑھی تو اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا، کرامت سے کہنے لگا۔ "اگر میں اس طرح مجبور نہ ہوتا تو آج جمیلہ کی گرفتاری کا بدلہ لینے کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوتا۔"

زبیدہ جو عقیل سے خفا تھی جمیلہ کی گرفتاری کی خبر پڑھنے کے بعد ساری خفگی بھول گئی اور عقیل

کے کمرے میں بیٹھ کر سیاسیات کو زیر بحث لانے لگی۔

زبیدہ کے والدین اگرچہ عقیل کے صاحب فراش ہونے سے خوش نہیں تھے لیکن قدرت کے اس بہانے پر حیران دششدر تھے کہ اس کی بیماری سے زبیدہ کے عملی طور پر سیاسیات میں حصہ نہ لینے کا کیسا موقع پیدا ہو گیا ہے۔ درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ عقیل کی اصل کی خیر ہو لیکن وہ اپنی چارپائی سے جلد نہ اٹھ سکے، اگر اٹھ گیا تو زبیدہ کی توجہ عملی سیاسیات کی طرف مبذول ہو جائے۔

زبیدہ نے کرامت کو مخاطب کر کے کہا "بھائی صاحب! میں آپ پر اپنا وہ اضطراب ظاہر نہیں کر سکتی جو جمیلہ کی گرفتاری پر میرے دل میں برپا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی طرح ——— مگر میں کیا کر سکتی ہوں"

کرامت نے کہا "زبیدہ بہن! آپ تو پڑھی لکھی خاتون ہیں، اس میں شک نہیں کہ حکومت فرانس کے مظالم کی کہانیاں سن سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے لیکن خواہ مخواہ جانیں ضائع کرنے کا بھی تو کوئی فائدہ نہیں ہے"

زبیدہ نے کہا "بھائی صاحب! میرا مطلب یہ ہے کہ جمیلہ بوحائرڈ نے اپنے کارنامے کی مثال پیش کر کے اہل ایمان کو عمل کی بہت بڑی ترغیب دی ہے۔ بہت بڑا سبق دیا ہے۔ اس کے عمل نے مجھ جیسی طالبہ کو پکارا ہے۔ اس وقت وہ یہ کہہ رہی ہو گی "جب کہ میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر وقت کا تقاضا نہیں ٹال سکتی تو میری ہم عمر طالبات کا جوش کیوں سو گیا ہے۔" میں نے تو اخبار میں یہ بھی پڑھا ہے کہ مختلف سکولوں کی کئی طالبات تحریک میں شامل ہو گئی ہیں۔"

کرامت دراصل زبیدہ کے والدین کی طرح مصلحت اندیش تھا، اسے زبیدہ کے والدین نے یہ سمجھا بھی دیا تھا کہ کسی حکمت عملی سے کام لے کر صاحب زادی کو تحریک میں شامل ہونے سے روکے رکھے، چنانچہ اس نے اب یہ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کا ایک مجاہد زخمی کی خدمت میں رہنے سے جوشِ عمل کا تقاضا پورا ہو رہا ہے آپ کو اسلامی تاریخ کے وہ اوراق ضرور یاد ہوں گے کہ عرب میں مسلمان خواتین حتےالوسع جنگ میں شریک نہ ہوتی تھیں اور زیادہ تر زخمیوں کی مرہم پٹی کے فرائض انجام دیتی رہتی تھیں۔ اب تک آپ نے عقیل بھائی

کی جو خدمت انجام دی ہے اس کا جس قدر احسان ہم پر ہے اس سے کہیں زیادہ آپ نے موجودہ جنگ آزادی میں بالواسطہ طور پر حصہ لے کر قومی فرض ادا کیا ہے"۔

کرامت کے ان الفاظ پر زبیدہ نے کہا "بھائی صاحب! آپ کی یہ عادت اچھی نہیں کہ آپ میری حقیر خدمات کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں"۔

زبیدہ کے والدین نے بھی زبیدہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی کرامت بیٹا! تمہارے لئے یہ مناسب نہیں"۔

"تو پھر کیا مناسب ہے"۔ کرامت نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہی کہ اب کھانا کھا لیا جائے"۔ زبیدہ نے کہا "کیونکہ سیاسی باتوں میں ہم نے اتنی دیر لگا دی ہے کہ سالن ٹھنڈا ہو گیا ہوگا"۔

"اچھا تو پھر لا دیئے"۔ کرامت نے بے تکلفی سے کہا اور زبیدہ خاطر تواضع کے جوش میں پھرتی دکھاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

آج کھانے میں پنیر کا سالن اور کسٹرڈ فرنی رکھی گئی تھی۔ پنیر کا جس قدر زیادہ شوق زبیدہ کو تھا اتنا ہی گریز عقیل کو تھا۔ کرامت نے جلدی سے خود ہی ہر ایک پلیٹ میں مناسب مقدار میں سالن ڈال دیا۔ عقیل کی پلیٹ اتفاق سے پنیر کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے اپنی پلیٹ زبیدہ کے سامنے رکھ دی اور اس کی پلیٹ پر اپنا قبضہ جما لیا۔

عقیل کی اس اتفاقی حرکت سے ایک تو زبیدہ شرما سی گئی، دوسرے عزیزہ کو اپنی مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا۔

زبیدہ کے والدین نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے اب بھائی اپنی خدمت کا معاوضہ بہن کو دینا چاہتا ہے"۔ اس خیال سے کہ اس کی خاموشی معمہ نہ بن جائے زبیدہ نے کہا۔ "اس قسم کا جتنا بھی معاوضہ دیا جائے گا میں اسے بہت کم سمجھوں گی"۔

عقیل نے لقمہ منہ میں ڈالنے کے بعد کہا "میرا سالن جھوٹا ہو گیا ہے ورنہ اپنی پلیٹ کے چند ٹکڑے

بھی آپ کو دے دیتا۔"

کرامت نے کہا۔ "یہ بہانہ اچھا ہے۔"

عزیزہ بولی۔ "میں بھائی جان کی بہن ہوں اس لئے اپنی پلیٹ کے ٹکڑے بھائی جان کی طرف سے دے سکتی ہوں۔"

زبیدہ نے فوراً یہ بات پالی کہ عزیزہ کو اس کی چھپی ہوئی محبت کا پتہ چل گیا ہے جبھی تو اس نے اپنے بھائی جان کی جانب سے پنیر کے ٹکڑے دینے چاہے ہیں۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بس اسی قدر کہہ سکی "شکریہ۔"

"شکریہ" کے لفظ کہنے کے فوراً بعد زبیدہ نے اپنے دل ہی دل میں ایسی شرم محسوس کی کہ اس نے کسی بہانے کھانے سے جلد فارغ ہو جانا چاہا۔ لیکن سوچتی رہی کہ کس بہانے سے اٹھے، وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ بموں کی اچانک آوازوں نے کانوں کے پردے پھاڑنے شروع کر دئے۔ زبیدہ کے والد بولے۔

"اب ہماری خیر نہیں معلوم ہوتی۔ فرانسیسی یہاں بھی آ پہنچے۔"

عقیل نے کہا "آپ خدا پر بھروسہ کیجئے۔" زبیدہ کی زبان سے نکلا "جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو پھر ہمیں کس بات کی فکر۔"

جلیل صاحب نیچے گئے تو کچھ لوگوں نے انھیں گھر واپس جانے کا مشورہ دیا۔ ابھی وہ اس مشورہ پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مسلمانوں کا جم غفیر ادھر اُدھر بھاگتا نظر آیا۔ بہت سے لوگوں کے بھاگنے اور شور مچانے کی آوازیں آئیں۔ باہر کی طرف دیکھا تو بھاگڑ مچی ہوئی تھی۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں، دروازہ کھلا دیکھا تو دو عورتیں اس طرف آگئیں۔ ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی زبان سے کچھ کہتیں زبیدہ کی والدہ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "بیٹی یہ گھر تمہارا ہی تو ہے آجاؤ، جھجکو نہیں۔" چنانچہ وہ داخل ہو گئیں اور انھیں کوچ پر جگہ دے دی گئی۔ زبیدہ جلدی سے گرم دودھ کے دو پیالے لے آئی، دونوں عورتیں اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے بہت دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہیں۔

جب وہ دردو چھپا کر قدرے ہوش میں آئیں تو جلیل صاحب نے پوچھا" آپ لوگ کہاں سے بھاگ کر آئے ہیں" ان میں سے ایک نے جواب دیا" بہت دور جگہ سے ... یہ تو خدا کو ہماری جان بچانا منظور تھا اور ہم بچ گئی ہیں ورنہ بظاہر حالات ایسے ہرگز نہ تھے۔ اس وقت میرا خیال ہے کہ شہر کا ہر حصہ ویران اور سنسان ہو گا۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد دوسری عورت نے کہا" اتفاق اور قسمت کی بات دیکھئے کہ ہم رہنے والی قسطنطین کی ہیں اور اپنے والد کے ساتھ دو چار روز کے لئے یہاں کے فوجی علاقہ قصبی میں ایک مشہور تاجر مولینا اسحاق کے گھر ٹھہرنے کے لئے آئی ہوئی ہیں چند روز ہوئے اچانک باہر نکلیں تو فوجی دستہ یکایک نمودار ہو گیا۔ جس نے ایک تنگ گلی میں گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اس گلی میں ہم دونوں بہنیں موجود تھیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ ایک نوجوان لڑکی پر ہوئی جو اپنے آپ کو بڑی مشکل سے بچانے میں کامیاب ہوئی۔ بھاگتے ہوئے وہ نوجوان لڑکی گولی کھانے کے بعد ہم دونوں سے باری باری ٹکرائی جس سے اس کا خون ہمارے کپڑوں کو لگ گیا۔ وہ نوجوان لڑکی ہم سے ٹکرانے کے بعد زمین پر لوٹنے اور تڑپنے لگی، اس وقت ایسا نفسی نفسی کا عالم محسوس ہوا کہ ہم فوجی دستے کے بے تحاشا حملے سے بچنے کے لئے ایک موٹے تنے والے درخت کی اوٹ میں چلی گئیں، شکر ہے کہ فوجی سپاہیوں کو ہمارا پتہ نہ چل سکا۔ ہم نے درخت کی اوٹ سے یہ منظر دیکھا کہ بہت سے سپاہیوں نے تڑپتی ہوئی لڑکی کو حراست میں لے لیا۔ ایک سپاہی نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا" ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ بہت بڑا شکار ہمارے قبضے میں آگیا ہے۔" دوسرے سپاہی نے کہا۔" کون؟" اور پہلے سپاہی نے جیب سے فوٹو نکال کر دکھاتے ہوئے جواب دیا" جمیلہ بوحائرڈ۔"

دوسرے سپاہی نے فوٹو دیکھ لینے کے بعد جمیلہ کا چہرہ دیکھا اور پھر اس انداز میں خوشی کا اظہار کیا جیسے انھیں مٹی میں سے کوئی ہیرا مل گیا ہو۔ ایک سپاہی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" ہم تمہارے ممنون ہیں کہ تم ہمیں بہت بڑا انعام دلانے کی باعث ہوگی۔"

جمیلہ نے جواب دیا" ہاں انسان کو انسان کے کام ضرور آنا چاہیئے۔ میں بھی خدا کا شکر ادا کرتی ہوں

جس نے مجھے آپ لوگوں کی خدمت کرنے کا موقع بخشا۔"

اِس کے بعد ایک سپاہی نے اِس کے ہاتھ سے فائل چھینی جس کے کچھ اوراق پڑھنے کے بعد وہ بڑبڑایا آخر کار سپاہی اِس بہادر خاتون کو اپنے ساتھ کہیں لے گئے اور ہم بھاگ کر ایک پرائیوٹ کار میں بیٹھ کر چھپ گئیں۔ اِس کا ڈرائیور بھی شاید فوجی حملے کے ڈر سے چھپا ہوا تھا۔ ذرا دیر میں واپس آیا اور کار سٹارٹ کردی جب وہ بہت دور چلا گیا تو میں نے ڈرائیور کو بلایا۔ میرے بلانے پر وہ سخت ڈرا' اِس نے کار چلانی بند کردی۔ ہم نے اسے تسلّی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہم حملے سے بچنے کے لئے کار میں چھپ گئی تھیں۔

اب ڈرائیور کی جان میں جان آئی اور وہ کار چلانے لگا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ ہم نے اسے اپنے گھر کی طرف چلنے کو کہا لیکن اس نے جواب میں کہا کہ اُدھر تو آگ لگ رہی ہوگی جمیلہ بوحائرڈ کی گرفتاری کے فوراً بعد لوگ مشتعل ہو گئے ہونگے اور فوجی دستے کے سپاہی بندوقیں سیدھی کئے منتشر ہو گئے ہونگے نعروں کی آوازیں آنے لگی ہونگی اور نعروں کی آوازوں کے پیچھے سپاہی بھاگنے لگے ہوں گے۔ میں تو بہنو! ایسے راستے پر جاؤں گا جہاں امن ہو۔ چنانچہ وہ نہ جانے کہاں کہاں سے کار گھماتا ہوا لے آیا اور پھر یہاں سے قریبی مقام پر لوگوں کی آمد و رفت دیکھ کر ہمیں اتار دیا۔ یہاں ہم ایک گھر میں داخل ہو گئیں اور وہاں ہم نے چند دن گذارے اِس کے بعد اپنے گھر جانے کے لئے روانہ ہوئیں تو ایک اور حملے کے ڈر سے لوگ بھاگتے نظر آئے۔ دائیں طرف سے فوجی دستوں کی جیپیں آنا شروع ہو گئیں جنھیں دیکھ کر سب بھاگ اٹھے۔ ہم بھی بھاگتی بھاگتی دروازہ کھلا دیکھ کر آپ کے گھر میں داخل ہو گئیں۔ ہم آپ لوگوں کی ہمدردی کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں، کم ہے۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا "یہ تو ہمارا فرض ہے البتہ ہم خدا کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ہمیں آپ کی خدمت کا موقع دیا۔ آپ اِس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہیئے۔"

چونکہ یہ کمرہ وہی تھا جس میں عقیل چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اس لئے زبیدہ کی والدہ کی پیشکش کے فوراً بعد عقیل نے کہا "ہاں بہنو! اِس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہو معلوم ہوتا ہے یہ گھر دوسروں کی خدمت ہی کے لئے بنا ہے۔ اِس کی مثال میں تم مجھے دیکھ لو! میں نے بھی بہت دن ہوئے یہاں پناہ لی تھی

اور اب تک خدمت کر رہا ہوں۔ میں ہی نہیں میرا بھائی اور بہن بھی یہیں موجود ہیں۔ چوٹ کھانے کے بعد ابھی تک ایسا افاقہ نہیں ہو سکا کہ میں ان کی خدمت سے سبکدوش ہو سکوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ ان کی خدمت کرنے کے جذبے کا ظرف بہت بڑا ہے۔"

دونوں عورتوں نے مکینوں کی تعریف کی اور کہا "ہمیں تو کچھ ہی گھنٹوں کے لئے پناہ دیے دینا ہماری بہت بڑی خدمت کے مترادف ہے۔ باقی ہمیں تو یہاں سے جانا ہی پڑے گا کیونکہ ہمارے والد اور میزبان مولینا اسحاق بہت فکرمند ہوں گے۔"

زبیدہ نے کہا "آپ دونوں بہنیں بہت خوش قسمت ہیں جنھوں نے جمیلہ بوحائرڈ کا دیدار کیا ہے۔ وہ اگرچہ مجھ سے بھی کم عمر ہوگی لیکن میرے نزدیک وہ موجودہ نازک دَورِ سیاست میں بزرگ ترین خاتون ہے وہ صحیح معنوں میں واجب الاحترام ہے۔ وہ عمر کی جوان سہی لیکن کردار میں بزرگ ہے۔"

زبیدہ کے والدین، عقیل اور اس کے بھائی بہن زبیدہ کے جمیلہ بوحائرڈ کے بارے میں اس اظہارِ رائے پر جس میں جوش پایا گیا تھا۔ سب متاثر ہوئے، عقیل خاص طور پر متاثر ہوا اور ساتھ خوش بھی تھا کہ سیاسی احساسات کے اعتبار سے وہ اس کی ہم آہنگ ہے۔ اس نے زبیدہ کی تائید کرتے ہوئے کہا "یہ تو امر حقیقت ہے کہ الجزائر کی تحریک آزادی میں جمیلہ بوحائرڈ کا درجہ ایک لحاظ سے بن خذہ، منصر اور بن باللہ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس نے خفیہ طور پر جو کردار ادا کیا ہے وہ ان کمین گاہوں سے چلنے والے تیروں سے کم نہیں جن کی بوچھاڑ مسلح دشمنوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اور انھیں کمین گاہ کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس گوشے میں واقع ہیں۔ میرے خیال میں اسی ایک اور جمیلہ پیدا ہو جائے تو ہماری آزادی کے دن بہت قریب آ جائیں۔"

زبیدہ جو از خود عقیل سے مخاطب نہیں ہونا چاہتی تھی، سیاسی اظہارِ خیال کے جوش میں مخاطب ہوگئی۔ "آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ حقیقتاً ایک اور جمیلہ کا وجود میدانِ سیاست میں اپنی کارگذاری دکھا رہا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ اس کا نام بھی جمیلہ ہے۔ اسے جمیلہ بوحنزہ کے نام سے

پکارا جاتا ہے۔ یہ جمیلہ بھی پہلی جمیلہ کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ الجزائر آزاد ہوا تو جہاں مرد رہنماؤں کی یاد دلوں سے محو نہ ہوگی وہاں ان جمیلاؤں کو بھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔"

مہمان خواتین نے کہا۔ "بے شک۔"

"بے شک"۔ کہنے کے ساتھ ہی زبیدہ کی والدہ بولیں۔ "زبیدہ تم شاید یہ بات بھول گئی ہو کہ تمہاری مہمان سہیلیوں کو صاف کپڑوں کی ضرورت ہے۔"

زبیدہ نے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں بھولی نہیں۔ ابھی لائے دیتی ہوں صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی آنکھوں کے سامنے خون سے رنگے ہوئے ان متبرک ملبوسات کو کچھ دیر رہنے دوں جن پر کوئی نہ کوئی چھینٹ جمیلہ بوحائرڈ کے خون کی بھی پڑی ہوگی۔"

ایک خاتون نے کہا۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ میرے بازو پر جمیلہ کے جسم کا خون ہے جس وقت وہ گولی کھانے کے بعد مجھ سے ٹکرائی تھی اس وقت اس کے بازو کا خون میرے کپڑوں سے لگ گیا تھا۔"

زبیدہ اندرونی کمرے میں جاتے جاتے واپس آگئی اور اس نے فرطِ جوش و مسرت میں خون آلود ملبوس کو بوسہ دے دیا۔ "میں بہت ممنون ہوں گی اگر آپ مجھے یہ قمیص تحفے کے طور پر دے دیں۔"

اس نے کہا۔ "اگر یہ محبت بھرا مطالبہ کسی اور کا ہوتا تو میں یہ قمیص کسی کو نہ دیتی لیکن آپ کے قیمتی خیالات اور جذبات پر میں اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

یہ جواب سن کر زبیدہ کو بہت خوشی ہوئی اور وہ خوشی سے ناچتی کودتی بھاگتی اندرونی کمرے میں صاف قمیص لینے چلی گئی۔"

جلیل صاحب نے کہا۔ "بیٹیو! تم دونوں کے اخلاق پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے تمہارا دل نیکی کی باتوں سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

اتنے میں زبیدہ دو قمیصیں اور شلواریں لے آئی اور دونوں کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کپڑے تبدیل کرائے۔ جب وہ کپڑے تبدیل کر چکیں تو اس نے خون آلودہ ملبوسات کو جن پر خون

جم جانے کے بعد خشک ہو چکا تھا، اپنے سینے سے لگا لیا اور ان کے ان تحفوں کیلئے بار بار شکریہ ادا کیا۔ کپڑے بدلنے کے بعد وہ پہلے کمرے میں آ گئیں اور آرام کرسیوں پر بیٹھ کر تحریک آزادی پر اپنا اظہارِ خیال کرنے میں محو ہو گئیں۔

جمیلہ بوحائرڈ کی گرفتاری کے فوراً بعد عوام میں شور مچ گیا۔ ان کی زبانیں پہلے سے زیادہ بے باک ہو گئیں ان کے اقدامات میں پہلے سے زیادہ مستعدی پیدا ہو گئی۔ ان کی رگوں میں خون پہلے سے زیادہ روانی دکھانے لگا۔ ہر ایک کی زبان پر جمیلہ کا نام تھا۔ کچھ ہی روز گذرے ہوں گے کہ کسی کی زبان پر جمیلہ بوحائرڈ کا نام تھا اور کسی کی زبان پر جمیلہ پوئنزہ کا۔ جمیلہ پوئنزہ بھی جمیلہ بوحائرڈ کی طرح الجزائری حریت پسندوں کی جماعت میں شامل رہ کر یوسف سعدی کی قیادت میں مسلمان چھاپہ ماروں کے جرات مندانہ حملوں میں شریک ہوتی رہی عوام و خواص کی زبانوں پر دونوں کا نام آیا تو عام طور پر مشہور ہو گیا کہ کوئی جمیلہ گرفتار ضرور ہوئی ہے یہ معلوم نہیں کہ جمیلہ بوحائرڈ گرفتار ہوئی ہے یا جمیلہ پوئنزہ۔ لیکن یہ بات جلد واضح ہو گئی کہ ایک نہیں دونوں جمیلائیں گرفتار ہوئی ہیں اور دونوں پر سخت سے سخت ظلم و ستم روا رکھے جا رہے ہیں۔

جس تھانیدار نے ایک فوجی افسر کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا کہ جمیلہ بوحائرڈ اگر ایک چٹان ہے تو

چند روز میں یہ چٹان ٹوٹ جائے گی۔ اس نے خود دلچسپی لے کر جمیلہ کی زبان سے ایسے راز اگلوانے کا قصد کیا جو اِس کے سینے میں محفوظ تھے اور جو موت کے خوف سے بھی فاش نہیں ہو سکتے تھے۔

تھانیدار نے جمیلہ کو اپنے کمرے میں بُلایا اور دروازہ بند کرا دیا۔ اپنے اور جمیلہ کے سوا وہاں کسی کو نہ رہنے دیا۔ باوجود اِس کے کہ اِس کا سینہ غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا، نرم لہجے میں بولا:

"دیکھو جمیلہ! تمہارے جرم کی موجودگی میں تمہاری رہائی تو تمہاری سزا میں کمی کا بھی مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن اقبالِ جرم ایک ایسا وصف ہے کہ اگر تم اِس سے متصف ہو گئیں تو مجھے تم سے بہت ہمدردی ہو جائے گی پھر ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری رہائی کی کوئی صورت نکال سکوں اس لئے میں جو سوال کروں اِس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرو۔"

جمیلہ نے تھانیدار کی نرم لہجے میں یہ گفتگو سننے کے بعد جواب دیا۔ "سب سے پہلے تو میں آپ کو اِس بات کا یقین دلاتی ہوں کہ اگر آزادی کی خواہش اور آرزو کوئی جرم ہے تو اِس کا اقبال میں پہلے بھی کر چکی ہوں اور اب بھی کرتی ہوں، باقی جو سوال آپ مجھ سے پوچھیں گے۔ میں خدا نے چاہا تو اِس کا سب سے صحیح جواب دوں گی۔"

تھانیدار نے کہا "میرا سوال یہ ہے کہ کیا تم حریت پسند اڈے سے تعلق رکھتی تھیں؟"

"ہاں رکھتی تھی اور اب بھی رکھتی ہوں۔"

"تم یوسف سعدی کو جانتی ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"کس حد تک؟"

"اِس حد تک کہ میں اس کے اشاروں پر ناچتی رہی ہوں۔"

"اس کے اشاروں پر تم نے کیا کیا کام کیا؟"

"وہ وہ کام جو آزادی حاصل کرنے کے لئے کسی حریت پسند کو کرنا چاہیے۔"

میں اس کی تفصیل چاہتا ہوں۔"

"مجھے وہ تفصیل بیان کرنے سے انکار ہے۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے سوالات کا جواب ضرور دوگی۔"

"ہاں، یہ بھی تو جواب ہے کہ میں اپنی کارگزاری کی تفصیل بیان نہیں کر سکتی۔"

"کیا یہ جواب ہے؟"

"جواب نہیں تو کیا اسے خاموشی کہتے ہیں۔"

"میرا سوال تفصیل سے واقف ہونا ہے۔"

"میرا جواب تفصیل سے ناواقف رکھنا ہے۔"

"کیا تمہیں اپنا انجام معلوم ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ موت۔"

"یہ محض مصنوعی دلآویز دعویٰ ہے۔"

"مگر ایسے دلآویز دعویٰ کی جرأت کرنا آسان کام نہیں۔"

"اچھا اگر میں نے مناسب سمجھا تو تمہارے دعویٰ کو آزما کر دیکھوں گا۔"

"بڑے شوق سے۔"

یہ جملہ تھانیدار کو ناگوار گذرا اس کی آواز کانپ اٹھی۔

"جمیلہ! اب میں زبان کی بجائے عمل سے کام لوں گا۔"

اور پھر اس نے اس خوبصورت پیکر کو مسلسل تھپڑ رسید کرنے شروع کئے۔ ان تھپڑوں نے جمیلہ کے گال سرخ کردئے منہ سے خون جاری کر دیا، جمیلہ سوا اس کے کچھ نہ کہہ سکی۔ "آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سزا میرے سینے کا راز فاش کر دے گی۔ لیکن ؎ ایں خیال است و محال است و جنوں۔"

اس جواب پر تھانیدار اور زیادہ غصہ میں آگیا اس نے مضطربانہ کیفیت میں آکر لاتوں سے مارنا شروع کر دیا۔ مارنے کے ساتھ ایسی ایسی مغلظ گالیوں کی فصاحت و بلاغت دکھانی شروع کر دی جن کی شنوائی کانوں کو سخت ناگوار گذرتی تھی۔ تھپڑوں، لاتوں اور گالیوں نے بھی کچھ اثر نہ ڈالا تو ہنٹر سے کمر

پر ناقابلِ برداشت ضربیں لگانی شروع کر دیں ۔ ان مسلسل ضربوں کی تاب نہ لا کر اس کی زبان اپنے بیٹے کے رازوں کو اور بھی محفوظ کر گئی یعنی وہ بیہوش ہو گئی ۔ بیہوشی کے عالم میں بھی تھانیدار کی ضربیں گریز اختیار نہ کر سکیں کیونکہ غم و غصہ کی شدت کے باعث ان کا زور رفتہ رفتہ ختم ہو سکتا تھا ۔ آخر تھانیدار جب خود تھک گیا تو پھر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر کسی سپاہی سے یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا ۔ "کم بخت فوجی افسر کا کہنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے ۔ وہ کہتا تھا کہ یہ چٹان ہے ، میں نے دعویٰ کیا تھا کہ چٹان ٹوٹ جائے گی لیکن تجربے سے ثابت ہوا کہ یہ چٹان پتھر کی نہیں فولاد کی چٹان ہے ...... اب اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو اور میں ابھی آتا ہوں ۔"

تھانے کے سپاہی جسم کو دبا کر اور پانی کے چھینٹے مار کر جمیلہ کو ہوش میں لے آئے اور اسے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر دے مارا ۔ جمیلہ خاموشی سے پڑ گئی اور اسے دو چار منٹ میں نیند آ گئی ۔

تھانیدار اپنے کام سے واپس آیا تو اس نے اسے بدنام فرانسیسی پیراشوٹ دستے کے قبضے میں دے دینے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ اس دستے نے اپنی کارروائی شروع کرنے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہ لیا ۔ اس دستے کے سپاہیوں کے جب وہ ہاتھ آئی تو سب نے قہقہہ لگایا ۔ اس قہقہہ کا اس نے خاموشی میں جواب دیا ۔ ایک سپاہی نے اس کے قریب آ کر جب کہ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی کرخت اور بلند آواز سے کہا "کھڑی ہو جاؤ ۔"

"وہ اطمینان سے کھڑی ہو گئی ۔"

"کپڑے اتار ڈالو ۔"

"میں ایسا نہیں کروں گی ۔"

"تمہیں ایسا کرنا ہو گا ۔"

"ہرگز نہیں کروں گی ۔"

میں تمہیں ۔ "ہرگز نہیں" کا جواب دیتا ہوں یہ کہہ کر اس نے جمیلہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسکی قمیض پھاڑ دی ، پھر بنیان پھاڑ کر پھینک دی ، اس کے بعد شلوار کو بہیمانہ طریقے سے کھول دیا گیا ۔ جمیلہ

مجبور و بے بس کھڑی رہ گئی۔

سپاہی بولا "تم تو کہتی تھیں، میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"ظالم میں نے کب ایسا کیا ہے، یہ تو تم نے کیا ہے جس کو اخلاق اور شرم و حیا سے دور کا تعلق نہیں۔"

اس کے اس فقرے کے مکمل ہونے سے پہلے دوسرا سپاہی آگے بڑھا اور اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے بھیگے ہوئے کپڑے سے ایک بنچ کے ساتھ باندھ دیا۔ جمیلہ ہاتھ پاؤں مارتی رہ گئی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ "الجزائر کی سرزمین چاہئے تمہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس خواہش کے لئے بہت سے مرحلوں سے گذرنا ضروری ہے۔"

جمیلہ نے کہا "یہ میں جانتی ہوں۔ میں نے جس روز میدانِ آزادی میں قدم رکھا تھا اسی روز مجھے معلوم تھا کہ کٹھن راستوں سے گذرے بغیر آزادی نہیں مل سکتی۔ اس لئے مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

بدنام پیراشوٹ کا دستہ قہقہہ زن ہو گیا۔ ایک سپاہی نے اپنے ہاتھ میں بجلی کے دو تار لئے۔

"آزادی کی آرزو کرتی ہے کہ پہلے جھٹکے کھاؤ۔"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے منہ، کان، زبان، چھاتی اور ہتھیلیوں وغیرہ پر بجلی کے جھٹکے لگائے جھٹکوں کی تاب نہ لاکر وہ بسمل بن گئی۔

"کہو پھر نام لوگی آزادی کا؟" اور جمیلہ درد سے کراہنے کے بعد بلند آواز سے بولی۔

"الجزائر زندہ باد۔" اس پر اس نے جسم کے مختلف حصوں پر جھٹکے لگانا پھر شروع کر دئے۔ جمیلہ تڑپ تڑپ اٹھتی لیکن اس کی زبان سے آزادی کے سوا کوئی لفظ نہ نکلتا۔

جب پیراشوٹ کا دستہ جمیلہ کی زبان سے راز فاش نہ کرا سکا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اس عمل کو روزانہ دہرایا جائے۔ جمیلہ اس دوران کئی مرتبہ ہوش کھو بیٹھی اور بہت دیر بعد ہوش میں آئی۔

جھٹکے لگاتے وقت جمیلہ کے ردِ عمل کی کیفیت کو ایک سپاہی نہایت احتیاط اور مستعدی سے ایک نوٹ بک میں درج کرتا رہا۔

دوسرے سپاہیوں میں کئی ایک سگریٹ سلگا کر اس کا ایک کش لینے کے بعد جسم کے مختلف حصوں پر لگا لگا کر چھالے بنا ڈالتے۔ یہ عمل بھی بہت دنوں تک جاری رہا جس کے نتیجے میں خوبصورت جمیلہ کی بہار صحت خزاں میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے چہرے کی سرخی پیلے پن میں بدل گئی، اس کے گالوں کی شگفتگی کملائے ہوئے بے رنگ و بو پھول میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئیں۔ اس کا پھول سا چہرہ سوکھے ہوئے کانٹے کا دردانگیز منظر دکھانے لگا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جب وہ ظالموں اور ستم گروں کے سامنے یہ کہتی کہ "حصولِ آزادی کے لئے یہ سزائیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں" تو اس کے چہرے کی خزاں دیکھتے دیکھتے بہار میں تبدیل ہو جاتی۔ کلیاں چٹک جاتیں، غنچے پھول بن جاتے، بادِ بہاری پھولوں کو جھولا جھلانے لگتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ دیکھتے ہی دیکھتے آزادی کا پرچم اپنے پیروں پر چلتا ہوا جمیلہ کے پاس آجائے گا۔

ایک سپاہی جیسے جلتے ہوئے سگرٹوں کو جمیلہ کے جسم کے ساتھ لگانے کا تماشا اچھا لگتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے پاس سگریٹ نہیں تھے۔ دیا سلائیاں تھیں اب اس نے انھیں جلا جلا کر جسمِ نازنین کے ساتھ لگا لگا کر اپنا شوق پورا کرنا شروع کیا۔

پیراشوٹ کے دستے کے چند سپاہی جنھوں نے باغی جمیلہ کو نہیں دیکھا تھا، قریب آئے اور اس سے مصافحہ کرنا چاہا مگر جمیلہ نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے:

ان میں سے ایک نے پھکڑ رسید کرتے ہوئے کہا: "افسوس تمہارے جسم کا کوئی حصہ ایسا نظر نہیں آتا جہاں میں ستم ایجاد کرنے کا شوق پورا کرسکوں ورنہ اپنے شوق کو کبھی مایوس نہ کرتا۔ مردہ جسم سے ہمیں کیا واسطہ ہمیں تو زندہ اور حساس جسم کی ضرورت ہے، افسوس ہم پیچھے رہ گئے اور ہمارے دوست سبقت لے گئے۔"

جمیلہ خاموش رہی ——— وہ خاموش ہی رہ سکتی تھی ——— اس کا خاموش رہنا ہی مناسب تھا، کیونکہ وہ مدہوش تھی مدہوشی کے بعد بیہوش تھی۔ اس کی بیہوشی پیراشوٹ دستے کے نزدیک کوئی حیران کن واقعہ نہ تھا۔

"چلو آؤ - کافی پی لیں باغی خاتون تو اب بیہوش ہو گئی ہے"۔ یہ الفاظ دستے کے ایک سپاہی نے کہے جس پر دوسرا بولا "بہت سخت جان معلوم ہوتی ہے ۔ورنہ ہم منٹوں میں بیہوش کر دیا کرتے ہیں"۔ "چلو آؤ کافی پیئیں۔ تیسرے نے کہا "جب ہمارے پاس کافی سے زیادہ بہتر نعمت موجود ہے تو پھر کافی کی کیا ضرورت ہے" "دوست تم نے روح کو تسکین دے دی" چوتھا بولا "ہاں تو پھر آؤ آج جی بھر کے پیئیں۔"

پیراشوٹ دستہ ایک دوسری بلڈنگ میں چلا گیا جہاں حسین وجمیل ساقی صراحیوں سے بھی پلائے جا رہے تھے اور آنکھوں سے بھی۔ تقدس فروش اشاروں کے بل پر پیمانے بھرے جا رہے تھے اور پینے والے پیمانے خالی کرنے کے فوراً بعد لڑکھڑاتے ہوئے "اور پلاؤ" کی آواز بلند کرتے جا رہے تھے۔ جام سے جام ٹکرا رہے تھے اور بدن سے بدن، پیراشوٹ کے سپاہی اس مے خانے میں داخل ہوتے ہی مے خانہ کے ہو گئے۔ اوّل تو انھیں سرمستوں کی کیفیتوں نے مدہوش کر دیا اور جو کمی باقی رہ گئی وہ لبالب جاموں سے پوری ہو گئی۔ اس مے خانے میں کوئی ساقی ممسک نہ تھا، سبھی فراخ دل تھے۔ وہ لبالب صراحیاں خالی کئے جا رہے تھے۔ کوئی پی رہا تھا کوئی پلا رہا تھا کوئی آوازے کس رہا تھا۔ کوئی گر رہا تھا کوئی بڑھ رہا تھا، کوئی لیٹا ہوا تھا کوئی مدہوش تھا، کوئی بیہوش۔ رفتہ رفتہ سب کی کیفیت مدہوشی سے بیہوشی میں بدل گئی اور وہ سب کے سب دنیا و مافیہا سے بے پروا، ایسی دنیاؤں کی سیر کرنے لگے جن میں کیف و نشاط کا ہر عالم موجود تھا اور جو چیز موجود نہ تھی وہ الجزائر تھا، الجزائر کے مجاہدین تھے، خضر بن باللہ، فرحت عباس اور بن خذہ تھے۔ نہ جمیلہ بوحائرڈ تھی نہ جمیلہ بوپہزہ۔ شراب کے نشے میں چور پیراشوٹ دستے کے سپاہی جس قدر زیادہ بیہوش ہوتے جا رہے تھے اسی قدر جمیلہ بوحائرڈ کی بیہوشی جو اس کی کاری چوٹوں اور گہرے زخموں کے باعث طاری تھی رفتہ رفتہ مدہوشی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ دو گھنٹے کے بعد بڑی مشکل سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے اپنے آپ کو برہنہ پا کر خودکشی کا ارادہ کر لیا، وہ خودکشی کا راستہ تلاش کرنے کے لئے اپنا خیال دوڑانے لگی۔ جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو اس کی چشم تصور میں اسلامی تعلیم آ گئی۔ اسلامی تعلیم نے اس کی بروقت رہنمائی کی۔ اسے یاد آ گیا کہ اسلامی تعلیمات نے مسلمانوں کی بہادری کی ایک علامت اس بات میں مضمر رکھی ہے کہ وہ غصے پر قابو پا لیں اسے مشکلات اور مصائب کے وقت صبر و تحمل سے کام لینے کے لئے ایک آیۂ مبارکہ بھی یاد آ گئی...

ان اللہ مع الصٰبرین اسے یہ بھی یاد آگیا کہ اسلام نے خودکشی کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ اسلام نے مسلمان کی انفرادی زندگی کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ جماعتی حیثیت میں جماعت کی رائے اور فیصلے کے بعد جب ایک مجاہد جان دیتا ہے تو اسے شہادت کا درجہ ملتا ہے اور اس کے مقابلے میں خودکشی کرنے والا چونکہ جماعت کی رائے اور منشا کے بغیر قدم اٹھاتا ہے اس لئے وہ اپنی جان گنوانے کے بعد ایمان بھی ضائع کر بیٹھتا ہے۔ جمیلہ نے سوچا اس میں یہ بھی ایک معنی خیز راز پوشیدہ ہے کہ خودکشی کرنے والے کی جان اگر کسی مقصد بر آری کے لئے چلی جاتی تو اس سے کوئی فائدہ بھی پہنچتا۔ قوم اور ملک کو ایک وقت دشمن عناصر سے جنگ کرنے کے لئے ایک ایک مجاہد کی ضرورت ہوتی ہے جو مقابلے میں دشمن عناصر کو ختم کرنے کے ساتھ بعض اوقات اپنے آپ کو بچا بھی لیتی ہے اور پھر کسی دوسرے موقع کے لئے آمادۂ پیکار رہتی ہے لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جانیں زندگی سے کنارا کش ہو کر مخالف عناصر کی شکست کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی قربانی بامقصد بن جاتی ہے۔ خودکشی اس کے مقابلے میں بے مقصد ہے جس کی تائید اسلام جیسے معقول مذہب نے کبھی نہیں کی۔

یہ سارے خیالات جمیلہ کے دماغ میں پانچ سات منٹ کے وقفہ میں چکر کھا گئے اور پھر وہ تازہ ولولے کے سہارے اپنی جگہ سے اٹھی اور کپڑے ڈھونڈے۔ الماری میں پڑے ملے تو پہن کر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ اسے نظر آیا کہ اس عمارت کا ایک ایک دروازہ بند ہے اس نے سوچا کاش کوئی راہ فرار ملتی۔ اگر ملتی تو وہ اپنے مجاہد ساتھیوں کو ہمراہ لے کر مقابلے میں یوں ڈٹ جاتی جیسے چٹان۔ لیکن اس نے دیکھا کہ وہ مجبوریوں اور بے بسیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، ان زنجیروں کو خدائے مشکل کشا ہی توڑ سکتا ہے اور وہی اس کی راہِ فرار کے لئے کوئی نیا دروازہ نکال سکتا ہے۔ ———— یہ سوچ کر اس کا دل اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ اب وہ انسانوں کے بنائے ہوئے دروازوں پر انتظار کی نظریں ڈالنے لگی کہ جو ہونا ہو جلد ہو جائے، وہ انشاء اللہ ہر حال میں شاد و خرم اور مطمئن رہنے کے لئے تیار ہے۔

۲۱

پیر اشوٹ فوجی دستہ بھی جب جمیلہ سے کچھ بھی اگلوانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو فوج نے ایک بار اور سخت قسم کی کارروائی کے ذریعے کوشش کا خیال کیا۔ فوج نے اس بار اس کے جسم کو انتہائی طور پر تکلیف پہنچا کر اس کی عزت کو کانٹوں پر گھسیٹ کر اسے صدمہ پہنچا کر ایک تو خود اسے گذشتہ سیاسی کارگذاری سے تائب کرنا چاہا، دوسرے اس کی قومی جماعت کے راز معلوم کرنے چاہے۔ لیکن وہ ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد اپنی جگہ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"اے انسانیت سوز سلوک کرنے والے درندو! خوب کان کھول کر سن لو کہ جمیلہ کے اقدامات میں سچے عزائم کی روح کام کر رہی ہے، تم جمیلہ کے جسم کو زخمی کر سکتے ہو اس کی بوٹی بوٹی اڑا سکتے ہو، اس کا سر بھی تن سے جدا کر سکتے ہو لیکن اس کی روح کو موت کا پیغام سنانے کی جرأت نہیں کر سکتے جس نے جماعتی رازوں کو سیپیوں کے موتیوں کی طرح مخفی کر رکھا ہے۔"

جمیلہ نے ایک دوسرے موقع پر یہ بھی کہا "میں تمہارے ظالم ہاتھوں کو ظلم وستم سے ہرگز نہیں روکتی۔ تم میری آواز بند کر سکتے ہو، تم جان کی قربانی لے سکتے ہو جو میں ہنس کر دینے کو تیار ہوں مگر وہ راز معلوم نہیں کر سکتے جو الجزائر کی غلامی کی عمر میں اضافے کے باعث ہوں ——— یاد رکھو میری ایک جان کی قربانی سے سو جانیں سو ہتھیلیوں پر پڑی نظر آئیں گی، ان سو جانوں کو بھی اپنی قربانی کی پروا نہیں ہوگی کیونکہ میری جان کی طرح انھیں بھی اپنی پروا نہیں بلکہ الجزائر کی آزادی کی پروا ہے، ان سب کا مقصدِ وحید میری طرح وہی آزادی ہے جس کی خاطر اب تک دس لاکھ شہادتیں پچاسی لاکھ الجزائری باشندوں کو مجاہد بنا چکی ہیں"۔

فوجی سپاہیوں نے جمیلہ کو اور زیادہ باتیں نہ کرنے دیں اور اسے جیل میں ٹھونس دیا۔ حکومت نے باقاعدہ طور پر اس پر مقدمہ دائر کرنے کا پروگرام بنالیا۔

جمیلہ کی تفتیش میں پورا مہینہ فوج نے گذار دیا اور پھر حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے اسی عدالت سے عظیم سزا دلائی جائے جس کے متعلق برصغیر ہند و پاک کے ایک رہنما نے مجسٹریٹ کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ "میدانِ جنگ کے بعد سب سے بڑی بے انصافیاں عدالت کے کمروں میں ہوتی ہیں"...... چنانچہ جمیلہ اسی عدالت کے بلاوے کا انتظار کرنے لگی۔

وہ ایک صبح نماز سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ اسے جیلر کا یہ پیغام ملا کہ ایک فرانسیسی ادیب خاتون اس سے ملنا چاہتی ہے۔

جمیلہ نے اس کی ملاقات پر رضامندی کا اظہار کیا اور پھر اس کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑے ہی وقفے کے بعد ادیب خاتون آگئی جس کے احترام کے لئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آداب بجالائی۔ ادیب خاتون نے کہا

"آپ بہت مہذب دکھائی دیتی ہیں"

اس نے کہا۔ "مگر موجودہ وقت میں مہذب بننا گناہِ کبیرہ سے کم نہیں"

ادیب خاتون نے کہا "خدا آپ کو مصیبتوں سے نجات دلائے، میں آپ کے حالات معلوم کرنے آئی ہوں۔ آپ یقین رکھئے کہ ادیب کبھی جانبدار نہیں ہوتا، وہ ایک فوٹوگرافر ہوتا ہے جس کا قلم حالات و واقعات کی صحیح تصویر کشی کرتا رہتا ہے۔ میں بھی آپ کے حالات کی تصویر لینے آئی ہوں...... اس

خیال سے کہ میرے مجموعے میں صرف ماضی کی نہیں حال کی بھی کہانیاں موجود ہوں۔"

جمیلہ نے کہا۔"پھر تو محترمہ آپ صحیح مقام پر پہنچی ہیں، پھر تو آپ کی رسائی بالکل درست ہے۔ میرا دل میری زبان پر ایسے واقعات لاسکتا ہے کہ ان کی سماعت کے بعد آپ کا قلم بھر اجائے گا۔" جمیلہ نے تیزی سے گریبان کے بٹن کھولنے کے بعد کہا۔"میرے جسم پر زمانۂ حال کی اتنی زیادہ کہانیاں لکھی ہوئی ہیں کہ آپ انھیں یکجا کرنے کی ہمت نہ پاسکیں گی۔" جمیلہ اظہار بیان میں یکدم جذباتی ہوگئی تو ادیب خاتون نے کہا۔"مس جمیلہ آپ ایسی بہادر اور جرأت مند خاتون کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔"

"کیا میں نے ابھی تحمل سے کام نہیں لیا۔" جمیلہ نے ادیب خاتون کی نصیحت پر فوراً آگ بگولا ہوکر جواب دیا۔" صبر و تحمل کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا مجھے ملک کا باغی سمجھ کر سزا دینے کے لئے حکومت کے پاس بندوقوں کی کمی تھی؟ مجھے سزائے موت دے کر وہ اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس نے میرے جسم کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھا اور اس سے کھیلتے رہنے کے بعد اسے بسمل بنانے کا بھی شوق پورا کیا۔ مقدمہ تیار کرنے کے لئے مجھ سے حسبِ منشا بیان رقم کرانے کا جو انتظام کیا اس سے میری وہ انگلیاں پوری طرح واقف ہیں جن میں قلم تھمانے کی ناکام کوشش کے بعد اسے مسلسل ضربیں لگائی گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ فرانس کی مہذب حکومت آخر مجھ سے کس بات کا اعتراف کرانا چاہتی تھی کیا یہ چاہتی تھی کہ الجزائر کی آزادی کے لئے مجھے اپنے اقدامات سے انکار نہ ہو، اگر یہ چاہتی تھی تو کیا گرفتاری کے بعد کوئی لمحہ بھی ایسا آیا جب میں نے اس کا اعتراف نہ کیا ہو۔ میں نے فرانسیسی عدالت کے لیے اپنا مقدمہ اس قدر آسان بنا دیا ہے کہ انھیں میری جانب سے کوئی تکلیف پیش نہ آئے گی۔"

ادیب خاتون نے کہا۔"جب آپ الجزائر کی آزادی کی خواہاں ہیں تو حکومت سے ہمدردی کی توقع نہ رکھیے ہر حکومت اسی طرح کا سلوک کیا کرتی ہے۔"

جمیلہ نے کہا۔" مجھے اس باب میں وقت کے حالات سے شکایت نہیں لیکن پھر حکومت فرانس کو اپنے مہذب ہونے کے دعویٰ سے دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ آپ نے بہت سی کہانیاں لکھی ہوں گی لیکن کیا میں آپ کو ان کہانیوں کا مواد دکھاؤں جنھیں رقم کرنے کے لئے آپ کے قلم کو روشنائی کی ضرورت نہ ہوگی آپ کا قلم اشکبار ہوکر

کرب اور درد کے الفاظ خود بخود لکھتا چلا جائے گا۔"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے سارے کپڑے اتار ڈالے! "محترمہ! یہ وقت میرے شرم کرنے کا نہیں مشاہدہ کرانے کا ہے۔ یہ میری بے بسی اور مجبوری کا وقت ہے۔" جمیلہ نے اپنے جسم کا ایک ایک حصہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھئے مہذب حکومت کے کارندوں کی قابلِ تعریف کارگذاری یہ نشانات جلتے ہوئے سگریٹوں اور دیا سلائیوں کے ہیں، یہ نشانات بجلی کے جھٹکوں کے ہیں، یہ نشانات خنجر آزمائی کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقوبتیں پہنچانے والے سپاہیوں میں چند سپاہی اہلِ قلم بھی تھے جبھی تو وہ میرے جسم کی ہر کیفیت کو ساتھ ساتھ قلم بند کرتے رہے۔ محترمہ آپ مجھے سچی افسانہ نگار معلوم ہوتی ہیں۔ آپ مجھے حالات و واقعات کی صحیح عکاس دکھائی دیتی ہیں، مجھے یقین ہے کہ مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچاتے وقت میں جس جس انداز سے تڑپتی اور بسمل بنتی رہی اگر آپ اس وقت موجود ہوتیں تو اس اس انداز کے مناظر رقم کرنے میں آپ بہت کامیاب ثابت ہوتیں۔ ویسے تو مجھے مہینہ بھر اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ لیکن انسانیت سوزی کے پروگرام پر جو عمل آٹھ روز برابر کیا گیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی، میں کئی بار بیہوش ہو گئی اور ہوش میں لاتے کے لئے میری مدد اسی قدرتِ کاملہ نے کی جسے مجھ نا چیز سے الجزائر کی آزادی کے لئے مزید کام لینا منظور تھا"

جمیلہ کے جسم کو زخمی پاکر فرانسیسی ادیب خاتون توبہ توبہ کر اٹھی اپنے جسم کا ہر حصہ دکھلانے کے بعد اس نے لباس پہن لیا۔ ادیب خاتون کی نظر اس کے داہنے گال پر پڑی اور اس نے اپنے ہاتھ سے اس کا داہنا گال اپنی طرف کیا۔ "یہ حصہ اس قدر سرخ ہے کہ سرخ رنگ سے رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

جمیلہ نے کہا۔ "اس پر پختہ رنگ کرنے کے لئے مسلسل تھپڑ رسید کئے گئے تھے، آپ کی نظر شاید میرے کانوں پر بھی پڑ رہی ہے۔ یہ بھی سرخ ہیں لیکن ان کانوں کی اس قوت سے آپ سوال کر کے دیکھئے جس کے پاس آپ کی کہانیوں کے لئے بہت سا مواد ہے۔ میرے بدن پر چمڑے کے ہنٹر اور لاتیں مارتے وقت اور میرے گالوں پر سر کو بھنا دینے والے مسلسل زوردار تھپڑ رسید کرتے وقت میرے کانوں کو ایسی ایسی شرمناک گالیاں سنائی جاتی رہیں جن کی تاب نہ لاکر میری قوت سماعت جواب دے جاتی رہی۔"

جمیلہ نے اچانک اپنی کمر پر سے کپڑا ہٹا کر کہا۔ "آپ نے شاید اچھی طرح مطالعہ نہ کیا ہو یہ ہے

آپ کے مہذب ملک کے ظلم و ستم کی ناقابلِ فراموش کہانی جو میرے بدن کے روئیں روئیں پر تحریر کی گئی ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیلہ کو رہ رہ کر اپنی گذشتہ اذیتیں یاد آتی ہیں اور وہ چونک اٹھتی ہے، چنانچہ کمر کا حصہ دکھانے کے فوراً بعد اس نے دوسرے حصے بھی دکھاتے ہوئے کہا "محترمہ میں آپ کی ہمدردی کے لئے بہت ممنون ہوں کہ آپ میرا احوال معلوم کرنے یہاں آ گئیں۔ کیا معلوم آپ سے میری دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو، کیا معلوم آج کے بعد ملکِ عدم کو سدھار چکی ہوں اس لئے آپ مشاہدات کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر جایئے۔ یہ دیکھئے میرے ہاتھوں کے زخم یہ دیکھئے میری پنڈلیاں، میری پنڈلیوں کی بناوٹ ایسی نہ تھی مگر زخموں نے ان کا ڈھانچہ بدل دیا ہے۔ یہ سب الجزائر کی آزادی کی اس سچی لگن کے نشانات ہیں جن کا اندمال آزادی مل جانے ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔"

فرانسیسی ادیب خاتون بہت دیر تک خاموش رہ کر آنکھوں اور کانوں سے واقعات و حالات کا مطالعہ کر رہی تھی اب زبان استعمال میں لائی۔ "بہ حیثیت اہلِ قلم مجھے کوئی رائے زنی کرنی نہیں چاہئے لیکن میں آپ کے چشم دید حالات دیکھ کر یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں اہلِ قلم ہونے کی بجائے اہلِ درد ہوئی جا رہی ہوں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں مؤرخ بننے کے ساتھ نقاد اور مبصر بھی ہوتی جا رہی ہوں، مجھے ڈر ہے کہ میرے ہاتھ سے قلم نہ چھن جائے کیونکہ میرا قلم جو کچھ رقم کرے گا اس کا انجام قلم چھین لئے جانے کا منظر دکھائے گا مس جمیلہ! اگرچہ میں فرانسیسی نژاد ہوں لیکن میرا یہ تعلق قومی اور جغرافیائی ہے۔ میں قومی اور جغرافیائی تعلق کے ساتھ حقیقت پسندی کا بھی تعلق رکھتی ہوں اس لئے یہ بیان کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ میری حکومت نے نہایت غیر مہذبانہ مظاہرہ کیا ہے۔ میں نے آپ کی گفتگو سے جرأت مندی بے خوفی اور بہادری کے علاوہ سچائی اور شرافت کی بھی بو سونگھی ہے۔ میں نے آپ کے کریکٹر کو کوہِ گراں کی طرح مضبوط اور اٹل پایا ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اب میں اجازت چاہتی ہوں۔"

فرانسیسی ادیب خاتون وہاں سے رخصت ہو گئی۔ جمیلہ اسے آہنی دروازے تک چھوڑنے کے بعد جب واپس آئی تو اس نے اپنے آپ میں ایک کمی محسوس کی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

" اے جمیلہ تو نے اپنے زخم دکھا کر بالواسطہ طور پر اپنے اضطراب کا اظہار کیا ہے اور تجھ جیسی بلند

خاتون کے دامنِ صبر پر یہ دھبہ بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ تجھے ناگوار سے ناگوار تر حالات سے کوئی شکوہ نہ ہونا چاہئے، تو ایک چٹان ہے چٹان پر ضربیں پڑیں تو کیا چٹان شکوہ سنج بھی ہوا کرتی ہے؟ عنقریب تجھے کمرۂ عدالت میں لے جانے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ وہاں تجھے سزائے موت کے سوا کوئی دوسری سزا نہیں مل سکے گی، اگر تجھے الجزائر کی آزادی کے لئے قربانی کا یہ تحفہ پیش کرنے کی ہمت نہیں تو اسی وقت اپنا ارادہ بدل ڈال، قلم اور کاغذ تیرے پاس اپنے پاؤں چل کر آجائیں گے۔ تو خوشامدانہ انداز میں معافی نامہ لکھ اور حکومت کی مراعات کی مستحق بن جا۔"

جمیلہ اپنی مہمان فرانسیسی ادیب کو الوداع کہنے کے بعد واپس ہوئی تو دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی کھڑی ایک گہری سوچ میں پڑ گئی اور یہ ساری باتیں اسی سوچ کے تصوّر میں اپنے ضمیر سے سنتی رہی۔ آخری فقرہ سننے کے بعد جو طنز سے بھرا ہوا تھا چونک پڑی اور احاطۂ تصوّر سے نکل کر بلند آواز سے پکاری "نہیں ہرگز نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں وہی جمیلہ ہوں قومی تنظیم کی جمیلہ ..... الجزائر کی جمیلہ"

جمیلہ کی یہ آواز سن کر جیل کے کارندے بھاگے بھاگے آگئے اور انھوں نے پوچھا "کیا بات ہے"

جمیلہ نے اصلی حالت میں آ کر جواب دیا "کوئی بات نہیں، میں نے اپنے آپ کو جواب دیا تھا"

ایک کارندہ بولا "کیا اپنے آپ کو بلند آواز میں جواب دیا جاتا ہے؟"

"ہاں" اس نے کہا "انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے۔"

دوسرے کارندے نے کہا "مجھ پر تو کبھی ایسا وقت نہیں آیا —— مجھ پر کیا کسی پر بھی نہیں آیا"

جمیلہ نے زہرخند کے ساتھ کہا ؎

"تو دامن ہی نہیں رکھتا جو الجھیں خار دامن میں —— "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"

اور سب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

اگرچہ ان دنوں الجزائر کے شہروں میں قیامت صغریٰ برپا تھی لیکن انسان بحرانی کیفیت سے سخت اکتا گئے تھے، اس اکتاہٹ کے باعث وہ رفتہ رفتہ خوف وہراس کے عادی ہوتے جارہے تھے۔ واردات ہوتی تو گلیاں، بازار، منڈیاں اور پارک انسانوں سے خالی ہوجاتے، واردات ختم ہوتی تو انسانوں کا ابنوہ گھروں سے نکل کر گلیوں، بازاروں، منڈیوں اور پارکوں کی رونق بن جاتا۔ شروع شروع میں جب کہ مسلمان شہیدوں کی تعداد تین چار لاکھ تک پہنچی تھی، الجزائری مسلمان واردات کے کافی عرصہ بعد تک گھروں میں چھپے رہتے تھے مگر اب عادی ہوجانے کی وجہ سے واردات ختم ہوتے ہی کاروبار زندگی میں فوراً حصہ لینا شروع کردیتے۔ اگرچہ اس طرح خطرے مول لینے میں بعض اوقات جانی اور مالی نقصان بھی اٹھانا پڑتا لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ رِسک لینے ہی میں زندگی ہے ورنہ ڈرنے اور خوف کھانے کی عادت بنا لینے سے انسان شکست خوردہ ذہنیت اختیار کرلیتا ہے۔

جمیلہ بوحائرڈ اور جمیلہ بوہنرہ کی داستانِ الم ان دنوں ہر ایک کی زبان پر تھی، اخبارات میں مجاہدین اور حکومت کی کارگزاریوں کی خبریں شائع ہو رہی تھیں، جمیلاؤں کی مفصّل اور صحیح خبریں اخبارات کے صفحات پر بہت کم نظر آتی تھیں، لیکن اس کے باوجود جتنی اور جیسی خبریں شائع ہوتی تھیں وہ الجزائریوں کے لئے تو کیا دنیا کے کئی ملکوں کے لئے ہوشربا تھیں اور وہ چند خواتین پر بالخصوص جمیلہ بوحائرڈ پر ہوتے ہوئے ان مظالم کو حکومت فرانس کی اخلاقی گراوٹ سے تعبیر کرتے تھے۔ جمیلہ بوحائرڈ الجزائر کی آزادی کے میدان میں پہلی شاہ سوار تھی جس نے روح اور ایمان کی اساس پر اقدامات کا فیصلہ کر کے قدم اٹھایا تھا اور سخت سے سخت امتحانوں میں ذمہ دار شخصیت ثابت ہوئی تھی ورنہ حکومت نے جن غازی خواتین کو گرفتار کیا تھا ان میں درجن بھر ایسی خواتین شامل تھیں جنھیں اگر سیاسی بصیرت کا شعور حاصل نہ تھا تو اپنی جانیں قربان کرنے کا والہانہ جذبہ ضرور موجود تھا۔ ان میں سے کئی خواتین پر ایسے ایسے ظلم روا رکھے گئے جنھوں نے ان کے ہوش حواس کھو دئے۔ جمیلہ بوہنرہ انھیں خواتین میں ایک بیس سالہ نوجوان خاتون تھی جسے فوج نے دوسرے مظالم کرنے کے ساتھ یہ ظلم کیا کہ اسے نشہ آور دوائیں کھانے پر مجبور کر دیا۔ ان دواؤں کے استعمال کا یہ اثر ہوا کہ اس کا ذہنی توازن قائم نہ رہا۔

یہ سارے حالات اخبارات کے ذریعے ساری دنیا کو بالعموم اور الجزائر کے باشندوں کو بالخصوص معلوم ہوتے رہتے تھے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکل رہا تھا کہ الجزائری مسلمانوں کی سیاسی تگ و دو میں پہلے سے زیادہ بے خوفی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ پُرامن گھر، جو غلامی کے سابقہ دور میں سیاسی جدوجہد کے نام سے بھی ناواقف تھے اور حکومت کی ذرا سی جنبش سے پریشان ہو جاتے تھے، اب گویا سیاسی دفتروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ زبیدہ کا گھر بھی ایک سیاسی دفتر سے کم نہیں تھا جہاں کا ہر فرد سیاسی حالات و واقعات پر ہر وقت تبصرہ کرتا رہتا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ الجزائر کی آزادی کے لئے جدوجہد کی عملی لگن صرف عقیل اور زبیدہ جیسوں کو تھی۔ شہر کی تعلیم گاہوں کا آن کل یہی حال تھا کہ کبھی کھل جاتیں اور کبھی بند ہو جاتیں تھیں مقامی امن ہوا تو مقامی درسگاہیں کھل گئیں، مقامی امن نہ رہا تو یہ بھی یقین کر لیا گیا کہ درسگاہیں بھی بند ہیں الجزیرہ کے جو جو حصے حملوں سے متاثر ہوتے تھے، کاروبار اور درسگاہیں بند کر دیتے تھے۔ آج کل زبیدہ کی درسگاہ کھلی ہوئی تھی اور وہ باقاعدہ حاضری دے رہی تھی۔ ابھی تک اس کا تعلق عقیل کے ساتھ نہ تو

ایسا قائم ہوا تھا کہ وہ بربھائین کے تعلقات اس کے ساتھ قائم رکھنے پر کھل کر شکایت کر سکے اور نہ تعلق بالکل ناپید تھا کہ بربھائین کے ساتھ ملنا اس کے لئے ناگوار خاطر ہی نہ ہو۔ اسی لئے وہ اس کشمکش میں ضرور مبتلا رہتی تھی اور اپنے دل میں ڈرڈر کر کہتی تھی کہ "کہیں عقیل کا دل بربھائین کے ساتھ ——" وہ اس خیال کو اپنے دل میں کاملاً لانے کی بھی ہمت نہ پاتی تھی۔ اس نے جس روز لفظ "محبت" لکھ کر ایک کاغذ عقیل کی نظر میں لانا چاہا تھا، اس روز وہ واشگاف انداز میں جواب کی طالب تھی لیکن اس جواب کے راستے میں اچانک بربھائین حائل ہو گئی تو اس کی کش مکش میں بھی اضافہ ہو گیا۔ البتہ اس کا خفگی قائم رکھنے کے فوراً بعد اس سے کنارا کش ہو جانا اس لئے ضروری تھا کہ اس کے بغیر ان کی محبت کے پول کھل جانے کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے دل پر جبر کر کے عقیل کی بے تکلف سی خدمت گذاری میں لگی رہی۔

آج کل اخبارات میں جمیلہ بوحائرڈ پر مقدمہ چلانے کے متعلق بہت سی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ یہ دن ۱۹۵۷ء کے آخر کے تھے۔ اس وقت جنرل سالان الجزائر میں مقیم فرانسیسی افواج کا سپریم کمانڈر تھا۔ ۱۹۵۶ء میں موے فرانس کا وزیراعظم بنا تھا تو اس نے جنرل سالان کو الجزائر میں اس عہدے پر فائز کیا تھا، یہ وہی جنرل سالان ہے جسے ۱۶ جنوری ۱۹۵۷ء میں فاشسٹوں کی ایک خفیہ تنظیم نے گولی مار کر ہلاک کر دینا چاہا مگر بال بال بچ گیا تھا۔

ان دنوں الجزائر کی آزاد حکومت قائم کرنے کے متعلق رہنمایانِ تحریک آزادی کے ساتھ حکومتِ فرانس کی بات چیت ہو رہی تھی۔ مجاہدین اور رہنماؤں کو فرحت عباس کے یہ الفاظ ہر وقت یاد تھے کہ "ایک کروڑ غلاموں سے ایک کروڑ لاشیں بہتر ہیں"۔

زبیدہ کو نور کے تڑکے اخبارات کا انتظار ہوتا۔ اخبار آتے تو وہ شروع میں جلد جلد ان کی سرخیاں پڑھ کر یہ معلوم کرنا چاہتی کہ جمیلہ بوحائرڈ کے متعلق آج کی تازہ خبر کیا ہے۔ اخبارات نے جب جمیلہ کے مقدمے کے بارے میں خبر دی تو زبیدہ چونک اٹھی۔ اس وقت وہ اپنے خیال میں غلطاں تھی، اچانک بے اختیار بولی "اے کاش میں عدالت میں جا کر جمیلہ بوحائرڈ کا مقدمہ سن سکوں"۔

اتفاق سے پاس کرامت کھڑا تھا، بولا "زبیدہ صاحبہ واقعی آپ کو اپنے وطن سے بڑی محبت ہے"

"آپ پر یہ کیسے ثابت ہوا" اس نے پوچھا۔

اس پر کرامت نے جواب دیا "آپ کی زبان سے بے اختیار جمیلہ کا مقدمہ سننے کے جو الفاظ نکلے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے وطن سے بہت محبت ہے۔ جمیلہ بوحائرڈ الجزائر پر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہے اور آپ کو ایسی جاں فروش خاتون کا مقدمہ سننے کا خیال آیا۔ میں آپ کو بتاؤں، آپ عدالت میں نہ جائیے گا۔ آپ بعض اوقات جذباتی ہو جاتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ جمیلہ کے خلاف فیصلہ سنتے وقت آپ جمیلہ ثانی بن کر بھڑک اٹھیں گی۔"

زبیدہ نے کہا "یہ کیا ضروری ہے کہ جمیلہ اپنے مقدمے میں شکست کھا جائے گی۔"

کرامت نے ہنس کر کہا "زبیدہ بہن! آپ نے یہ کیسی بات کہی، جس عدالت کی کارروائی سننے کے لئے آپ بے قرار ہیں اس عدالت سے انصاف کی توقع کہاں ہو سکتی ہے۔ عدالت تو ملکی سیاست کے اشاروں پر چلتی ہے۔ ان عدالتوں میں قاتلوں کو تو رہائی مل سکتی ہے مگر بے گناہوں کی سزائے موت کبھی نہیں رک سکتی۔"

زبیدہ نے کہا "کرامت بھائی آپ نے یہ درست فرمایا کہ عدالت ملکی اشاروں پر چلتی ہے ......

آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے مگر اسی حقیقت کی روشنی میں مجھے امید ہے کہ جمیلہ سزائے موت نہیں پائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومتِ فرانس حریت پسندوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے لیکن جس حکومت کو یہ معلوم ہے کہ دس لاکھ شہادتوں کے بعد بھی ساٹھ ستر ہزار مسلمان غازی بن گئے ہیں وہ جمیلہ کو آسانی سے سزائے موت نہیں دے سکتی۔ جمیلہ کے جلو میں حکومت جانتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کا پھیلا ہوا وسیع و عریض سمندر ہے۔ جو اپنی حدود توڑ کر حکومتِ فرانس کو تنکوں کی طرح بہائے جا سکتا ہے۔"

کرامت نے کہا "حکومت نے اب تک جو مظالم جمیلہ بوحائرڈ اور جمیلہ بوشرہ کے علاوہ دوسری درجن بھر خواتین پر کئے ہیں۔ کیا اسے معلوم نہ تھا کہ الجزائر کا کوئی مسلمان اسے گوارا نہ کر سکے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اسے گوارا کرنے پر مجبور ہوئے، اسی طرح اس کی سزائے موت کو بھی جو خدا کرے اسے نہ ملے مسلمان روتے دھوتے برداشت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

عقیل جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا بولا "کرامت بھئی میری تائید زبیدہ کے ساتھ ہے۔"

عقیل کے اچانک بولنے پر زبیدہ چونکی مگر اس نے چونکنے کا احساس نہ ہونے دیا۔ کرامت کو مخاطب کر کے بولی "ہو سکتا ہے۔ آپ کا خیال صحیح ہو لیکن میرے نزدیک حالات کا تقاضا یہی ہے کہ جمیلہ کو سزائے موت نہ مل سکے گی۔"

عقیل نے کہا "اس پر کوئی شرط لگ جائے تو لطف پیدا ہو جائے، میں زبیدہ کی طرف سے سو فرانک شرط لگاتا ہوں۔"

یہ فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ عزیزہ برقعہ پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ "کیسی سو فرانک کی شرط؟"

عقیل نے جواب دیا "کرامت کا خیال ہے کہ جمیلہ بوحائرڈ کو سزائے موت ہوگی اس کے مقابلے میں زبیدہ کا اور میرا خیال یہ ہے کہ نہیں ملے گی اس پر میں شرط لگا رہا ہوں کہ اگر زبیدہ کا خیال درست ثابت نہ ہوا تو میں سو فرانک کرامت کو دوں گا۔"

عزیزہ نے زبیدہ پر نظر ڈالی تو وہ اس طرح سر نگوں کئے ہوئے تھی جیسے سب سے روٹھی ہوئی ہو عزیزہ نے اپنے بھائی عقیل کی طرف شرارت سے دیکھا تو وہ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا "اچھا یہ بات ہے، جرمانہ کسی طرف سے ادا کرنا ہوگا ہی نا تو پھر یا تو میں کرامت بھائی سے پچاس فرانک کی مٹھائی کھاؤں گی یا پھر عقیل اور زبیدہ سے۔"

زبیدہ کا نام لینے کی دیر ہی تھی کہ وہ چونک سی پڑی اور اس نے کنکھیوں سے عزیزہ کی طرف دیکھا عزیزہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس منظر کی تاب نہ لا کر زبیدہ کمرے سے نکل گئی۔

عزیزہ نے عقیل سے کہا "بھائی جان! آپ بہت شریر ہو گئے ہیں میں واپس آ کر آپ کی خبر لوں گی۔ چلئے کرامت بھائی شاپنگ کرائیں چچی جان کپڑا خریدنا چاہتی ہیں۔"

کرامت نے کہا "تو پھر گھر میں کون رہے گا؟"

عزیزہ نے جواب دیا۔ "زبیدہ اور اس کے والد۔"

کرامت نے کہا "کیا وہ آ گئے ہیں؟ میں سمجھا کہ عقیل بھائی کی خدمت کے لئے صرف زبیدہ ہی موجود ہے۔"

کرامت کے اس جملے پر سب نے قہقہہ بلند کیا اور پھر عزیزہ کرامت اور زبیدہ کی والدہ کو ہمراہ لینے کے لئے اندر چلے گئے۔

آج زبیدہ کے والد تھک کر گھر آئے تھے، انھوں نے زبیدہ کو آواز دی اور پھر جب وہ آگئی تو اس سے بدن دابنے کو کہا۔ چونکہ وہ بہت تھکے ماندے تھے اس لئے پندرہ بیس منٹ میں گہری نیند سو گئے اور پھر زبیدہ نے انھیں دابنا چھوڑ دیا کہ کہیں جاگ نہ اٹھیں۔

ان دنوں عقیل کو کافی افاقہ تھا۔ وہ بستر پر بیٹھنے کی جرات تو کر لیتا تھا لیکن ابھی اتنی ہمت نہ تھی کہ دو قدم چل بھی سکے عقیل چند روز سے خیال کر رہا تھا کہ اسے اب اتنی کمزوری لاحق نہیں جتنی اس میں جھجک پائی جاتی ہے۔ اس نے دو تین بار زبیدہ کو آواز دی لیکن وہ نہ آئی آخر اس نے آہستہ آہستہ چارپائی سے اترنے کی کوشش شروع کی کوئی پندرہ منٹ کے بعد کامیاب ہوا وہ جب سے صاحب فراموش ہوا تھا تب سے یہ اس کا پہلا موقع تھا کہ اس کے پاؤں زمین کو چھو رہے تھے۔ اس نے کھڑے کھڑے ہاتھ پھیلا کر خدا کا شکر ادا کیا کہ قدرت نے اسے چارپائی سے اترنے کی طاقت بخش دی ہے۔ اس ادائے شکر کے ساتھ اس کی پلکیں بھی فرط تشکر سے بھیگ گئیں۔ اگرچہ اس کی ٹانگیں کمزوری کی وجہ سے کانپ رہی تھیں مگر اس کے دل کا فیصلہ گریز اختیار کرنے کا نہ تھا۔ وہ جوں کی چال چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ سامنے کے کمرے میں زبیدہ کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کرسی کا منہ سامنے کی جانب تھا۔ اس کمرے کے داہنی جانب والے متصلہ کمرے کو چھوڑ کر دوسرے میں زبیدہ کے والد لیٹے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ عقیل بمشکل تمام سوچ سوچ کر قدم رکھتا ہوا منزل مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ چونکہ اس کے پیروں میں جوتی نہ تھی اس لئے اس کے قدموں کی چاپ چپ چاپ تھی۔ زبیدہ اگرچہ کتاب کے لفظوں میں عقیل ہی کی صورت دیکھ رہی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ صورت تصور کی حدود سے نکل کر اصلیت کی حدود میں داخل ہونے والی ہے۔ عقیل اپنے کمرے سے نکل کر چار پانچ قدم اٹھانے میں کامیاب ہو گیا درد کی وجہ سے اس کے منہ سے ہائے کا لفظ نکلنے لگتا مگر وہ زہر لب سمجھ کر پی جاتا۔ دسویں گیارھویں قدم کے بعد اسے مزید چلنے کی ہمت نہ رہی اور وہ مجبور ہو کر نہایت آہستگی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے خیال کیا کہ بجائے منزل پر پہنچنے کے اب وہ منزل ہی کو

اپنے پاس بلائے لیکن اسے اچانک پاکستانی قومی شاعر علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آگیا ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصے تمام

اس زمین و آسماں کو بےکراں سمجھا تھا میں

اس نے اپنے دل سے کہا "اس میں شک نہیں کہ جسم میں طاقت نہیں لیکن عشق میں تو طاقت موجود ہے بلکہ عشق خود ایک زبردست طاقت ہے یہ سوچتے ہی آپ ہی آپ اس میں طاقت بھر گئی جس کے سہارے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پہلے کی نسبت جلد جلد قدم اٹھانے لگا، پھر بھی اسے زبیدہ کے کمرے کے نزدیک پہنچنے میں بہت دیر لگی۔

سامنے دیوار پر شیشے کے ایک بڑے چوکھٹے میں احمد بن بااللہ کی فوٹو آویزاں تھی اس پر زبیدہ کی اچانک نظر پڑی تو دھندلا سا سایہ نظر آیا۔ اس نے جلدی سے پیچھے کی طرف دیکھا تو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھی منزلِ مقصود کو پالینے کے لئے راہِ عشق میں ایک یہ مقام تھا کہ وہ عقیل کو ایک جست میں پہنچانا چاہتی تھی۔ اور ایک یہ کہ منزل خود چل کر آگئی۔ مگر اس طرح طاقت نے جواب دے دیا۔ بظاہر یہی معلوم ہوا کہ عقیل اتنے دور دراز کا راستہ طے کرتے کرتے اس قدر تھک ہار گیا ہے کہ گر جانا قدرتی ہے۔ زبیدہ نے شرم وحیا اور خفگی کو نظر انداز بلکہ فراموش کر کے عقیل کے گرتے ہوئے جسم کو اپنے بازوں کا سہارا دے دیا۔

"آپ نے یہ کیا غلطی کی؟"

عقیل کی زبان سے اتفاقاً نکلا "اس لئے کہ آپ کے سہارے کی ضرورت تھی"

اب حسن نے شکایت کا موقع نکال لیا "جب ایک سہارا موجود ہے تو دوسرے کی کیا ضرورت ہے"

عقیل کی جسارت بڑھ گئی "میرا کوئی دوسرا سہارا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پہلا سہارا خدا کا ہے اور دوسرا ناخدا کا"

"آپ کا ناخدا موجود جو ہے" زبیدہ نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔ "بس اس کو مسلمان بنانے کی دیر ہے"

عقیل نے کہا "میرا ناخدا مسلمان ہے اور اس کا نام بریتھائین نہیں زبیدہ ہے"

بات کرتے کرتے عقیل کو پسینہ آگیا اور وہ اپنے بستر کی طرف لے چلنے کو کہنے لگا۔ حسن کی خودداری نے زبان سے معذرت نہ کرنا چاہی مگر اس کا دل اس سے کہنے لگا۔ "زبیدہ تو بڑی ظالم ہے ...... بچارے عقیل کا کمزوری کی وجہ سے بُرا حال ہوگیا ہے، تجھے شرم آنی چاہیئے۔" مگر تھوڑی دیر بعد وہی دل اپنے آپ سے یہ کہنے لگا۔ "یہی تو موقع تھا بات کرنے کا بھلا اور کونسا موقع ہوسکتا تھا۔"

زبیدہ نے آج سچ مچ عقیل کو سہارا دے دیا۔ عقیل اپنا داہنا بازو گلے میں ڈال کر زبیدہ کا سہارا لیتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ زبیدہ نے کہا۔ "جلد قدم اٹھائیے۔"

عقیل نے چور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا کروں کمزوری کے باعث چلا نہیں جاتا۔"

"کوشش تو کیجے۔"

"کر تو رہا ہوں مگر کی نہیں جاتی۔"

"کیا نہیں کی جاتی؟"

"کوشش"

زبیدہ شرما گئی۔

"ابا جان جاگ اٹھے تو پھر؟"

"پھر ان سے کہہ دوں گا کہ زبیدہ اب سہارا بنی ہے تو اسے ساری عمر کے لئے بنا رہنے دیجے۔"

"آپ کے گر جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں کب کی بھاگ گئی ہوتی۔"

"لیکن بھاگ کر جائیں کہاں؟"

"کیا آپ جلد چلنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟ میرے سہارے کا پھر کیا فائدہ ہوا؟"

"یہی تو فائدہ ہے کہ ساتھ دیر تک رہے گا۔"

"کیا اس کے بعد نہ ہوگا؟"

"اس کے بعد سفر کا قیام ہوگا۔"

"اور قیام کے بعد؟"

"ہم دونوں کا اِس گھر سے سفر۔"

"اوئی اللہ آپ بڑے عجیب ہیں۔ مجھے تو آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

"ایسا ہی بُرا ہوں تو سہارا چھوڑ دو۔"

"ہاں تاکہ آپ دوسرا سہارا پکڑ لیں۔"

عقیل نے کہا۔"زبیدہ تمہیں یہ کیا وہم ہوگیا ہے۔ اطمینان سے بستر پر لیٹوں گا تو برتھائین کا سارا قصہ سناؤں گا۔ اب مختصر طور پر اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری قربت کی قسم میرے دل کے کسی گوشے میں بھی برتھائین کے لئے محبت کی جگہ نہیں۔ محبت کی جگہ ہے تو صرف تمہارے لئے ———— البتہ برتھائین کا میں دل نہیں توڑنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی محبت کے زخم کو رفتہ رفتہ مندمل کروں، بس یہی میری کمزوری ہے کہ میں اسے دو ٹوک اور واضح جواب نہیں دینا چاہتا۔ کیونکہ میں نے ایسا کیا تو وہ اسی روز خودکشی کرے گی۔ تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو اب جب وہ آئی تو تمہاری خاطر دو ٹوک جواب دے دوں گا پھر تم خود دیکھو گی کہ وہ اسی روز سولی پر چڑھ جائے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ ٹھہر کیوں گئے ہیں۔ چلئے نا۔" زبیدہ نے بات بھلانے کے لئے کہا۔

عقیل بولا۔"معلوم ہوتا ہے کہ میرا گھر قریب آگیا ہے۔ صرف ایک میل باقی ہے۔"

زبیدہ نے ہنس کر کہا۔"یعنی ایک قدم باقی ہے۔"

واقعی بستر تک پہنچنے میں ایک قدم رہ گیا تھا۔ عقیل نے شرارت سے کہا۔"کیا میں یہاں کچھ دیر دم لے لوں۔"

اور زبیدہ جس کو محبت کے رنگین سفر نے چنچل بنا دیا تھا، بولی۔"آپ کو زیادہ باتیں بنانے کی اجازت نہیں۔ سیدھی نیت سے اپنے بستر پر چلے جایئے۔"

"بہت بہتر۔" عقیل نے جواب دیا۔"ایسی ہی بے رخی ہے تو جایئے۔ ع

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا

میں خود ہی بستر پر پڑ جاتا ہوں۔"

زبیدہ کو ترس بھی آیا اور خیال بھی، عقیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر نہایت احتیاط سے بستر پر ڈالتے ہوئے کہا

"مجھے یہ ہرگز منظور نہیں کہ آپ مجھ ناخدا کا احسان اٹھانے کی بجائے کسی دوسرے ناخدا کا احسان اٹھائیں"

یہ جملہ چونکہ بہت منجاوز قسم کا تھا اور تیر کی طرح نکل گیا تھا اسلئے اس کے ردِ عمل کی شرم سے بچنے

کے لئے وہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اب اسے بن باللہ کی فوٹو کا چوکھٹا بہت ہی پیارا

معلوم ہونے لگا کیونکہ اسی میں عقیل کا دھندلا سا نقش نظر آیا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ کرسی رکھ

کر اور اس پر چڑھ کر بن باللہ کی تصویر کو چوم لیا۔

اس غیرارادی کیفیت کے عمل سے جب واپس ہوئی تو اسے اس تصویر کا چومنا بہت معنی خیز

معلوم ہوا۔ ایک ذاتی معاملہ کی دلآویزی کی وجہ سے دوسرے قومی احساسات کے لگاؤ کے باعث۔

گویا اس نے بہ یک وقت اپنے قومی مقصد اور ذاتی مقصد سے محبت کا اظہار کیا۔

اس عمل کے بعد وہ اپنی کرسی دیوار سے ہٹانے ہی کو تھی کہ شاپنگ کر کے زبیدہ کی والدہ کرامت

اور عزیزہ آ گئے۔ والدہ اور عزیزہ نے برقعے اتار کر ہینگروں پر ٹانگے اور کپڑوں کا لفافہ لے کر زبیدہ کے کمرے

کو چل دیئے۔ "بیٹی آؤ تمہیں کپڑے دکھائیں۔ آج ایسی اچھی شاپنگ کی ہے کہ تم داد دیئے بغیر نہ رہو گی۔"

عقیل کے کمرے میں زبیدہ کی والدہ اور عزیزہ پہلے ہی جا کر کوچ پر بیٹھ گئی تھیں۔ کرامت بھی کپڑے

بدل کر تھوڑی دیر میں کرسی پر آ بیٹھا۔

زبیدہ کی والدہ نے زبیدہ کو آواز دی تو اس نے کہا "میں ابا جان کو ساتھ لا رہی ہوں۔"

چنانچہ اس کے والد آنکھیں ملتے ہوئے آ پہنچے اور گرتے پڑتے کرسی پر بیٹھ گئے۔ "نیند بھی اچھی

چیز ہے۔" انھوں نے کہا۔ "مگر اس سے زیادہ اچھی چیز کپڑے ہیں۔"

جلیل صاحب کے اس فقرے پر اور اس فقرے کی ادائیگی پر سب ہنس دیئے۔ کرامت کہنے لگا

"چچا جان! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت زیادہ تھک کر آئے ہیں۔"

"ہاں بیٹا مگر کپڑوں کا دیدار تکان کو دور کر دے گا۔"

سب دوسری بار ہنس پڑے۔ جلیل صاحب نے مزید کہا "واقعی آج میں اس قدر تھک کر آیا تھا

کہ اگر میری بیٹی میرے بدن کو مسلسل داتبتی نہ رہتی تو میری تکان کبھی دور نہ ہوتی۔ اور میں گہری نیند کبھی نہ سوتا

یہ تو میں مذاق سے بات میں سے بات پیدا کر رہا تھا۔ اب میں حقیقتاً اٹھنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کپڑے دیکھ لینے

کے بعد قہوے کی حسین وجمیل پیالیوں کا بھی دیدار کرایا جائے گا۔"

عقیل نے کہا۔"چچا جان! کیا صرف پیالیاں؟"

جلیل صاحب نے کہا۔" برخوردار میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں لیکن میں نے قہوے کی حسین وجمیل پیالیوں

کا ذکر کیا ہے اس سے مراد ایسی ہی پیالیاں ہیں جو قہوے سے لبریز ہوں۔"

اس تفریح نے لطافتِ گفتگو سے سب کو ہمکنار کیا۔ زبیدہ بولی۔"ابا جان! آپ کی گفتگو قہوے

سے زیادہ لذیذ ہے۔"

والد فوراً بولے۔" لو بھئی قہوے کی جو تھوڑی بہت امید تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اب آپ کپڑے

دکھایئے۔"

اس جملے پر کمرہ زعفران زار بن گیا زبیدہ کی والدہ نے کہا۔" آپ مرے کیوں جارہے ہیں قہوہ

مل جائے گا۔ لیجئے یہ قمیص کا کپڑا دیکھئے میں نے عقیل کے لئے خریدا ہے۔"

عقیل نے فوراً کہا۔"چچی جان! یہ کیا؟

اور چچی نے بات پوری نہ کرنے دی۔" میری بات میں کچھ نہ بولا کرو، کہو بیٹی کیسا کپڑا ہے؟"

زبیدہ کیسے جواب دیتی اور کیسے نہ دیتی، کچھ بے تکلفی سے اور کچھ جھجک کے ساتھ بولی۔"خوب ہے۔"

جلیل صاحب بھی کہنے لگے۔"خوب کیا۔ بہت ہی خوب ہے۔"

عقیل نے کہا۔"خوب بھی ہے اور بہت خوب بھی ہے۔ میری رائے میں نہایت خوب بھی ہے۔

اگر آپ لوگوں نے منع نہ کیا ہوتا تو میں شکریہ ضرور ادا کرتا۔"

اس پر سب ہنس دئے اور زبیدہ جھینپ سی گئی۔ عزیزہ کی نظر اس وقت زبیدہ پر پڑتی رہی اور نظروں

کے اس حملے سے بچنے کے لئے زبیدہ نے مسلسل اپنی نظروں کو ٹکرانے سے بچائے رکھا، یہاں تک کہ عزیزہ

کے مختصر سے سوال کا جواب بھی نظریں ادھر ادھر کر کے دیتی رہی

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جلیل صاحب قہوے کی یاد دہانی کراتے رہے مگر آج پہلا موقع تھا کہ شرم اور جھجک کے باوجود زبیدہ کا اس کمرے سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

زبیدہ کی والدہ نے زبیدہ، عزیزہ، کرامت کے علاوہ جلیل صاحب کے لئے خریدے ہوئے کپڑے دکھائے جنھیں سب نے پسند کیا۔ پسندیدگی کے دوران اظہار میں جلیل صاحب نے کہا۔ "زبیدہ کہو تم قہوہ تیار کرو گی یا میں خود جا کر کروں؟"

عزیزہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باورچی خانے کو بھاگ گئی اور چولھا روشن کر کے اس پر پانی کی کیتلی رکھنے کے بعد پھر اسی کمرے میں آگئی۔

کپڑوں کا تذکرہ ختم ہوا تو عقیل کو شرارت سوجھی۔ کہنے لگا۔ "چچا جان میرا خیال ہے اگر میں آج چارپائی سے اترنے کی کوشش کروں تو ایک دو قدم ضرور چل سکوں گا۔"

اس ذکر سے زبیدہ کا برا حال ہوا، شرم اور خوشی کی وجہ سے اس کے چہرے پر کتنے ہی رنگ آئے اور گئے، اس چور کیفیت کو ہر کوئی بھانپ سکتا تھا لیکن اس وقت کسی کو بھانپنے کی ضرورت نہ تھی، جس کو ضرورت تھی وہ دو چار منٹ میں بھانپ چکا تھا جبھی تو وہ اس کی خوش کن پریشانی کا تماشا کرنے میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔"

جلیل صاحب نے عقیل کو ایک طرح سے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ کیا کہا بیٹا! ابھی تمہیں چارپائی سے بالکل نہیں اترنا چاہیے۔ طاقت بھر گئی تو دو تین ماہ بعد اٹھنے کی اجازت ملے گی، ابھی سے اٹھنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ۔"

زبیدہ کی والدہ نے بھی تائید کی۔ "نہیں نہیں ایسی ہرگز جرأت نہ کرنا، اس سے تمہاری تکلیف میں خدانخواستہ اضافہ ہو جائے گا۔"

کرامت اور عزیزہ بھی بول اٹھے۔ "بھائی جان ایسا کبھی نہ کیجے گا۔"

زبیدہ نے خاموش رہنا پول کھل جانے کی علامت سمجھا اس لئے وہ بھی بولے بغیر نہ رہی "بھائی جان! آپ کو یہ خیال آیا ہی کیوں؟"

عقیل نے جواب دیا۔ "صرف اس وجہ سے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں چارپائی سے نیچے اتر کر آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کر رہا ہوں، میں نے سوچا، خواب کا یہ واقعہ قدرت کی طرف سے اس بات کا اشارہ نہ ہو کہ مجھے اب ہمت کرنی چاہیے۔"

عقیل کے اس جواب نے زبیدہ کو اس قدر پریشان اور ہراساں کیا کہ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں قہوہ تیار کر کے لاتی ہوں۔"

۲۳

عقیل نے تو مذاق کرتے ہوئے چارپائی سے اترنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جس پر سبھی نے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا لیکن سب کا مشورہ ثابت بھی صحیح ہوا کیونکہ اسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک چلنے کے بعد جسم کے مختلف حصوں میں شدید درد شروع ہو گیا۔ وہ اس درد کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کسی نہ کسی وقت اس کی بے چینی اس کی تکلیف کا پتہ دے ہی دیتی تھی۔

چونکہ اس حلقے میں کافی عرصہ سے امن رہا اس لئے زبیدہ سکول میں باقاعدگی کے ساتھ جاتی رہی۔ سکول میں بھی آج کل جمیلہ بوحائرڈ پر چلنے والے مقدمہ کا تذکرہ جاری تھا۔ سکول کے اساتذہ کا بھی یہی خیال تھا کہ جمیلہ کو سزائے موت نہیں ہو گی۔ وہ اپنے خیال کی تائید پا کر خوش تھی اور دل کے ایک گوشے میں یہ خوشی بھی جاگزیں تھی کہ یہ صرف اس کے خیال کی تائید نہیں بلکہ اس کی طرف سے سو فرانک شرط لگانے والے عقیل کی بھی تائید ہے خیال اور رائے کی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی اس کے دل و دماغ پر بہلو

چھائی رہتی تھی۔ اسے جب ان دنوں تنہائی میں عقیل سے ملنے کا موقع میسّر آتا تو وہ بے تکلفی کے انداز میں اسے خفا ہوتے ہوئے کہتی "آپ نے خواہ مخواہ مجھے ملنے کے لئے میرا نقصان کر دیا یعنی آپ پھر بیمار ہو گئے"۔

اور عقیل کہتا۔ "اِس بیماری پر میں اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوں جس نے مجھے تم سے ملا بھی دیا اور تمہارے شکوک بھی رفع کر دئیے۔ اپنی تکلیف تو دو چار دس روز نہیں تو دو چار مہینوں میں دُور ہو جائے گی"۔

چنانچہ جب دو چار مہینوں سے کچھ زیادہ کا عرصہ گذرا تو ڈاکٹر نے چارپائی سے اتر کر صرف دو دو قدم چلنے کی اجازت دے دی۔ عقیل نے کہا۔ "اگر میں دو سے دو کو ضرب دے دوں تو پھر؟"

اور ہنس مکھ ڈاکٹر جواب دیتا۔ "تو پھر دو کو دو پر تقسیم کر دو"۔

چنانچہ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کر کے اس نے دو سے زیادہ قدم نہ اٹھائے۔ درحقیقت اسے اب دو سے زیادہ قدم اٹھانے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ جس منزلِ مقصود کو پانے کے لئے اسے دو سے زیادہ قدم اٹھانے کی ضرورت تھی وہ منزلِ مقصود اب دو قدموں سے بھی قریب آگئی تھی۔ البتہ وہ اپنی منزلِ مقصود کو یہ کہہ کر ڈراتا ضرور رہتا تھا کہ "اگر تم میرے نزدیک نہ رہیں تو پھر مجھے اقدام کرنا پڑے گا"۔

اس کے جواب میں منزلِ مقصود ہاتھ باندھ کر عرض کرنے لگتی۔ "تکلیف نہ اٹھائیے گا میں پاس ہی رہوں گی"۔

خدا تعالیٰ نے عقیل کو اپنے فضل سے ایک تو زبیدہ اور اس کے ماں باپ کی بے لوث خدمت کی بدولت تندرست کیا اور دوسرے خود عقیل کے مسلسل پرہیز اور احتیاط نے۔ اگر وہ جنونِ عشق سے مجبور ہو کر "دور دراز" کا سفر نہ اختیار کر چکا ہوتا تو کئی مہینے پہلے اسے کامل طور پر آرام آگیا ہوتا۔ اب وہ کمرے اور صحن میں چل پھر لیتا تھا ڈاکٹر نے پورا آرام حاصل کرنے کے لئے یہی ہدایت کر رکھی تھی کہ تندرست ہوتے ہوئے بھی ابھی اپنے آپ کو مریض ہی سمجھا جائے۔ چنانچہ عقیل اپنے لئے، اپنے بھائی بہن کے لئے اور خاص طور پر اپنی زبیدہ کے لئے اپنی تندرستی کا اب زیادہ خیال رکھنے لگا۔

ایک وہ دن تھے جب کہ زبیدہ عقیل کی محبت میں مبتلا ہو کر عیسائی خاتون برنھائین کی رقابت کے باعث سخت کشمکش میں گرفتار تھی اور اس کی یہ کشمکش اسے سیاسیات کے مطالعہ کا موقع نہ دیتی

تھی ــــــ اور ایک دن یہ آئنے کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کی "طویل" مسافت نے اس کے تمام شکوک رفع کرا دئے جس سے اطمینان ہو جانے کی وجہ سے اس کی توجہ اب پھر سیاسی معاملات کی طرف مبذول ہونا شروع ہو گئی۔ شکوک رفع ہونے کے فوراً بعد اس کی زبان پر یہ الفاظ آگئے "آج کل جمیلہ کا مقدمہ شروع ہونے والا ہو گا" ــــــ اور یہ صحیح بھی تھا کہ ان دنوں جمیلہ کا مقدمہ آغاز پذیر ہونے والا تھا۔

الجزائر کے علاوہ مراکش، تیونس بلکہ فرانس میں بھی دس تاریخ کا شدید سے انتظار تھا جب کہ مجسٹریٹ کے روبرو جمیلہ کھڑی ہو گی۔ چنانچہ تاریخ مقررہ ہوئی تو عوام و خواص وقت سے بہت پہلے عدالت سے باہر جمع ہو گئے۔ انتظار کر کر کے لوگوں کی آنکھیں تھک گئیں لیکن جمیلہ ابھی عدالت میں نہ آئی تھی۔ لوگ عجیب و غریب وہموں میں گرفتار ہو گئے "کیا معلوم جمیلہ کی تفتیش ابھی تک جاری ہو" ــــــ "کیا معلوم جمیلہ جیل سے بھاگ گئی ہو" ــــــ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک گاڑی عدالت کے نزدیک آکر رکی۔ اس میں سے پہلے پولیس کے چند سپاہی نکلے اور پھر ایک نوجوان صحت مند لڑکی جس کے چہرے پر خراشیں آئی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پبلک نے نعرہ لگایا "جمیلہ بوحائرڈ زندہ باد" ــــ اور جمیلہ مسکراتی ہوئی عدالت کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

مجسٹریٹ نے پہلی تاریخ پر مقدمہ کے مبادیات تیار کرائے اور جمیلہ پر حکومتِ فرانس کی باغی ہونے کا الزام لگایا۔

کئی پیشیوں کے بعد ایک پیشی بہت اہمیت اختیار کر گئی۔ حکومت نے جمیلہ کے کورٹ مارشل کے دوران استغاثہ کی طرف سے تین گواہوں کا انتظام کیا۔ ان گواہوں میں ایک خاتون اور دو مرد بطور گواہ پیش ہوئے۔ جمیلہ کا وکیل فرانسیسی نژاد تھا۔ اس نے جمیلہ کا کیس بہت محنت سے تیار کیا تھا۔ وہ جب جمیلہ کے ساتھ کمرۂ عدالت میں داخل ہوا اور عدالت کے آداب کے مطابق آداب بجا لایا تو مجسٹریٹ نے تعارف حاصل کرنے کے بعد کہا۔

"آپ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں"

"فرانسیسی قوم سے مائی لارڈ"۔

"اچھا تو آپ باغی جمیلہ کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں!"

"مائی لارڈ یہ درست ہے"۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو ڈاکٹر باغیوں کا معائنہ کرتے ہیں انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اگر آپ کو یہ معلوم ہے تو اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لئے یہ بھی سن لیجے کہ جو وکیل باغیوں کی وکالت کے لئے آتے ہیں انھیں بھی گرفتار کرنا ضروری ہے"۔

وکیل نے کہا "مائی لارڈ میں تو یہ ثابت کرنے آیا ہوں کہ میرا مدعی باغی نہیں"۔

میجسٹریٹ نے کہا۔ "بہت اچھا آپ خود اپنے انجام کے ذمہ دار ہیں"۔

وکیل نے جب دیکھا کہ اس مقدمہ کی پیروی نہ صرف اس کے اپنے حق میں بلکہ اس کے مدعی کے حق میں بھی مضر ثابت ہوگی تو اس نے مقدمہ کی پیروی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اب جمیلہ اپنی آپ وکیل تھی۔

چند پیشیاں بھگت لینے کے بعد ایک اہم پیشی کی تاریخ مقرر ہوئی جس میں ڈاکٹر کے طبی معائنے کی رپورٹ کے علاوہ استغاثہ کی طرف سے تین گواہ پیش ہونا تھے۔ اس پیشی کی کارروائی سننے کے لئے عوام و خواص پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں عدالت کے باہر کھڑے تھے۔

مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ جمیلہ بوحائرڈ کٹہرے کے سامنے کھڑی تھی اور اس کے کچھ عزیز جن میں چند خواتین بھی تھیں ایک طرف لگی کھڑی تھیں۔

دائیں جانب استغاثہ کا وکیل کھڑا تھا جس کے پہلو میں تین ڈاکٹر خاموشی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک شخص عدالتی کارروائی سے بیزار سا نظر آ رہا تھا وہ الگ تھلگ کھڑا تھا اور کسی سے بات کرنا پسند نہیں کر رہا تھا۔ اس سے پرے ایک عورت عجیب و غریب حرکتیں کرتی نظر آ رہی تھی وہ اپنی انگلی سے کبھی میجسٹریٹ کی طرف اشارہ کرتی کبھی چھت کی طرف، کبھی جمیلہ بوحائرڈ کی طرف کبھی منہ بنا لیتی کبھی یک دم اس طرح ہنسنے لگتی جیسے کسی نے اس کے کان میں کوئی بہت ہی پُر لطف واقعہ سنایا ہے

مجسٹریٹ نے پچھلی پیشی کے تسلسل میں استغاثہ کے وکیل کو حکم دیا کہ وہ ڈاکٹر کی گذشتہ طبی رپورٹ پیش کرے۔

وکیل نے ڈاکٹر کو اشارہ کیا اور وہ اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ "یہ رپورٹ حاضر ہے۔"

مجسٹریٹ نے مختصر سی رپورٹ خود پڑھنا شروع کر دی۔

"جمیلہ بوحائرڈ جس کو ملک کا باغی سمجھتے ہوئے پولیس نے گرفتار کیا تھا اس کی گذشتہ سرگرمیوں کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے بوقت ضرورت معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سی بدنی سزا دی۔ اس کے جسم پر جو نشان نظر آئے وہ اس کی جسمانی ساخت میں پہلے سے موجود ہوں گے۔ یہ نشان زدو کوب کرنے کا نتیجہ ظاہر نہیں کرتے۔ رہا اس کے کندھے کا زخم سو یہ اس کے تپ دق کی علامت ہے۔"

مجسٹریٹ نے جمیلہ بوحائرڈ سے کہا۔ "آپ کچھ کہنا چاہیں تو آپ کو اجازت ہے۔"

جمیلہ بوحائرڈ نے اپنی پیٹھ ننگی کرتے ہوئے کہا۔ "جناب کیا یہ نشانات معمولی ہیں اور کیا یہ میرے جسم کی ساخت میں شامل ہیں؟" پھر اس نے اپنے کندھے کو ننگا کرتے ہوئے کہا۔ "کیا جناب یہ زخم زدو کوب کا نتیجہ ظاہر نہیں کرتے۔" اور پھر جلدی سے اپنی قمیض کا گریبان کھولتے ہوئے کہا۔ "کیا جناب یہ نشانات جلے ہوئے سگریٹوں کے معلوم نہیں ہوتے اور یہ علامات بجلی کے جھٹکوں کی نہیں ہیں جو مجھے مسلسل کئی دنوں تک لگائے گئے، کیا جناب ———"

مجسٹریٹ کی آواز گونجی۔ "خاموش ہو جایئے مس جمیلہ! آپ عدالتی آداب گفتگو کو محفوظ نہیں رکھ رہیں۔"

جمیلہ نے کہا۔ "جناب اگر میرا لب ولہجہ عدالتی آداب کے خلاف ہے تو میں اس کی دس بار معذرت کرنے کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ میرا معائنہ دیانتداری کی بنا پر نہیں کیا گیا۔"

مجسٹریٹ نے قدرے تلخ ہو کر پوچھا۔ "تو کیا آپ کے خیال میں بددیانتی کی بنا پر کیا گیا ہے۔"

"جناب میرا یہی مطلب ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "عدالت میں مجھے ہر بات صاف صاف کہنے کا حق ملنا چاہیئے۔"

مجسٹریٹ نے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں کہا۔ "بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جن کے

بیان کرنے کا مدعی کو حق نہیں مل سکتا۔ اس لیئے آئندہ سے احتیاط برتی جائے۔ ہاں تو آپ کے خیال میں آپ کا معائنہ درست نہیں ہوا تو کیا ڈاکٹر کی نسبت آپ بہتر رائے قائم کر سکتی ہیں؟"

جمیلہ نے کہا۔ "جی ہاں، اس لیئے کہ جس پر گذرتی ہے، وہی بہتر جانتا ہے۔"

میجسٹریٹ نے کہا۔ "اور اگر میں یہ کہوں کہ مدعی اپنے کیس کو مضبوط بنانے کے لیے غلط بیانی سے کام لے رہا ہے تو پھر؟"

"تو پھر جناب اس پر منصفانہ نظر ڈالنے کی کوشش کیجیئے۔ میری جسمانی چوٹیں اس قدر واضح ہیں کہ ایک عام آدمی بھی انھیں پہچان لے سکتا ہے۔"

میجسٹریٹ پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں بولا۔ "آپ کی باتیں غیر عدالتی ہیں۔ اس لئے اس کے بعد آپ کو اس معاملے میں بولنے کا اختیار نہیں، میں ڈاکٹر کی رپورٹ پر غور کروں گا۔"

جمیلہ طنزیہ انداز میں جواب دینے پر مجبور ہوئی۔ "بہت بہتر جناب۔"

میجسٹریٹ نے سرکاری وکیل سے کہا کہ وہ استغاثہ کی طرف سے گواہ نمبر ایک پیش کرے۔

گواہ نمبر ایک کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیا آپ کا تعلق حریت پسند جماعت کے ساتھ رہ چکا ہے؟"

"جی حضور۔"

"کیا آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں۔" میجسٹریٹ نے جمیلہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"جی ہاں۔" گواہ نمبر ایک نے کہا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، اس کا نام جمیلہ بوحائرڈ ہے یہ فیکلٹی آف لٹریچر کے سال اول میں تعلیم پاتی تھیں۔"

"انھوں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی؟"

"وہ سال اول بھی پورا نہ کر پائیں اور قومی تحریک میں شامل ہو گیئں۔"

"کیا یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنی خفیہ جماعت میں بہت سرگرمی سے کام کیا؟"

"جی ہاں حضور؟"

"ان کا وہاں کیا کام تھا؟"

"حضور ان کا کام الجزیرہ میں مسلمان قوم پرستوں کے خفیہ رابطے قائم کرنا تھا؟"

"کیا یہ درست ہے کہ مس جمیلہ پلاسٹک کے بم موقع پر رکھنے میں مہارت رکھتی تھی۔؟"

"حضور میں اس سے ناواقف ہوں۔"

"کیا یہ صحیح نہیں کہ مس جمیلہ بم پھینکنے میں کمال رکھتی تھی۔"

"حضور میں یہ نہیں جانتا؟"

"یہ بات ہر وقت یاد رکھئے کہ آپ کو یہاں حقیقت بیانی کے لئے بلایا گیا ہے۔"

"حضور مجھے اپنی ذمہ داری کا پوری طرح احساس ہے۔"

"کیا آپ کے خیال میں مس جمیلہ نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا؟"

"حضور یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کی بات ہے، میرے خیال میں وہ باغی نہیں بلکہ قوم پرست ہیں۔"

"دوسرا گواہ پیش کیا جائے۔" مجسٹریٹ نے ایسے انداز میں یہ لفظ کہے جن سے اس کا طیش بعد از شکست ظاہر ہوتا تھا۔

سرکاری وکیل نے کہا "افسوس دوسری گواہ ایک خاتون تھی جو تھوڑا عرصہ گذرا انتقال کر چکی ہے۔"

مجسٹریٹ نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "کہاں؟"

گویا اس کا انتقال کر جانا بھی اس کے جرائم میں شامل تھا۔

سرکاری وکیل نے جواب دیا۔ "فوجی قیدخانہ میں۔"

مجسٹریٹ معنی خیز سناٹے میں کھو کر رہ گیا۔ سرکاری وکیل کا یہ بیان حکومتِ فرانس کی ظالمانہ اور غیر منصفانہ پالیسی کا شفاف آئینہ تھا۔ سامعین میں سے ہر کسی پر حکومت کا پول کھل رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا۔ "تیسرا گواہ۔"

اور تیسرا گواہ پیش کر دیا گیا۔ یہ گواہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔

اِس نوجوان لڑکی کی حرکات و سکنات مجسٹریٹ کو پہلے ہی اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں، اب وہ کٹہرے میں آئی تو مجسٹریٹ اسے بڑی معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ کٹہرے میں کھڑی آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے بے مقصد حرکات و سکنات میں مصروف تھی۔ مجسٹریٹ نے سوال کیا۔

"لڑکی تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جمیلہ پوُزہ ہے حضور" اِس نے اکڑ کر جواب دیا۔

"کیا تمہارا دماغ درست ہے؟"

"جی ہاں حضور بالکل درست ہے۔"

"کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟" مجسٹریٹ نے جمیلہ بوحائرڈ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"جی ہاں! بہت اچھی طرح جانتی ہوں یہ میری ہم نام بھی ہے اور ہم کام بھی" اس کے بعد اس نے زور دار قہقہہ لگایا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ اِس کا تعلق کس جماعت کے ساتھ رہ چکا ہے؟"

"جی ہاں، اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے اور انگلی کو بے معنی طور پر جنبش میں لاتے ہوئے جواب دیا" یہ خوش قسمت لڑکی اسی جماعت میں کام کرتی رہی ہے جس میں میں ——"

"کیا یہ بم چلانا خوب جانتی تھی؟"

"یہ کیا جان سکتی ہے حضور، یہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتی، میں خوب جانتی ہوں، خوب" پھر وہ ہنسنے لگی۔

"گویا یہ بم چلاتی تو ہے مگر تم سے کم درجے کی ماہر ہے۔"

"بہت کم بہت ہی کم گویا کہ جانتی ہی نہیں، بس میں جانتی ہوں میں اسی وقت بم چلا سکتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پولیس مین آگے بڑھے کہ شاید اس نے بم چھپا ہی رکھا ہو۔ لیکن اس کے پاس کوئی بم نہ تھا، وہ تو اپنا دماغی توازن کھو جانے کی وجہ سے جو بھولی بسری بات زبان پر آتی تھی کہہ جاتی تھی۔ جب پولیس مین اس کی طرف لپکے تو اس نے زور دار قہقہہ لگایا۔ اِس قہقہے پر عدالت میں سب کا قہقہہ نکل گیا۔ جمیلہ بوحائرڈ کا بھی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ پولیس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"ٹک ٹک ٹک ٹک ــــ ٹک ٹک ٹک ٹک ــــ ٹک ٹک ٹک ٹک ــــ ٹک ٹک ٹک ٹک ــــ" جمیلہ پونزہ اپنے بازو اور ہاتھ کو بندوق بنا کر اور پھر اپنے جسم کو مشین گن کی شکل دے کر یہ مفہوم سمجھاتی رہی کہ پولیس اس پر بندوقوں اور مشین گنوں کے ذریعے گولیاں برساتی رہی ہے۔"

اپنا بیان دینے کے فوراً بعد جمیلہ پونزہ نے اپنی کلائی کی چوڑی کو جنونانہ طور پر گھمانا شروع کر دیا۔ چوڑی گھمانے کے فوراً بعد اس کی دماغی کیفیت عجیب و غریب ہو گئی۔ وہ کبھی مستغیث کے خلاف الزام لگاتی اور کبھی واپس لے لیتی۔

اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر جمیلہ بو حارڈ نے ایک بات کہنے کی اجازت چاہی، جو اسے مل گئی۔

"جناب میرا خیال ہی نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس گواہ کی دماغی حالت درست نہیں۔" مجسٹریٹ نے نرم لہجے میں کہا۔ "بہت بہتر مس جمیلہ! میں ڈاکٹروں سے معائنہ کراتا ہوں۔" چنانچہ پاس کھڑے تین ڈاکٹروں کو جمیلہ پونزہ کی دماغی حالت کا معائنہ کرنے کے لئے کہا گیا۔ تینوں ڈاکٹروں نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ ایک ڈاکٹر نے سرِ عدالت بیان دیا کہ "جمیلہ پونزہ کی دماغی حالت بالکل درست ہے۔"

اِس پر جمیلہ بو حارڈ کو بہت طیش آیا۔ اِس نے آدابِ عدالت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "جناب ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ گواہ الزام لگا کر تین بار واپس لے چکا ہے مگر پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان آپ کی نظر میں درست ہے کہ اس کا دماغی توازن نہیں بگڑا۔ یہ معاملہ سخت تعجب کا باعث ہے ــــ"

مجسٹریٹ نے قدرے درشتی میں جواب دیا۔ "آپ کو عدالتی آداب کا کچھ خیال نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ پر توہینِ عدالت کا الگ مقدمہ چلا دیا جائے۔"

جمیلہ بوحائرڈ نے کہا "میں اپنے لب ولہجہ کی معافی چاہتی ہوں لیکن نہایت ادب کے ساتھ حضور کی خدمت میں عرض پرداز ہوں کہ دوسرے ڈاکٹروں کی بھی رائے دریافت کی جائے"

مجسٹریٹ پھر قدرے نرم ہوگیا اور اس نے دوسرے ڈاکٹروں کی رائے معلوم کی۔ دونوں ڈاکٹروں نے یہ مشترکہ بیان دیا "ہم اس سلسلے میں خاموش رہنا بہتر سمجھتے ہیں"

"کیا مطلب؟" مجسٹریٹ نے کہا۔ "آپ دونوں کا کوئی تعلق مدعی سے تو نہیں؟"

اور ڈاکٹروں نے جواب دیا "کوئی تعلق نہیں، ہم مدعی کو ملک وقوم کا غدار سمجھتے ہیں"

ڈاکٹروں کی رپورٹ حاصل کرنے کے بعد جمیلہ پوئسزہ کو ایک بار اور کٹہرے میں بلایا گیا۔ جمیلہ پہلی سی حرکات میں مصروف تھی۔ اب کے مجسٹریٹ نے جو بھی سوال کیا اس کا جواب بے معنی الفاظ میں ملا۔ مجسٹریٹ نے آخر مناسب یہی سمجھا کہ اس کی شہادت ترک کرکے مدعی جمیلہ بوحائرڈ سے حتمی سوال جواب کر لیا جائے چنانچہ اس سے خطاب شروع ہوا۔

"مس جمیلہ بوحائرڈ کیا آپ مس جمیلہ پوئسزہ کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟"

"جی ہاں اس قدر جانتی ہوں کہ یہ قومی جماعت میں کام کرتی رہیں اور میری گرفتاری کے فوراً بعد گرفتار کرلی گئیں۔ فوج کے پاس ایک عرصہ رہنے کے بعد تین سال تک پاگل خانہ میں رہیں"۔

"اچھا تو آپ کا اور ان کا قومی جماعت میں کام کرنے کا مقصد کیا رہا؟"

"صرف الجزائر کی آزادی"۔

"آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی جماعت میں چھاپہ مار افراد بھی ہیں"

"جی ہاں مگر فوج اور پولیس کے جواب میں"

"آپ اتنے سوال کا جواب دیں جتنا میں سوال کروں"

"بہت بہتر جناب"

"آپ نے کم سے کم کتنے بم فرانسیسیوں اور یورپی آباد کاروں پر پھینکے؟"

"ایک بھی نہیں"

"کیا آپ سزائے موت سے بچنا چاہتی ہیں؟"

"جناب غلط بیان دے کر بچ سکوں تو مجھے ایسا بچنا منظور نہیں۔"

"اگر الجزائر کی آزادی کے سلسلے میں کوشش کرنے کا اعتراف آپ کو سزائے موت دلا دے تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟"

"جناب میں ایسا اعتراف اتنی زیادہ تعداد میں کر چکی ہوں کہ اس کا شمار میرے لئے مشکل ہو گیا ہے۔"

آخر میں مجسٹریٹ نے کہا "میرے سوالات ختم ہوئے اب آپ کوئی بیان دینا چاہتی ہوں تو دے سکتی ہیں۔"

جمیلہ بوحائرڈ نے کہا "میرا بیان یہ ہے کہ میں اپنی ہر کوشش اور ہر قربانی کے عوض اپنے ملک الجزائر کو آزاد دیکھنے کی متمنی ہوں۔"

جمیلہ کا یہ مختصر سا بیان لینے کے بعد مجسٹریٹ نے کہا "اب عدالت کی کارروائی ختم کی جاتی ہے۔ فیصلہ کے لئے تاریخ کا انتظار کیجیے۔"

عدالت کا اجلاس ختم ہو گیا۔ جمیلہ کا چہرہ اگرچہ مسلسل ضربوں کی وجہ سے مسخ ہو چکا تھا مگر اس سے اضطراب کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی بلکہ اس کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کی اور پھر اپنے عزیزوں سے خوشی خوشی ملنے کے بعد جیل کو روانہ ہو گئی ——

لوگوں کو عدالت کے فیصلے کا شدت سے انتظار تھا۔

۲۴

اگرچہ زبیدہ کو عقیل کی طرف سے اس بات کا کامل یقین ہوگیا تھا کہ وہ برتھائین سے محبت نہیں کرتا لیکن ایک مدت کے بعد سادہ مگر دلکش فیشن کے ملبوسات زیب تن کئے اور چہرے پر ایکٹرسوں کی طرح میک اپ کئے ہوئے آئی تو اسے دیکھتے ہی زبیدہ کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا" اسے یوں ہی خیال آیا کہ فطرتاً" مرد عورت کے معاملے میں بہت کمزور واقع ہوا ہے اس لیے برتھائین کی نئے فیشن کی سینڈل نئے فیشن کے کپڑے اور نئے انداز کا میک اب ضرور متاثر کر کے رہے گا، عقیل نے پندرہ بیس روز کے اندر اندر یہ محسوس کر لیا کہ زبیدہ رقابت کی آگ میں جل رہی ہے۔ اسے پہلے یہ خیال آیا کہ وہ اسے تھوڑی دیر کے لئے پریشان کرے لیکن دوسرے خیال نے پہلے خیال کی فوراً تردید کر دی " ہو سکتا ہے آج کی غلط فہمی اس کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے بدظن کر دے "

عقیل کو ایک وقت یہ خیال بھی آیا کہ وہ آج تنہائی میں برتھائین کا تعارف زبیدہ سے اِس طور پر

کرادے کہ "یہ میری محبوبہ ہے" لیکن اسے فوراً خیال آیا کہ اس اقدام سے ایک تو برتھائین جل کر کوئلہ ہو جائے گی دوسرے اس کی بے باکی اس راز کو زبیدہ کے والدین پر کسی طرح ظاہر کر دے گی۔ اس نے دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ ورنہ زبیدہ کے بھی ہاتھ سے نکل جانے کا امکان پیدا ہو جانا قدرتی امر تھا۔

برتھائین جس انداز میں بیٹھی عقیل سے مصروفِ گفتگو تھی وہ انداز گھر والوں کو سخت ناپسند ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے عقیل زبیدہ کے والدین پر اس کے یک طرفہ والہانہ عشق کی داستان سنا کر اپنی مصلحت اندیشانہ مروّت کی مجبوری واضح کر چکا تھا لیکن پھر بھی گھر کے افراد اس کا آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

آج برتھائین ایک فیصلہ کر کے آئی تھی۔ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح عقیل کے ساتھ تنہائی میں بات کر سکے مگر اس کے کمرے میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود رہتا تھا۔ آخر میں زبیدہ کافی دیر تک بیٹھی رہی۔

برتھائین بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ اب اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بے تکلفی سے تخلیہ پیدا کرنے کی درخواست کرے۔ چنانچہ اس نے زبیدہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "مس زبیدہ! امید ہے تم برا نہ مانو گی۔ میں مسٹر عقیل سے ایک بات علیحدگی میں کہنا چاہتی ہوں اس لئے تم دس پندرہ منٹ کے لئے یہاں سے چلی جاؤ"۔

برتھائین کے فقرہ پورا کرنے کی دیر تھی کہ عقیل کی خفگی کا پارہ یک دم چڑھ گیا "برتھائین تمہیں شرم آنی چاہئے"۔

اس نامکمل فقرے کے بعد زبیدہ جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

عقیل نے زوردار لفظوں میں کہا "زبیدہ تم اس کمرے سے نہیں جاؤ گی"۔

زبیدہ نے کہا "نہیں میں جا رہی ہوں"۔

عقیل نے فوراً کہا "اگر جا رہی ہو تو میرا بھی فیصلہ سن لو کہ میں آج ہی اس گھر کو چھوڑ رہا ہوں"۔

اس ہوشربا فقرے نے زبیدہ کا فیصلہ یک قلم بدل دیا اور وہ جھاگ کی طرح وہیں بیٹھ گئی۔ اس ایک لمحے میں عقیل نے محبت کی اس کیفیت کا لطف اٹھایا جو بے تکلف خفگی میں روٹھے ہوئے محبوب کو منا لیا کرتا ہے۔

برتھائین نے بھی جب یہ دیکھا کہ اس نے عقیل کو زندگی میں پہلی بار خواہ مخواہ خفا کر لیا ہے تو اس نے بھی فوراً دونوں سے معافی مانگ لی۔ برتھائین پر اس وقت پوری طرح ثابت ہوگیا کہ وہ تو عقیل کی ہو سکتی ہے مگر عقیل اس کا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اسے یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو زبیدہ اس کی محبوبہ ضرور ہوگی۔ معافی مانگ لینے کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی، نہ کہہ سکی، عقیل کو اس پر ترس آگیا۔ اس نے تسلی بخش لفظ بول کر کہا "مجھے افسوس ہے کہ شاید میرے لفظوں نے تمہارا دل توڑ دیا ہو مگر میں خفا اس لئے ہوا تھا کہ تم نے جو بات کی تھی وہ آداب کے بالکل خلاف تھی۔ تمہیں شاید میں نے بتایا نہیں کہ اس گھر کے مجھ پر کتنے احسانات ہیں، خاص طور پر اس زبیدہ کے، جس نے اپنا سلا آرام میری خاطر قربان کر رکھا ہے۔ میری خدمت اس طرح کی ہے کہ میں اس کا معاوضہ دینا بھی چاہوں تو نہیں دے سکتا۔ میں نے سوچا کہ اسی زبیدہ کو تم یہاں سے اٹھا کر اپنی پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہو تو یہ کتنی بری بات ہے کہ میزبان کو اس کے کمرے سے چلے جانے کو کہا جائے۔ باقی اب تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، زبیدہ کے سامنے کہہ ڈالو، یہ تمہارے راز کو راز ہی رہنے دے گی۔"

برتھائین نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "اب میرا راز راز نہیں رہا، اب میرا ارادہ بھی وہ نہیں رہا جو اب سے کچھ دیر پہلے تھا، البتہ میرا دہ ارادہ اسی طرح پختہ ہے جیسے آج سے کئی مہینے پہلے پختہ تھا"۔

عقیل نے کہا "مس برتھائین تمہاری موجودہ گفتگو معمہ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔"

برتھائین نے کہا۔ "اگر اس میں ہرج نہ ہو تو اس کمرے کے دروازے بند کرا دیجئے، میں آج مس زبیدہ کے سامنے اپنا معمہ کھول دینا چاہتی ہوں۔"

زبیدہ سوچے سمجھے بغیر دروازہ بند کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کے نزدیک

عزیزہ کو بلا کر کہا کہ اندر کوئی نہ آئے۔ اس کے بعد دونوں دروازے بند کر دئے۔

برتھائین نے فوراً ہی بات شروع کر دی۔

"مسٹر عقیل! ہمارے اور مسلمانوں کے معاشرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جس بات کا اظہار آپ کے معاشرے میں بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ اس کا اظہار ہمارے ماحول میں بہت جلد ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں آپ سے محبت کرتی آئی ہوں اور آج بھی محبت کا تحفہ قبول کرانے آئی تھی۔ میں نے شروع شروع میں آپ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہوں کہ آپ کو پانے کے لئے مسلمان بھی ہو جانے کو تیار ہوں اور آپ نے چلتے چلتے یہ جواب دیا تھا کہ مجھے اسلام کو قبول کسی لالچ کے لئے نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنے دل کی سچائی کے ساتھ۔ آپ نے مجھے اسلامی کتابیں بھی پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ شاید آپ ہی کی محبت کی وجہ سے میں نے فرانسیسی اور انگریزی زبان میں چھپی ہوئی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ میں نے ایک کتاب "اسلام کیا ہے" پڑھی اس کے بعد ایک کتاب پڑھی جس کا نام ہے "اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرو" حقیقت یہ ہے کہ میں نے آپ کی محبت کو درمیان سے ہٹا کر اسلام کی حقانیت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اسلام واقعتاً فطری مذہب ہے۔ اسلام نے ہر معاملے میں اعتدال کے راستے پر گامزن کرنا چاہا ہے۔ میں اپنے اور آپ کے معاشرے کے ایک طبقے کی انتہاپسندیوں کے ناخوشگوار نتائج دیکھ کر اس فیصلے پر پہنچ چکی ہوں کہ انتہائیں بہر حال تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی خواتین میں پردہ بالکل ناپید ہے اس متجاوز طرزِ عمل نے ہماری خواتین کو اخلاقی طور پر بہت گرا دیا ہے۔ اِس طرح معاف کیجے گا آپ کے معاشرے میں جہاں پردہ سختی کے ساتھ کرایا جاتا ہے میرے علم میں یہ واقعات آچکے ہیں کہ پردے کی آڑ میں وہ خواتین ہماری بے باک اور بے پردہ خواتین کی نسبت بے حیائی میں کسی طرح کم نہیں۔ مجھے نہیں معلوم آپ کا اپنا کیا خیال ہے، مگر میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے، یہی پایا ہے کہ اِس نے پردہ کرنے کی اتنی سختی نہیں کرائی جتنی کم فہمی اور بے شعوری کے باعث مسلمانوں کے ایک طبقے نے اختیار کر لی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھی تربیت یافتہ خاندانوں کی باپردہ خواتین

بد اخلاقی کی مرتکب نہیں لیکن زمانے کے حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کے امکانات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جو غلط راہ پر لے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر ہمارے معاشرے کی خواتین حد سے تجاوز کر کے انتہائی طور پر بے پرواہ بے لگام نہ ہو جاتیں تو ان کے اخلاق پر بھی کوئی ناگوار اثر نہ پڑتا۔ ہمارے معاشرے میں فیشن پرستی اس قدر زیادہ ہے کہ جو خواتین نئے فیشن کو اختیار نہیں کرتیں وہ تہمت بنی رہتی ہیں۔ میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے خیالات میں بھی شروع شروع میں انتشار تھا اور میں بھی رونقِ محفل بننے والی تھی لیکن آپ کی محبت نے مجھے یکسوئی سکھا دی اور پھر جب آپ نے اسلامی تعلیمات کے مطالعہ کی رغبت دلائی تو اس نے میرے نظریات ہی کو بدل دیا۔ پھر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میری محبت کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن میں اسلام کو قبول کرنے میں ضرور کامیابی حاصل کر دوں گی۔

ہاں اسلام کی اس آیت نے مجھ پر اپنی حقانیت کا بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ "اسلام قبول کرنے کی کسی پر زبردستی نہیں ہے"۔

زبیدہ نے کہا "وہ آیت یہ ہے لا اکراہ فی الدین"۔

برتھائیں نے فوراً تائید کی "ہاں اسی قسم کے الفاظ تھے۔

میں کہاں سے کہاں چلی گئی، بتانا یہ تھا کہ میرا فیشن ایبل ہونا بھی اپنے معاشرے کی تہمت سے بچنے کی دلیل ہے اگرچہ میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتی کہ میں آج خاص طور پر کسی مقصد کے لیے آئی تھی۔۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ میرے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا ہے کہ جس طرح میری امانت چھن جانے سے مجھے سخت صدمہ ہو سکتا ہے اسی طرح کسی دوسرے کی میں امانت چھین لوں تو اس کو کس قدر صدمہ ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی محبت کا زاویہ بدل لیا ہے۔ میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے اسلام جیسا زندگی کا لائحہ عمل دے دیا ہے۔ میں جان گئی ہوں کہ اتفاقات نے آپ کو اور مس زبیدہ کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے اور اس قدرتی ملاپ کو توڑنے سے میری روح کو جو صدمہ ہوگا وہ مجھے مرنے کے بعد بھی چین نہ لینے دے گا۔ اب میری صرف یہ درخواست ہے کہ آپ مجھے مسلمان بنا لینے کے بعد میری شادی کسی ایسے قریبی عزیز سے کر دیجیے کہ میں آپ لوگوں کی مبارک

صحبت میں رہ سکوں۔"

برتھائین کی اس منقلب حالت نے عقیل اور زبیدہ دونوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ زبیدہ نے جوشِ وارفتگی میں برتھائین کو گلے سے لگالیا۔

برتھائین چونکہ اپنے ماحول کی وجہ سے طبعاً بے باک تھی اس لئے جب گلے لگاتے ہوئے زبیدہ نے یہ کہا کہ "مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے" تو برتھائین نے فوراً شرارت سے جواب دیا "ہاں تمہاری خوشی کی وجہ مجھے معلوم ہے"۔

اس شرارت آمیز جملے کے اثر سے دور ہونے کے لئے زبیدہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ عقیل نے بھی اس کے اثر سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنی خوشی کا اظہار شروع کر دیا۔ اس نے کہا۔ "برتھائین میں تمہاری گفتگو سے یہ نتیجہ نکال رہا تھا کہ اسلام کا اتنا صحیح مطالعہ عام طور پر ہم مسلمان نہیں کرتے جس قدر تم نے کیا ہے"۔

اس چھوٹے سے فقرے کے فوراً بعد عقیل نے دوبارہ کہا "ہاں برتھائین، مجھے امید ہے کہ تمہیں میری عزت کا خیال ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ زبیدہ اور میں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ گھر والے بھی ہمیں ملا دینے میں خوشی محسوس کریں گے لیکن ہمارے معاشرے میں محبت کا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے تم زبیدہ کے والدین یا کسی دوسرے پر اس کا تذکرہ ہرگز نہ کرنا"۔

عقیل کی یہ ہدایت پوری ہوئی ہی تھی کہ زبیدہ اپنے والدین عزیز اور کرامت کو یہاں لے آئی۔ یہ سب برتھائین سے نہایت محبت اور شفقت سے ملے اور اس کے اسلام لانے کے ارادے پر انتہائی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ زبیدہ نے کرامت سمیت سب کا تعارف کرایا اور پھر عقیل نے یہ سوال کیا۔ "آپ مسلمان کب ہونا چاہتی ہیں؟"

برتھائین نے کہا۔ "کب کا کیا سوال میں اسلام لانے کی اطلاع تحریری طور پر اپنے گھر دے آئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے گھر کے افراد مجھے آئندہ گھر داخل نہ ہونے دیں"۔ لیکن میں کسی قسم

میں ملازم ہو کر ان کی محتاجی سے بچ جاؤں گی۔"

جلیل صاحب کی آنکھیں خوشی کی وجہ سے بھیگ گئیں اور انھوں نے کہا "بیٹی میں بہت خوش قسمت ہوں۔ مجھے جس قدر خدمت کا شوق ہے اُسی قدر قدرت خدمت کے مواقع فراہم کر رہی ہے خدا کے فضل سے میں بہت امیر آدمی ہوں جتنا امیر ہوں، اتنا فراخ دل بھی ہوں، اس لئے میں اس بات میں اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری خدمت کا بھی موقع ملے گا۔ اس لئے تم اپنی ملازمت کا کہیں انتظام نہ کرنا۔"

زبیدہ کی والدہ نے بھی اسی مفہوم میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس دوران میں پہلے تو زبیدہ عزیزہ کے کان میں کچھ کہتی رہی اور پھر عزیزہ نے اپنے بھائی عقیل کے کان میں کچھ کہا۔ عقیل مسکرا دیا اس کیفیت کو کرامت بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے عزیزہ سے اشارہ میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

اور عزیزہ نے کہا۔ "آپ کو بتانے والی بات نہیں۔"

خیرالدین کی گفتگو کے اختتام پر زبیدہ نے کہا۔ "ابا جان! مسلمانوں کی برادری میں ایک کا اضافہ کرنے کا انتظام جلد کیجئے"۔

"انتظام کیسا۔" جلیل صاحب نے کہا۔ "میں خود مسلمان کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے زبیدہ اور عزیزہ سے کہا کہ اسے غسل دلانے کے بعد وضو کرا دو اور پھر یہیں پاک صاف کپڑا بچھا کر بٹھا دو، مسلمان بنانے میں دیر کا ہے کی لگتی ہے۔

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔ "آج بشارت بھی آگیا ہے اس سے کہنا کہ اچھے اچھے کھانے تیار کرے انڈوں کی پڈنگ بھی بنائے۔"

برتھائین نے کہا۔ "محترمہ آپ یہ کیوں تکلیف کر رہی ہیں۔"

والدہ بولیں۔ "بیٹی! تم ہماری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

اتنے میں عزیزہ برتھائین کو غسل خانے کی طرف لے گئی۔ اس کے لئے زبیدہ نے اپنا جوڑا اور

بنیان غسل خانے میں ٹانک دی "آپ اب میرا لباس پہنیں گی اور بالکل میری طرح بن جائیں گی"

برتھائین نے غسل خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن میں بالکل آپ کی طرح کیسے بن سکتی ہوں آپ جیسے لمبے بال کہاں سے لاؤں گی"

عزیزہ پاس کھڑی تھی، بولی "آپ کے بالوں کو دوپٹہ چھپائے گا"

برتھائین دیر تک غسل کرتی رہی اور پھر زبیدہ کے کپڑے پہن کر باہر آئی۔ اس کے بعد عزیزہ نے اسے وضو کا طریقہ بتا بتا کر وضو کرایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مسلمان ہونے سے پہلے ہی مسلمان ہو چکی ہے دراصل نیک ارادہ بڑی چیز ہے۔ جس نے برتھائین کا رنگ ڈھنگ بدل دیا تھا۔ اس نے زنانہ کمرے میں جا کر کنگھی کی، مناسب حد تک پوڈر لگایا اور پھر وہ عزیزہ اور زبیدہ کے ساتھ عقیل کے کمرے میں آگئی۔ زبیدہ نے برتھائین کے غسل کے دوران پاک صاف کپڑا بچھا دیا تھا، سامنے رحل پر کلام پاک بھی رکھ دیا تھا۔ اس وقت سب کے سب سنجیدگی کی تصویریں بنے ہوئے تھے۔

زبیدہ کے والد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کے بعد اس کا مطلب سمجھایا اور پھر اسلام کی موٹی موٹی باتیں بتانے کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی کہ عقائد کا صحیح ہونا اسلام کی سب سے بڑی بات ہے۔ چونکہ عیسائی لوگ حضرت عیسٰی کو خدا کا بیٹا اور خدا کو اس کا باپ کہتے ہیں اور اسلام اس عقیدے کو غلط سمجھتا ہے اس لئے اس نے خدا اور بندے میں عبودیت اور عبدیت کا فرق پیدا کرنے کے لئے مروجہ عیسائیت کے خیال کی تردید کی، ہو سکتا ہے شفقت اور محبت کے جذبات کی وجہ سے عیسائیوں کا یہ خیال ہو کہ حضرت عیسٰی اور خدا باپ بیٹا ہیں لیکن چونکہ قدرتی طور پر کمزور طبائع اور کمزور ایمان رکھنے والے اس جذباتی بات سے عقائد کی بنیاد کو متزلزل کر سکتے ہیں اس لئے اسلام نے ضروری سمجھا کہ خدا کے ساتھ ذات اور صفات میں کسی قسم کی شرکت گوارا نہ کی جائے اور اسی لئے اسلام نے نماز میں پڑھی جانے والی ایک سورۃ یہ رکھی

قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد

اس کا مطلب یہ ہے۔ "اے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کہہ دے کہ وہ اللہ ایک ہے، وہ بے

نیاز ہے، نہ اس کو کسی نے پیدا کیا ہے اور نہ اس نے کسی کو۔"

"اس وضاحت کے بعد اب میں تمہیں مسلمان بنانے کے لئے جو لفظ کہوں اسے دہراتے جانا۔"

اس وقت برتھائین بہت باحیا بنی بیٹھی تھی، اس کے چہرے پر سنجیدگی اور خوشی کے ملے جلے نقوش صاف دکھائی دے رہے تھے۔ آس پاس دائرے میں عزیزہ، زبیدہ اس کی والدہ اور کرامت بیٹھے تھے۔

جلیل صاحب بولے۔ "کہو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔"

چونکہ برتھائین عربی زبان کی کئی آیات پڑھ چکی تھی اس لئے اس نے بسم اللہ کو فرفر پڑھ لیا اب جلیل صاحب نے اس کا مطلب دہرایا۔ "کہو شروع کرتی ہوں اللہ کے نام سے جو روزی دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

برتھائین نے اس کو بھی دہرایا۔

اس کے بعد انھوں نے کلمہ شریف پڑھا۔ "لا الہ۔"

برتھائین نے کہا۔ "لا الہ؟"

جلیل صاحب بولے۔ "اللہ۔"

برتھائین نے کہا۔ "اللہ۔"

پھر انھوں نے کہا۔ "محمد الرسول اللہ۔"

اور اس نے دہرایا۔ "محمد الرسول اللہ۔"

اب انھوں نے مطلب بیان کیا۔ "کوئی نہیں معبود سوا اللہ کے۔ محمد اس کے رسول یعنی پیغام لانے والے ہیں۔"

برتھائین نے یہ لفظ دُہرائے۔

پھر انھوں نے پوچھا۔ "بیٹی کیا تم اپنے آپ مسلمان ہو رہی ہو یا کسی کے مجبور کرنے پر؟"

برتھائین نے جواب دیا۔ "اپنے آپ مسلمان ہو رہی ہوں۔"

اب انھوں نے سب سے کہا کہ وہ اس کا نام تجویز کریں۔

عقیل نے رابعہ بتایا۔

عزیزہ نے جمیلہ۔

زبیدہ نے نسرین

زبیدہ کی والدہ نے خدیجہ

لیکن کرامت نے کہا کہ ان کا نام عائشہ رکھا جائے۔

زبیدہ کے والد کو کرامت کا تجویز کردہ نام پسند آیا اور پھر نام رکھ لینے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے گئے۔ سب نے مل کر عائشہ کے لئے دین اور دنیا کی کامیابی کی دعا مانگی اور پھر ہر ایک فرد نے اسے مسلمان ہونے کی مبارک دی۔

اس وقت عائشہ مسلمانوں کے سادہ لباس میں ملبوس بہت شریف اور حسین معلوم ہو رہی تھی۔

بشارت باورچی خانہ میں جس وقت داخل ہوا اس وقت سے اب تک باہر نہ نکلا اور جو نکلا تو طرح طرح کی لذیذ پلیٹیں لے کر نکلا۔ دسترخوان عزیزہ نے پہلے ہی بچھا دیا تھا۔ اس پر پلیٹیں رکھ دی گئیں۔ سب نے خوشی خوشی پلیٹیں ختم کیں اور پھر عائشہ سب کا شکریہ ادا کرنے میں مگن ہو گئی۔

۲۵

ملکی بحران کو معمول پر لانے اور الجزائر کو فرانس کے قبضے سے نہ نکلنے دینے کی غرض سے فوجی حکام نے جنرل ڈیگال کو فرانس کا اقتدار سونپ دیا۔ اس سے پہلے وزارتِ عظمیٰ کے لئے جنرل سالان کی بھی اسے تائید حاصل تھی۔ اپنے دورِ صدارت سے پہلے جنرل سالان کو الجزائر میں الجزائری مجاہدین کی سرگرمیوں کو موت کی نیند سلانے کے لئے ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ جنرلِ ڈیگال کی صدارت کے زمانے میں بھی اسی عہدے پر فائز رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ عمل درآمد حکومتِ فرانس کے احکام کی بجا آوری تھا لیکن اس کے لئے یہ ایک حسن اتفاق تھا کہ حکومت کی پالیسی الجزائریوں کے حق میں اس کے نظریات کی تائید میں تھی ورنہ اگر حکومت الیسا نہ چاہتی تو جنرل سالان اپنی بیشتر خصوصیات کے باعث ایک قابلِ قدر شخصیت تھا لیکن اس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس کا دماغ منفی رجحانات کا حامل رہتا تھا۔

جنرل سالان ۱۸۹۹ء میں فرانس کے ایک چھوٹے سے گاؤں سپونس میں پیدا ہوا۔ عہدِ طفلی

شہر ٹالمز میں گذرا۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے ہونہار سمجھا جاتا تھا، فارغ التحصیل ہونے کے بعد فوج میں بھرتی ہوگیا، ۱۹۱۷ء میں جنگ کے محاذ پر بھیج دیا گیا جہاں زخمی ہو کر اس نے فوجی اعزاز حاصل کیا جنگ کے اختتام کے بعد شام اور لبنان کے قبائیلیوں کو کچلنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ وہاں بھی زخمی ہوا۔ بعد ازاں اسے ہند چینی میں چین، برما اور لاؤس کی سرحد پر جنگل کے ایک ایک کونے کی حفاظت کا کام سونپا گیا دوسری عالمگیر جنگ میں بھی وہ نازیوں کے خلاف جرأت مندی سے لڑتا رہا۔ نازیوں سے متارکہ جنگ ہوا تو اسے یہ مشکل آ پڑی کہ وہ مارشل پیٹن کی حکومت کا ساتھ دے یا جنرل ڈیگال اور اتحادیوں کا۔ آخر جنرل ڈیگال کی حمایت میں جنگ لڑنے کے بعد وہ پھر ایک بار ہند چینی جا کر کمیونسٹوں اور قوم پرستوں سے جنگ آزما ہوا، آخر ۱۹۵۴ء میں واپس پیرس آیا تو یہ دیکھ کر کہ الجزائری باشندے حق خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے اپنے مطالبے کی آواز کو بلند کر رہے ہیں ان کے عزائم کو شکست دینے کے پروگرام پر مستعد ہوگیا، چونکہ حکومت بھی الجزائری آواز کو خاموشی میں بدلنا چاہتی تھی اس لئے اس نے الجزائر میں جنرل سالان جیسے ماہر آدمی کو بھیج کر طاقت کے استعمال کا صحیح حق ادا کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اسے الجزائری حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے روانہ کیا گیا اور اس نے الجزائر کے اہم شہروں میں مسلسل جنگ کرنے کا جو پروگرام بنایا اور اس پر جیسا عمل کیا وہ کسی دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک سات آٹھ لاکھ مجاہدین کو موت کی نیند سلا دینا اسی کا کارنامہ تھا جسے ابلیسی ذہن سنہری حروف میں لکھ رہے تھے۔

جنرل ڈیگال کے برسر اقتدار آنے سے پہلے جنرل سالان پہلی حکومتوں کے سیاسی نظریات کے حق میں تھا، بالخصوص ان کے الجزائر کے متعلق جو نظریات تھے ان سے اس کو پوری طرح اتفاق تھا لیکن جب جنرل ڈیگال برسر اقتدار آیا تو اس کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی، گویا جنرل ڈیگال نے جنرل سالان کی اس کارگذاری پر پانی پھیر دیا جس میں اس نے سات آٹھ لاکھ الجزائری مجاہدین کو کچل دیا تھا۔

۱۹۵۸ء کا سال مجاہدین کے حق میں بہت سخت تھا حکومت کی طرف سے الجزائریوں کو دبانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی، حکومت نے ابھی خاتون الجزائر جمیلہ بوحائرڈ کے مقدمہ کا فیصلہ بھی

نہ سنایا تھا کیونکہ وہ فیصلہ سنانے سے پہلے الجزائری مجاہدین پر ایک غیر معمولی دہشت طاری کر دینا چاہتی تھی جس کے نتیجے میں وہ اپنے عزائم کو خود ہی تھپکی دے کر سلا دیں۔ لیکن برسر اقتدار گروہ دل ہی دل میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ الجزائری مجاہدین فولادی چٹانیں ہیں جن پر فتح پانا آسان نہیں۔ ان دنوں گھر گھر میں جمیلہ بوحارڈ کا تذکرہ تھا' اس کے مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار تھا"

زبیدہ کے گھر میں بھی دو پارٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک پارٹی میں زبیدہ اور عقیل کے علاوہ عزیزہ بھی شامل تھی اور دوسری پارٹی میں کرامت اور زبیدہ کے والدین۔ تین افراد ایک پارٹی میں اور تین ہی دوسری پارٹی میں جب سے برتھائین آگر مسلمان ہوئی تھی' وہ بھی اس خوشگوار بحث میں شریک ہوگئی' اس کا خیال کرامت اور زبیدہ کے والدین کی طرف تھا۔ یہ دن حکومت کے لئے اس لحاظ سے بھی بے حد کشمکش کے تھے کہ اس کے اپنے گھر میں آگ لگ رہی تھی۔ جنرل جو ہاڈ جنرل سالان کے ساتھ مل کر الجزائر میں مقیم فرانسیسی فوج کو فرانس کی مرکزی فوج سے علیحدہ کر لینے کے لئے حکومت فرانس کے خلاف بغاوت کے بارود کو آگ دکھانے کی فکر میں تھا' حکومت اپنوں اور غیروں کے حملوں سے بچنے کی تدبیریں کر رہی تھی۔ فروری کے آخری دن تھے اور عائشہ جس کا سابقہ نام برتھائین تھا' اپنے ہم مذہبوں کے بلانے پر چلی گئی تھی۔ اس کے والدین اور عزیزوں نے اس کے مسلمان ہونے پر سخت لعن طعن کی تھی اور دوبارہ عیسائی بن جانے پر مجبور کیا تھا لیکن وہ انھیں جواب دے کر آگئی تھی۔

جس دن وہ زبیدہ کے گھر پہنچی وہ فروری کا آخری دن تھا۔ اس نے کمرے میں اسلام علیکم کہہ کر قدم رکھا ہی تھا کہ زبیدہ نے وعلیکم السلام کہہ کر آواز بلند کی۔ "لیجے کرامت بھائی کی پارٹی کے ممبروں میں اضافہ ہوگیا۔"

عائشہ نے کہا "اب میرے خیال میں یہ بحث چھوڑ دینی چاہئے کیونکہ ۲ مارچ کو فیصلہ ہو جائے گا۔"

عقیل نے کہا۔ "اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل لو۔"

کرامت بولا۔ "تعجب ہے بھائی جان' آپ فیصلے کا لفظ استعمال کر رہے ہیں حالانکہ ہمیں

فیصلے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، یہ حق تو عدالت کو پہنچتا ہے۔"

عقیل نے جواب دیا "مگر ہماری عدالت یعنی مجاہد عوام کی عدالت حکومت کی عدالت سے زیادہ خائق اور معتبر ہے، ہماری عدالت کا فیصلہ یہی ہے کہ حمیلہ کو سزائے موت دینے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔"

کرامت نے کہا "شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جہاں حکومت سات آٹھ لاکھ مجاہدین کو ختم کر سکتی ہے وہاں اس کے نزدیک جمیلہ کیا حقیقت رکھتی ہے کہ وہ اس کا لحاظ کرے گی۔"

"کیا مطلب ؟" زبیدہ نے کہا۔

کرامت نے جواب دیا "یہی کہ فائر کر کے مار دینے سے انسان کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس کے جسم کو مسلسل ضربیں اور بجلی کے جھٹکے لگانے سے ہوتی ہے۔ کیا اسے اس قسم کی ناقابلِ برداشت اذیتیں نہیں پہنچائی گئیں ؟"

زبیدہ نے کہا "لیکن اسے جان سے نہیں مارا جا سکتا، اس کی جان لے کر حکومت اپنا تختہ نہیں الٹا سکتی ۔"

عائشہ نے اس خوش گوار بحث کو ایک جملے سے اور زیادہ خوش گوار بنا دیا "میں ہم خیال تو زبیدہ کی ہوں مگر میرا ووٹ مسٹر کرامت کے ساتھ ہے ۔"

جلیل صاحب بولے "یہی معاملہ میرا ہے، میں اس پارٹی میں شامل ہونے سے بچنا چاہتا ہوں لیکن چونکہ اصولی آدمی ہونے کی وجہ سے ایک بار اس شمولیت کا فیصلہ کر چکا ہوں اس لئے میرا ووٹ کرامت ہی کے لئے ہو سکتا ہے ۔"

عزیزہ کو شرارت سوجھی۔ بولی "چچی جان! آپ کے چہرے کے آثار بتا رہے ہیں کہ آپ کا بھی یہی حال ہے" اور انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "بیٹی کیا کیا جائے کوئی راہ فرار نہیں ملتی ۔"

اس جملے پر زوردار قہقہہ بلند ہوا مگر اس سے بھی زیادہ قہقہہ اس وقت بلند ہوا جب خود کرامت نے کہا "بات اصل میں یہ ہے کہ میں اپنے دعوی کا وکیل ہوں، جو کیس پیش کر چکا ہوں اسے

واپس نہیں لے سکتا ورنہ حقیقت تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ حکومت جمیلہ کو سزا نہیں دلا سکتی۔"

اس بحث کو عائشہ نے یہ کہہ کر ختم کیا "لیکن چونکہ یہ ہماری عزت اور وقار کا سوال ہے اس لئے ہم اصولی طور پر اپنے دعوے سے دستبردار نہیں ہوں گے۔"

اس پارٹی کے سب ممبروں نے بلند آواز سے کہا "بیشک"۔ اور پھر سب کے قہقہوں میں یہ مجلس منتشر ہو گئی اور کھانے کا انتظار کرنے لگی۔

زبیدہ اور اس کے والدین کا عائشہ کے ساتھ اتنا اچھا سلوک تھا کہ وہ اپنے آپ کو ان کے گھر کا ایک فرد تصوّر کرنے لگی، کھانا تیار تو ان کا ملازم بشارت ہی کر رہا تھا لیکن کھانوں میں تنوع پیدا کرنے کے لئے کئی دن سے عائشہ نے دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ آج بھی وہ باورچی خانہ میں کھانے کی کیفیت معلوم کرنے گئی۔ دیکھا تو ایک سالن اور ایک میٹھی چیز تیار تھی۔ عائشہ بہت خوش خور تھی اس نے کسٹرڈ پوڈر، دودھ، انڈوں اور کچھ میوہ جات کے مجموعہ سے ایک عجیب و غریب میٹھی چیز تیار کی پلیٹ میں بظاہر ایک بڑی سی ڈبل روٹی رکھی ہوئی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ ڈبل روٹی نہ تھی بلکہ پنیر کی طرح سخت عجیب و غریب چیز تھی، اس کو کھانے سے عجیب و غریب خوشبوئیں آتی تھیں۔

جب سے زبیدہ کے والدین کرامت اور عائشہ عقیل کے کمرے سے نکلے تھے تب سے زبیدہ عقیل اور عزیزہ میں ایک دلچسپ گفت گو کا آغاز ہو گیا تھا۔ عزیزہ نے بات چیت میں پہل کی۔

بھائی جان! عائشہ جب سے مسلمان ہوئی ہیں۔ ان کا ڈھانچہ ہی نہیں بدلا، دل بھی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے خیالات اور چال ڈھال میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔"

"اس کی وجہ صرف اسلامی تعلیم ہے۔" عقیل نے جواب میں کہا۔ "کئی لوگ اسلامی تعلیم کا مطالعہ کئے بغیر مسلمان ہو جاتے ہیں مگر بھابھی نے ایسا نہیں کیا، اس نے میرے کہنے پر اہم کتابوں کا سمجھ کر مطالعہ کیا اور پھر جب اسلام کی سچائیاں اس پر واشگاف ہو گئیں تو اسے اسلام قبول کرنے میں تامل نہیں ہوا۔"

عزیزہ نے کہا۔ "بھائی جان! اگر یہ اتنی زیادہ بدل گئی ہیں کہ بالکل ہماری زبیدہ معلوم ہوتی ہیں،"

زبیدہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "فرض کرو نہیں بھی معلوم ہوتیں تب بھی انھیں بنا لیجیے۔ اس میں کیا ہرج ہے۔"

"یعنی؟" عقیل نے پوچھا۔

"یہی کہ کرامت بھائی کے ساتھ ——" زبیدہ نے نامکمل فقرہ کہہ کر اپنا مفہوم سمجھایا۔

عقیل مسکرا کر کہنے لگا۔ "شاید تم لوگ باور نہ کرو، جس روز برتھاؤن نے اسلام لانے اور کسی مسلمان کے ساتھ شادی کرنے کا انتظام کر دینے کی درخواست کی تھی، اسی وقت مجھے خیال آیا تھا کہ اگر کرامت مان جائے تو دونوں کے لیے اور خود ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔"

عزیزہ نے کہا۔ "بھائی جان! کرامت بھیا کا ماننا کیسا وہ تو مانے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" عقیل نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

عزیزہ نے جواب دیا۔ "میں نے کرامت بھائی کو کئی بار عائشہ کی طرف ٹکٹکی لگاتے دیکھا ہے۔"

عقیل نے کہا۔ "عزیزہ تم بہت شریر ہو، تمہارا کام ہی یہ ہے کہ تم لوگوں کو ٹکٹکی لگاتے دیکھتی رہتی ہو۔"

عزیزہ نے کہا۔ "بھائی جان میں نے زیادہ لوگوں کو تو نہیں دیکھا، ایک زبیدہ کو دیکھا تھا اور ایک یہ . . . ."

زبیدہ نے بات پوری نہ کرنے دی اور زوردار چپت رسید کر کے اسے بھگا دیا اور پھر اسے مزید زد و کوب کرنے کے لئے اس کا دیر تک تعاقب کرتی رہی۔

زبیدہ کے والدین دونوں بہنوں کو خوش خوش کھیلتے دیکھ کر باغ باغ ہو رہے تھے —— اتنے میں بشارت نے آواز دی "جناب میں دسترخوان لگانے لگا ہوں، چلیئے سب کمرے میں۔" اور دس منٹ کے اندر اندر سب عقیل کے کمرے میں پہنچ کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

عائشہ کی بنائی ہوئی فیرنی کی ڈبل روٹی سب سے زیادہ کرامت کو پسند آئی جس کے بار بار اظہارِ پسندیدگی نے سب کو معنی خیز مسکراہٹ پر مجبور کر دیا۔

عزیزہ اور زبیدہ بے اختیار ہنسی کو روک نہ سکیں، بالآخر وہ دسترخوان سے اٹھ کر باہر چلی گئیں کہ طوفان تھمے گا تو واپس آجائیں گی"۔

۲۶

پہلی مارچ کی رات جمیلہ بوحائرڈ کے لئے پریشان کن تھی کیونکہ اس کی قدرتی پریشانی پر اس کا وہ سچا اور پرخلوص جذبہ غالب تھا جس نے سیاسی میدان میں قدم رکھتے ہی سوچ لیا تھا کہ ہر قدم پر اس کا انجام موت بھی ہو سکتا ہے، لیکن مسلم ممالک کی بالعموم اور الجزائر تیونس اور مراکش کی بالخصوص راتیں سخت کشمکش میں کٹ رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ۲۔ مارچ کا سورج بھی کانپ کانپ کر نکلے گا۔

آخر ۲۔ مارچ کا سورج طلوع ہوا، کاروبار کھلے، بازاروں، گلیوں اور منڈیوں میں انسانی آبادی کی حرکات وسکنات نے زندگی کا ثبوت دینا شروع کیا۔ عدالتیں بھی کھلیں، اس عدالت کا بھی دروازہ کھلا جس میں جمیلہ بوحائرڈ کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا جانا تھا، عدالت سے باہر آج مسلمان مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں پہنچے ہوئے تھے۔

عدالت کا کمرہ بھی لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ گیلری کے

چاروں جانب مسلح فوجی بندوقوں والے تھے۔ کچھ دوسرے فوجی سرو کی طرح ایستادہ تھے ان کے پہلوؤں میں سٹین گنیں ان کے انگلی دبانے کی منتظر تھیں۔

جمیلہ بوحائرڈ کمرۂ عدالت میں آئی تو سیاسی جلسے کی طرح فلک شگاف نعرہ لگا۔ "جمیلہ بوحائرڈ زندہ باد، جمیلہ بوئنرہ زندہ باد، الجزائر پائندہ باد۔" اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

مجسٹریٹ نے فیصلہ سنانے سے پہلے کہا "مس جمیلہ بوحائرڈ آپ اگر اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے سے پہلے کچھ کہنا چاہتی ہیں تو آپ کو اجازت دی جاتی ہے۔"

جمیلہ بوحائرڈ نے اپنے حق سے فائدہ اٹھایا۔ "مجسٹریٹ صاحب! میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے اپنے ملک الجزائر سے حقیقتاً محبت ہے اور میں اسے آزاد دیکھنے کی متمنی ہوں۔ میں نے آج تک جس قدر کوششیں کیں سب اسی کو آزاد کرنے کے لئے اور اب بھی مجھ سے جو کچھ ممکن ہوا اسی کی خاطر کروں گی۔ آپ کی حکومت نے جس قدر مجھ پر ظلم روا رکھا اس کی کہانی میرے روئیں روئیں پر لکھی ہوئی ہے اور اب جو فیصلہ سنوں گی، اس کی سماعت صرف میرے کان ہی نہ کریں گے بلکہ الجزائر کی مٹی کے کروڑوں ذرّے بھی کریں گے۔ ہو سکتا ہے میری سزا موت کی ہم آغوش ہو لیکن یہ سزا دینے کے بعد یاد رکھئے کہ آپ اپنے ہاتھوں اپنے ملک کی آزادی کی روایات کا خون کرکے اس کے وقار کو خاک میں ملا رہے ہیں ...... اب میں فیصلہ سننے کو تیار ہوں۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔ "عدالت کی نظر میں آپ باغی ثابت ہو چکی ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا گواہ آپ ہی کا فرد آپ ہی کی جماعت کی ساتھی اور آپ ہی کی ہم نام جمیلہ بوئنرہ ہے۔ سارے کیس پر غور و خوض کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ نے حکومتِ فرانس کی بغاوت میں نمایاں طور پر حصّہ لیا ہے، لہٰذا آپ کو سزائے موت دی جاتی ہے۔"

سزائے موت سن کر جمیلہ بوحائرڈ کے چہرے پر قطعاً ایسے آثار پیدا نہ ہوئے جو اس کی پریشانی ظاہر کرتے۔ البتہ عدالت کے کمرے میں اور کمرے سے باہر لوگوں میں شور برپا ہو گیا۔

"جمیلہ بوحائرڈ زندہ باد۔" "الجزائر پائندہ باد۔" "اور جمیلہ کبھی نہیں مر سکتی۔" ———

کے نعرے بلند ہونے لگے۔ جمیلہ نے بھی ایک نعرہ لگایا۔ "الجزائر کبھی محکوم نہ رہے گا۔"

جمیلہ کو قیدیوں کی گاڑی میں سوار کر کے قید خانے روانہ کر دیا گیا۔

جمیلہ کی سزائے موت کی خبر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہر جگہ پہنچ گئی، عدالت میں رپورٹر پہلے سے موجود تھے، انھوں نے ٹیلیفونوں، تاروں اور وائرلیس کے ذریعے ملک ملک میں یہ جانکاہ خبر پہنچا دی۔ اس خبر سے الجزائر ہی متاثر نہ ہوا، ہمسایہ ممالک مراکش، تیونس اور پھر تمام اسلامی ممالک پاکستان ایران، افغانستان، ترکی، مصر، عرب بھی متاثر ہوئے۔ اس سے ہندوستان، امریکہ اور روس بھی متاثر ہوئے۔

زبیدہ کے گھر میں جمیلہ بوحائرڈ کے متعلق جو فیصلہ ایک دلچسپ موضوع بنا ہوا تھا، اب وہ دلچسپ موضوع نہ رہا، گھر کی دونوں پارٹیاں یہ بات بھول ہی گئیں کہ انھوں نے آپس میں شرط لگا رکھی تھی۔ جمیلہ کے بارے میں سزائے موت کا فیصلہ ایسا ہی تھا جیسے زبیدہ سے کہہ دیا جائے کہ عقیل تمہیں نہیں ملے گا۔ اسی طرح گھر کے دوسرے افراد پر بھی اس فیصلے نے ایسا ہوشربا اثر ڈالا کہ انھوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔

کرامت، عزیزہ، عقیل، زبیدہ، عائشہ اور زبیدہ کے والدین اکٹھے بیٹھے تھے۔ آج کرامت کی زبان سے یہ لفظ بالکل نہ نکلے کہ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ جمیلہ کو سزائے موت ہوگی۔" اور نہ زبیدہ یا عقیل نے یہ کہا کہ "کرامت کا خیال صحیح نکلا۔" بلکہ برعکس اس کے کرامت کی زبان سے کئی مرتبہ یہ لفظ نکلتے رہے کہ "یہ کیا ہو گیا"—— "ایسا تو نہ ہونا چاہئے تھا"—— "یہ تو ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔"

لطف یہ کہ اس کے بعد کئی مہینے گذر گئے، ان کے معمولات بحال ہو گئے، لیکن یہ موضوع پھر کسی کو زیر بحث لانے کی ہمت نہ ہوئی کہ جمیلہ کو سزائے موت کس طرح مل گئی؟!

جمیلہ کے لئے سزائے موت کا فیصلہ حکومت فرانس کی اتنی کامیابی نہ تھی جتنی جنرل سالان کی۔ شروع شروع میں جمیلہ کا گرفتار نہ کیا جا سکنا بھی اس کے نزدیک سخت ناکامی پر دلالت کرتا تھا لیکن

گرفتاری کے بعد جو فیصلہ کیا گیا اس کے خلاف غم و غصہ کی لہر کا ملک ملک میں پہنچ جانا پہلی ناکامی سے زیادہ درجے کی شکست کا احساس دلا رہا تھا۔ جنرل سالان دل میں سوچتا تھا کہ ایک لڑکی جو بمشکل بائیس تیئس یا زیادہ سے زیادہ چوبیس سال کی ہوگی، حکومتِ فرانس اور خود اس کے لئے کتنی بڑی پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اور اب جو اسے سزائے موت دی گئی ہے تو اس کی ذات کے سوا ہر اہم شخصیت اس کے لئے پریشان ہے۔

سزائے موت کا سننا تھا کہ دنیا کے اہم ملکوں کے ادیبوں، صحافیوں، پروفیسروں، مزدور رہنماؤں، پادریوں اور خلاسفروں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ حکومت فرانس پر جمال عبدالناصر، خروشیف، آئزن ہاور، ملکۂ انگلستان، جواہر لال نہرو، سوکارنو اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری وغیرہ نے اخلاقی دباؤ ڈالا۔

فرانس کے کمیونسٹ اخبار لاہومنتے سے لے کر قدامت پسند اخبار لیفگار دتک نے احتجاجی مقالے لکھے، جنرل ڈیگال کے پاس ایسے ایسے احتجاج اور ایسی ایسی درخواستوں کے ڈھیر لگ گئے کہ اس کا ان سے چھپنا مشکل ہو گیا وہ کہیں بھی ہوتا تصور ہی تصور میں اسے کبھی کوئی شخصیت جمیلہ کی سزائے موت بدلنے کی درخواست کر رہی ہوتی اور کبھی کوئی۔ اس وقت اس کے مضبوط کندھوں پر سب سے بڑا بوجھ الجزائر کا مسئلہ تھا لیکن آج کل یہ مسئلہ پیچھے رہ جاتا اور جمیلہ کے بارے میں فیصلے کی تبدیلی کا احتجاج آگے آجاتا۔

جنرل سالان کے بارے میں شاید پہلے کہیں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ باوجود قابل قدر اوصاف رکھنے کے جنرل سالان میں ایک ناقابلِ معذرت خرابی یہ تھی کہ وہ منفی قوتوں کا ساتھ دیتا تھا اس کے مقابلہ میں جنرل ڈیگال جرأت مند اور بہادر ہونے کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھنے کا شعور رکھتا تھا اور ہر معاملے اور مسئلے کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھنے کا عادی تھا۔ علاوہ ازیں وہ جنرل سالان کے برخلاف مثبت نظریات کا حامی تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جس وقت اس کو اقتدار سونپا گیا تھا، اس وقت اس سے یہ امید

قائم کی گئی تھی کہ وہ الجزائر کو فرانس سے کٹنے نہیں دے گا۔ لیکن یہ امید جنرل ڈیگال کے نزدیک اس وقت قائم کی جاسکتی تھی جس وقت حالات ویسے تھے۔ لیکن بعد میں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ آٹھ نو لاکھ الجزائریوں کی شہادت اپنی قربانی واپس لینے کو تیار نہ تھی۔ جنرل ڈیگال نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا کہ اس کی اپنی شرافت اور حکومت فرانس کی عزت اسی میں ہے کہ آٹھ نو لاکھ شہیدوں کو ان کی شہادت کے عوض الجزائر دے دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس سلسلے میں ابتدائی اقدامات شروع کر دیئے۔ اس نے حالات کے اتار چڑھاؤ کا اس لحاظ سے مطالعہ شروع کر دیا کہ مناسب موقع پر الجزائری رہنماؤں سے تفہیم معاملات کی ابتدا ہو جائے۔

اس سلسلے میں عوام کو مطمئن کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم اُس نے کچھ ماہ بعد یہ اٹھایا کہ جمیلہ کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا، سزا میں یہ تخفیف مختلف ممالک کے سربراہوں کے احتجاجات اور درخواستوں کے باعث بھی ہوئی مگر اس سے زیادہ اثر خفیہ طور پر غازیان الجزائر کے خدا کے حضور پھیلے ہوئے ان ہاتھوں کی وجہ سے ہوا جو جمیلہ کی رہائی کے لئے اٹھے ہوئے تھے اور جن پر دعا مانگنے والوں کے آنسوؤں کے قطرے شبنم کی طرح گرتے رہتے تھے۔

پریشانی لاحق ہو تو خوش حالی اور تفننِ طبع کا سامان دلوں سے محو ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جمیلہ کو جن دنوں میں سزائے موت ملی تھی، ان دنوں زبیدہ کے گھر کی پارٹیاں جمیلہ کی سزا پر بحث و تمحیص یکسر بھول گئی تھیں لیکن اب جب کہ اس کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو کر اس کی جان بچا گئی تو یہ موضوع پورے زور و شور کے ساتھ پھر ابھر آیا۔ زبیدہ جو جمیلہ پر اس کے قومی کارناموں کی وجہ سے جان چھڑکتی تھی، سکول سے واپس آتے ہی کرامت پر برس پڑی۔

"اب بتایئے کون جیتا، ہم یا آپ۔ آپ نے اپنی گفتگو میں اس بات پر کس قدر زور صرف کیا تھا کہ جمیلہ کو حکومت سزائے موت دے کر رہے گی، مگر اب بتایئے۔"

عقیل جو لیٹا لیٹا نگاہیں نیچی کئے کامیابی کے نشے میں مسکرا رہا تھا، بولا۔ "میرا خیال ہے اسی

سوال کا جواب آپ کی پارٹی کے کسی فرد کے پاس نہ ہو گا۔"

خلیل صاحب بولے۔"دراصل ہمارا پروگرام آپ لوگوں کو فتح دلانے کا تھا۔ اگر ہم مخالفت نہ کرتے تو مقابلے کا سوال ہی پیدا نہ ہونا تھا، عقیل چونکہ ہمارا معزز مہمان ہے اس لئے اس کی عزت کے لئے ہم اس سے بھی زیادہ کر سکتے ہیں۔"

عزیزہ نے کہا۔"مثلاً کیا چچا جان؟"

"یہ کہ شکست تسلیم کر لیں تاکہ آپ لوگوں کی خوشی ادھوری نہ رہے —— کیا خیال ہے عائشہ"

اور عائشہ نے کہا۔"میں تو شکست تسلیم کرنے کی عادی ہو چکی ہوں، اس لئے مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے۔"

عائشہ کے اس معنی خیز جملے پر سب نے قہقہہ لگایا مگر عورت ذات ہونے کی وجہ سے زبیدہ کو اس پر پہلی بار رحم آیا۔ اِس لمحے اس کا جی چاہا کہ عقیل کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دے اور کہے "لو شکستیں کھانے کے عادی لوگوں کو قدرت کبھی فتح بھی دے دیتی ہے۔" لیکن اسے فوراً یہ خیال آیا کہ اگر واقعی اس نے ایسا کر دیا تو وہ خود کس طرح زندہ رہ سکے گی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے عائشہ کے جواب پر پیدا شدہ کسک کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کا اثر مذاق میں اڑا دینے کی ناکام کوشش شروع کر دی۔

عائشہ کے معنی خیز جملے پر ہنسی کا طوفان تھما تو کرامت بولا۔"میں عورت نہیں کہ چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھا رہوں میں مردِ میدان ہوں، میں شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

زبیدہ نے فوراً کہا۔"کیا آج کے الجزائر میں عورتیں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھی ہیں یا قومی خفیہ تنظیموں میں شامل ہو کر بڑے سے بڑے خطرات کا مقابلہ کرتی ہیں؟"

کرامت نے کہا۔"میری مراد جمیلہ سے نہیں۔"

"تو کیا عائشہ بہن سے ہے۔" عزیزہ نے تیز ہو کر مذاق میں کہا۔"

تھی تو یہ ساری گفتگو تفننِ طبع کے لئے مگر کرامت نے عزیزہ کے طعن پر سنجیدگی سے

غور کیا تو اس سے بڑی غلطی ہوئی تھی چنانچہ اس نے بظاہر بڑی سنجیدگی کے ساتھ عائشہ سے معافی مانگی۔

عائشہ نے ہنستے ہوئے کہا "میں آپ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتی۔ اور ہر جانے کے طور پر اس پارٹی کو چھوڑتے ہوئے دوسری پارٹی میں شامل ہو جاتی ہوں۔"

عائشہ کے اس پر لطف فقرے نے زبیدہ کی پارٹی کو تالی بجانے کا موقع دے دیا جسے سب کے قہقہوں نے دبا دیا۔

اپنی ہنسی روکتے ہوئے کرامت نے کہا "حقیقتاً میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور اپنی پارٹی کے بچے کھچے دو معزز ممبروں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کامیاب ہوں گا اس لئے وہ عائشہ بہن کی پیروی کا خیال دل میں نہ لائیں۔"

کرامت کے ان فقروں نے بھی بہت لطف بہم پہنچایا جس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

کرامت نے مزید کہا "سنئے زبیدہ بہن اینڈ کو غور سے سنئے!"

عائشہ نے کہا "اگر آپ کے پاس دلائل کی پونجی ہے تو ہماری قوتِ سماعت کو ضرور تکلیف دیجیے ورنہ ہمیں اپنی فتح پر کوئی خوش کن پروگرام مرتب کرنے کی اجازت دیجیے۔"

"میں اجازت نہیں دے سکتا۔" کرامت نے کہا "میرے پاس ساری پونجی دلائل کی ہے، آئیں بائیں شائیں کی نہیں۔"

سب ہنس دئے اور کرامت نے کہا "دیکھئے میرا دعویٰ یہ تھا کہ حکومت جمیلہ بوحائرڈ کو سزائے موت دے کر رہے گی۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ اسے سزائے موت ہوئی، آگے جا کر اس کی سزا میں تخفیف ہوئی ہے تو یہ دوسری بات ہے۔"

عقیل نے کہا "دیکھئے میں انصاف کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے دونوں پارٹیوں کی صلح صفائی کرائے دیتا ہوں۔ میرے خیال میں دونوں پارٹیوں کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ ایک پارٹی کہتی تھی کہ سزائے موت مل کر رہے گی، سو مل گئی اور دوسری کہتی تھی کہ سزائے موت کبھی نہیں مل سکتی، دیکھ لیجیے اسے سزائے موت نہیں ملی، وہ زندگی کے دن جیل میں کاٹ رہی ہے۔"

عقیل کی اس وضاحت پر دونوں پارٹیوں نے خوشی کی تالیاں بجائیں۔ جلیل صاحب بولے۔

"برخوردار! تم واقعی عقیل ہو، تمہارا دل و دماغ عقل سے بھرا ہوا ہے، اگر تم اس وقت عقل سے کام نہ لیتے تو دونوں پارٹیوں کے متصادم ہو جانے کا خطرہ تھا، بہرحال شکر ہے اس خدا کا جس نے عقیل کو اتنی عقل دی ہے۔"

عائشہ نے کہا "اس سمجھوتے کے بعد میں اکیلی ایک بات کا دعویٰ کرتی ہوں جسے کبھی واپس نہ لوں گی وہ یہ کہ حکومت فرانس جمیلہ کو زیادہ عرصہ تک قید نہ رکھ سکے گی۔"

عائشہ کے اس دعوے پر کرامت فوراً بولا "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

زبیدہ نے شرارت سے کہا "مگر کرامت بھائی! عائشہ بہن تو اس دعوے میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتیں، جیسا کہ انھوں نے کہا "میں اکیلی دعویٰ کرتی ہوں۔"

"مگر میں اس دعویٰ میں ضرور شریک ہونا چاہتا ہوں۔" کرامت نے زوردار لفظوں میں کہا۔"

اس جملے پر زبیدہ اور عزیزہ ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھنے لگے،

کرامت اپنی نگاہیں جھکائے ہوئے چور مسکراہٹ سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔

عزیزہ اور زبیدہ دونوں کی نظر عائشہ پر پڑی تو اس پر پہلی مرتبہ مسلم حیادار عورتوں کی سی حیا چھائی ہوئی دکھائی دی۔ اچھا ہوا کہ زبیدہ کے والدین نے موضوع بدل دیا

"میرا یہ خیال ہے کہ جنرل ڈیگال کے بیانات میں الجزائریوں کو حق آزادی دینے کا منشا چھپا ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو بالکل صاف بات ہے۔" کرامت نے کہا "جنرل ڈیگال کے ایک بیان میں یہ فقرہ بھی موجود تھا کہ اگر الجزائری مجاہدین کا مطالبہ مناسب ہے تو میں اس پر ہر وقت غور کرنے کو تیار رہوں۔"

عقیل نے کہا "آزاد الجزائر کی حکومت کو برداشت کر لینے کا بھی یہی مطلب ہے

کہ جنرل ڈیگال کا طبعی رجحان کامل آزادی دے دینے کا ہے"۔

عائشہ نے کہا "ایک اور دلیل بھی تو ہے"۔

"وہ کیا؟" زبیدہ کی والدہ نے متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ خود فرانسیسیوں اور یورپی آباد کاروں میں بہت سے رہنما اور عوام جنرل ڈیگال کے مخالف ہو گئے ہیں۔ ان کی مخالفت کی وجہ یہی ہے کہ اس نے الجزائریوں کا موقف درست سمجھ لیا ہے"۔

عائشہ کا یہ استدلال سبھی کو پسند آیا۔ زبیدہ نے کہا "عائشہ بہن آپ تو گودڑی کا لعل ثابت ہوئیں، میں سمجھا کرتی تھی کہ آپ کی سیاست فہمی بس یوں ہی سی ہوگی مگر آج آپ کی گفتگو نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم سیاست کے موضوع پر سوچ سمجھ کر بات کیا کریں"۔

زبیدہ کے والدین نے بھی تعریف کی عقیل اور عزیزہ نے بھی البتہ کرامت خاموش رہا۔

زبیدہ کو شرارت سوجھی "کرامت بھائی آپ نے کوئی رائے قائم نہیں کی"۔

اور کرامت بولا "درحقیقت مجھے ایسے موزوں لفظ مل نہیں رہے جن کے استعمال سے عائشہ کی قابلیت کی صحیح معنوں میں تعریف ہو سکے"۔

کرامت کے اس جملے نے ایک بار پھر زبیدہ اور عزیزہ کے اشارات کو آنکھ مچولی کھیلنے کا موقع دیا۔ اس آنکھ مچولی کے تماشے سے زبیدہ کے والدین بھی واقف ہونے کے بعد معاملے کی تہ تک پہنچ گئے جبھی تو انھوں نے موضوع کا رخ پھیر دیا۔

"اس میں تو واقعی شک نہیں کہ عائشہ ہم سب کے لئے وجہِ صد افتخار ہے اچھا یہ بھی تو سوچیے ۔۔۔۔۔۔"

یہ فقرہ زبیدہ کی والدہ کا تھا جسے عائشہ نے پورا نہ کرنے دیا۔ "آپ لوگوں نے خواہ مخواہ ذرے کا پہاڑ بنا دیا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں"۔

جلیل صاحب بولے۔ "نہیں بیٹی تمہاری سیاسی بصیرت کے متعلق جو بھی تعریفی کلمات

کہے گئے ہیں حقیقت اور خلوص پر مبنی ہیں اس لئے تمہیں چاہئے کہ جس جس نے تعریف کی ہے ان کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرو۔"

عائشہ نے اپنی شرم چھپانے کے لئے خوب جواب دیا۔"چچا جان! نہ تو میں اس تعریف کے لائق ہوں جو میرے ساتھ وابستہ کی گئی ہے اور نہ میں شکریہ ہی ادا کرتی ہوں۔"

زبیدہ نے جواب دیا۔"اور ہمارا خلوص؟"

"ہاں اس کا مشترکہ شکریہ" عائشہ نے جلدی سے اظہار تشکر کر دیا۔

"مشترکہ کا لفظ سن کر کرامت نے اپنی چور ہنسی چھپانے کی بڑی کوشش کی لیکن عزیزہ اسے احساس دلا کر رہی۔"

عائشہ اس رنگین قسم کی الجھن سے نکلنے کے لئے زبیدہ کی والدہ سے کہنے لگی۔"ہاں تو آپ کیا کہنے والی تھیں۔ آپ نے فرمایا تھا"یہ بھی تو سوچئے۔ ۔ ۔" افسوس کہ میں نے اس وقت آپ کا قطع کلام کر لیا تھا۔

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔"ہاں بیٹی میں یہ کہنے والی تھی کہ ہمارے سوچنے اور غور کرنے کی بہت سی باتیں ہیں مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ کیا محض جنرل ڈیگال کے الجزائریوں کو حق خود ارادیت دے دینے کی خواہش سے آزادی مل جائے گی؟ کیا فرانسیسی قوم بشمول یورپی آباد کار جنرل ڈیگال کو صدارت سے الگ نہ کرا دے گی؟"

"ہرگز نہیں" خلیل صاحب بولے۔"حکومتِ فرانس کے وزرا اور رہنما یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت جنرل ڈیگال سے زیادہ کوئی ایسا ہوش مند رہنما نہیں جو موجودہ انتہائی بگڑے ہوئے حالات پر صحیح معنوں میں قابو پا سکے۔ آٹھ نو لاکھ مجاہدین کی شہادت کوئی معمولی سا واقعہ نہیں، فرانس کو یہ بھی ڈر ہے کہ بچے کھچے الجزائری مجاہد جو اپنے عزائم میں چٹان ہی نہیں سٹین گنیں اور توپیں بھی ہیں، اپنے انتقامی اقدامات میں فرانس کو بھی لپیٹ میں نہ لے لیں۔ یہ ہیں وہ حقائق جن پر جنرل ڈیگال جیسے ہوش مند رہنما کی واشگاف نظر ہے۔ انقلاب ہمیشہ انقلابی

حالات لایا کرتے ہیں۔ جو اتفاقی حالات الجزائر میں مدت مدید سے قائم ہیں جن کی شدت کو جنرل سلاں کی متشددانہ پالیسی بھی کم نہیں کر سکی، ان سے ڈر کر نہیں بلکہ ان کے حقائق تسلیم کر لینے کے بعد جنرل ڈیگال نے آزادی کی مراعات دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔"

عقیل نے کہا۔ "چچا جان! آپ نے بالکل درست فرمایا، مگر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آزادی کی مراعات دینے کے لئے ہمارے رہنماؤں مثلاً بن باللہ اور بن خذہ وغیرہ کو رہا کرنا پڑے گا؟

زبیدہ نے کہا۔ "ہاں تو اور کیا۔"

جلیل صاحب بولے۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آزادی فوراً دے دی جائے گی۔ آزادی دینے سے پہلے جنرل ڈیگال یہ بات سو مرتبہ سوچے گا کہ کیا الجزائری قوم آزادی حاصل کرنے کی قابلیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ اسی لئے وہ حالات کے مطابق آہستہ آہستہ قدم اٹھائے گا۔ اس وقت فرانسیسی جیلیں ہمارے بے شمار مجاہدین سے بھری پڑی ہیں۔ آزادی دیتے وقت الجزائری رہنماؤں سے گفتگو کرنے کے بعد مسلمان قیدیوں کو بھی تو ۔۔۔ ۔۔۔"

"یہ کیا؟" عقیل نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے حملہ آور بم چلا رہے ہیں خدا سب کو محفوظ رکھے۔"

ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا ۔۔ ۔۔ کتنے ہی بم چل پڑے جن کی مسلسل آوازوں نے سیاسی گفتگو کو منقطع کر دیا۔

۲۷

جنرل ڈیگال برسرِ اقتدار آنے کے بعد الجزائری باشندوں کو یہ یقین دلانے کی بڑی کوشش کرتا رہا کہ وہ ان کا ہمدرد ہے۔ اس نے نئے آئین کا بھی آئینہ دکھایا، پھر اس نے استصواب رائے کا بھی سبز باغ دکھایا، لیکن وہ باشندے جنہوں نے اب تک ۹ لاکھ جانی قربانیاں حصولِ آزادی پر بھینٹ چڑھادی تھیں، نئے آئین کے سبز باغ کو سبز باغ سے زیادہ وقعت دینے کو تیار نہ تھے۔

یہ دن اگست کے اوائل کے تھے اور الجزائریوں کا یہ حال تھا کہ وہ ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر بھی دُور ہو کر ایک دوسرے کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے جو باشندے دفتروں کو روانہ ہو گئے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ان میں سے کئی حکومت کے حملوں کا شکار ہو کر گھر والوں کے لئے حزن و ملال کا باعث بنے۔ کئی بار ایسا ہوتا رہا کہ ایک آدمی یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ "ابھی واپس آتا ہوں" مگر وہ واپس نہ آیا۔ ایسے حالات میں حریت پسندوں کی مختلف جماعتیں یکجا ہونے کی فکر کرنے لگیں۔

مارچ کے مہینے میں جب جمیلہ بوحارڈ کو سزائے موت ملی تھی تو الجزائری باشندوں کو ۲۰ مارچ کا وہ دن یاد آگیا تھا جب کہ مراکش نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں مراکش کی آزادی کے دن نے ان کی رگوں میں خون کی روانی تیز کردی تھی۔ ۲۰ مارچ کا دن یاد کرتے کرتے جب اپریل آگیا تو ان کے ہاتھ پاؤں میں اس جذبے نے نئی طاقت بھر دی کہ یہ وہی مہینہ ہے جس میں تیونس کے باشندوں نے آزادی حاصل کی تھی۔

ہمسایہ ملکوں کی آزادی کے ان دنوں نے الجزائریوں کو اپنے ملک کی آزادی کے لئے پابرکاب کردیا تھا، اب جب کہ اگست کا مہینہ آگیا تو انھیں ایک اور تحریک آزادی یاد آگئی۔ انھیں یاد آگیا کہ ۱۴ اگست کو پاکستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہوا تھا اور یہ آزادی آسمان کے فرشتوں نے نہیں بلکہ زمین کے اُن مخلص مسلمانوں نے دلائی تھی جو ایمان، اتحاد اور تنظیم کی متاعِ عزیز سے مالا مال تھے ۱۴ اگست سے پہلے وہ پاکستان کی آزادی کو یاد کرتے رہے اور ۱۴ اگست کے دن ایسے بے قابو ہوئے کہ انھوں نے حکومت کے حملوں کا زیادہ موثر جواب دینے کا تہیہ کرلیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اگر انھوں نے مختلف ٹولیوں کی بجائے حصول آزادی کی تحریک کے لئے ایک ہمہ گیر مرکز الجزائر میں بنایا تو ان کے منصوبے کو ختم کردیا جائے گا، اس لئے بڑے بڑے رہنماؤں نے مل کر کسی ہمسایہ ملک میں مرکز بنانے کی تجویز سوچی حسن اتفاق سے مراکش اور تیونس دونوں کو الجزائر کی آزادی سے بے حد دلچسپی تھی بلکہ ان کا ابھی تک وہ غم و غصہ بھی فرو نہ ہوا تھا جس کا تعلق بن بالّلہ اور اس کے چار ساتھیوں کی اچانک گرفتاری سے تھا۔

بن بالّلہ اور اس کے ساتھی، محمد خضر، احمد حسین، مصطفےٰ اشریف اور محمد بزلیف ابھی تک فرانس میں قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے اور دوسرے رہنما قاہرہ میں محاذِ آزادی بنانے کی فکر کر رہے تھے۔ حکومت مراکش کو چونکہ الجزائر کی جد وجہد بہت عزیز تھی اس لئے اس نے الجزائر کی آزاد حکومت کا ہیڈ کوارٹر بنانے کی خوشی سے اجازت دے دی چنانچہ ۱۱ ستمبر کو آزاد حکومت کی بنیاد رکھ دی گئی اور فرحت عباس کو اس آزاد حکومت کا وزیر اعظم مقرر کردیا گیا۔ فرحت عباس نے وزارتِ عظمےٰ

پر فائز ہوتے ہی یہ الفاظ کہے "ایک کروڑ غلاموں سے ایک کروڑ لاشیں بہتر ہیں"۔

آزاد الجزائر کے وزیر اعظم کی اس دکھی ہوئی آواز نے تشدد پسندوں پر یہ ثابت کر دیا کہ الجزائری مسلمان جو ۸، ۹ لاکھ افراد کی قربانی دے چکے ہیں، اگر ان کی آبادی ۸، ۹ کروڑ بھی ہوتی تو اس کا بچہ بچہ خوشی سے قربانی کی بھینٹ چڑھ جاتا۔

قاہرہ کے باشندوں نے جب دیکھا کہ الجزائر کے قومی محاذِ آزادی (الیف ایل-این) کے دفتر پر سبز و سفید ہلالی پرچم لہرا رہا ہے تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، لوگ جوق در جوق پرچم کے نیچے جمع ہو گئے اور آزاد الجزائر کے نعرے لگانے لگے۔ آزاد الجزائر کے وزیر اعظم فرحت عباس نے بیان دیا کہ الجزائر کی قومی مجلس کی تجویز کے مطابق جو ۲۸ر اگست ۱۹۵۶ء کو کی گئی تھی، آج ۱۱ ستمبر ۱۹۵۸ء سے الجزائر کو ایک آزاد سلطنت تصوّر کیا جائے گا"۔

فرانسیسی حکومت نے مراکش کو اس بات پر مجبور کرنے کی بڑی کوشش کی کہ وہ آزاد حکومت کا دفتر بنانے کی اجازت نہ دے لیکن اس نے فرانسیسی حکومت کو واضح لفظوں میں بتا دیا کہ مراکش اور الجزائر میں کوئی فرق نہیں۔

اِس اعلان سے حکومتِ فرانس پر ثابت ہو گیا کہ تیونس اور مراکش کسی قیمت پر الجزائر کی ہمدردی سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتے، نیز اِن نو آزاد ممالک کو جو ہمدردی دوسرے ہمسایہ ممالک سے حاصل ہے وہ بھی مراکش کو آزاد الجزائر کا محاذ قائم کرنے سے روک نہ سکے گی، اس لئے جنرل ڈیگال نے مناسب یہی سمجھا کہ وہ اپنی داخلی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیانات میں اب موالات کا رنگ شامل کرنا شروع کر دیا۔

جنرل سالان جو مجاہدینِ آزادی کو کچلنے کے لئے فرانسیسی افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے الجزائر میں ۱۹۵۶ء سے مقیم تھا اور جس نے اسی سال کے آغاز میں جنرل ڈیگال کا نام وزارتِ عظمےٰ کے عہدے کے لئے تجویز کیا تھا خود اس کے دور اقتدار میں اس کے نئے ارادوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے کئی ایک ہم خیال احباب سے اس بات کا ذکر بھی کیا "جس مقصد عزیز کی خاطر

ہیں نے الجزائری مسلم آبادی کا دسواں حصّہ کچل کر رکھ دیا ہے اسی مقصدِ عزیز کو جنرل ڈیگال جیسا باشعور صدر نقصان پہنچانے کے درپے ہو گیا ہے۔"

جنرل سالان کو جنرل ڈیگال کی نرم پالیسی ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھائی اور وہ اس پالیسی کو بدلوانے کے لئے تدبیریں کرنے لگا۔

جنرل ڈیگال چونکہ حقائق پسند انسان تھا اس لئے اسے جب جنرل سالان کی خرابیٔ نیت کا علم ہوا تو وہ جنرل سالان کے ارادوں سے چوکس ہو گیا۔

جنرل ڈیگال کے برسر اقتدار آنے سے پہلے جنرل سالان پہلی حکومتوں کے سیاسی نظریات کے حق میں تھا، خاص طور پر الجزائر کے متعلق ان کی پالیسی کے بارے میں جنرل سالان بہت حد تک پُرامید تھا لیکن جب جنرل ڈیگال صدر بنا تو اس کی پالیسی نے جنرل سالان کو ناامید کر دیا۔ صدر ڈیگال شروع ہی سے حقائق پسند ہونے کی وجہ سے الجزائری عوام کے لئے حق خود ارادیت کا حامی تھا۔ چونکہ جنرل ڈیگال نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جنرل سالان الجزائر میں من مانی کارروائیوں سے باز نہ آئے گا اور اس طرح وہ الجزائر کے متعلق صدر ڈیگال کی پالیسی کو ناکام بنانے میں ممد ثابت ہوگا اس لئے اس نے جنرل سالان کو انسپکٹر آف ڈیفنس کا ایک اعزازی عہدہ دے کر پیرس میں طلب کر لیا۔

آزاد الجزائر کی آزاد حکومت کو اب اس بات کا بہت حد تک اطمینان حاصل ہو گیا کہ الجزائریوں پر اچانک فوجی حملے جنرل سالان کے چلے جانے کے بعد اپنی موت آپ مر گئے ہیں۔ آزاد الجزائر کو فوجی حملہ آوروں کی مدافعت کی بجائے حصولِ آزادی کیلئے کوشش صرف کرنے کا موقع مل گیا۔

جنرل سالان کی جگہ الجزائر میں اب جنرل جارس کیلئے کام کر رہا تھا لیکن اس کی فوجی پالیسی جنرل ڈیگال کی ہدایت کے مطابق بہت نرم تھی، پیرس میں بیٹھا ہوا جنرل سالان اس نرم پالیسی پر کڑھ رہا، وہ اِس موقع کی تلاش میں رہنے لگا کہ کسی طرح من مانی کارروائی کر سکے لیکن اس کے لئے اسے راستہ نہ مل سکا۔

الجزائر کی آزاد حکومت قائم ہو جانے پر الجزائر کے ہر گھر کو خوشی حاصل ہوئی لیکن شادمانی کی جو

فضا زبیدہ کے گھر میں پیدا ہوئی، معلوم ہوتا تھا، کسی اور گھر میں پیدا نہ ہوئی ہوگی۔

۱۹۵۸ء ختم ہوکر ۱۹۵۹ء شروع ہو چکا تھا اور عقیل پوری طرح تندرست ہو کر اپنے گھر جانے کی فکر میں تھا۔ جب سے آزاد الجزائر کی حکومت قائم ہوئی تب سے زبیدہ تو جیسے خوشی کی شدت کی وجہ سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ عقیل کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔

عزیزہ عائشہ اور زبیدہ کے والدین عقیل کو زبیدہ کو انتہائی خوش دیکھ کر ہنستے تھے "یا اللہ ان کو کیا ہوگیا ہے۔"

ایک شام عائشہ نے عقیل سے بڑی معقول بات کہی بھائی جان! میں نے ایک مقولہ سن رکھا ہے کہ "کمالے را زوال"۔

فارسی زبان کا یہ مقولہ سنتے ہی عقیل اس کے پیچھے پڑ گیا۔ "کہو تم نے فارسی زبان کس سے سیکھی ہے۔ فارسی سے میں خود اتنا واقف نہیں۔ لیکن تم تو ہماری ہی زبان مشکل سے بول سکتی ہو، پھر تمہیں یہ مقولہ کس نے یاد کرا دیا؟"

عائشہ نے کہا "یہ مقولہ میری ایک سہیلی نے ایک تاریخی واقعہ سناتے وقت استعمال کیا تھا۔ اور مجھے اس کا مطلب بتانے سے پہلے اس مقولے کو فارسی زبان ہی میں بیان کیا تھا۔ چونکہ مجھے یہ مقولہ بہت پسند آیا تھا اس لئے میں نے اس مقولے کو اس کی اصلی زبان ہی میں یاد کر لیا۔ ۔۔۔ ہاں تو میں آپ سے یہ کہنے والی تھی کہ ہر بات میں کمال (EXTREME) نتیجے کے لحاظ سے اچھی نہیں ہوتی، آپ کا آزاد الجزائر کی حکومت کے قیام پر خوشی ظاہر کرنا فطری امر ہے اور مجھے بھی جس قدر خوشی حاصل ہوئی ہے وہ عام مسلمانوں سے کم نہ ہوگی۔ لیکن جس قدر خوشی کا اظہار آپ نے اور آپکی خدمت گذار زبیدہ نے شروع کر رکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ لوگوں کو کسی دوسرے کام کا ہوش نہیں۔"

اب عائشہ زبیدہ کی طرف متوجہ ہوئی "میں نے آپ کے بارے میں بھی محسوس کیا ہے آپ اس گھر کی صفائی اور سلیقہ کے لئے جو مستعدی دکھایا کرتی تھیں، وہ اب ناپید ہے۔ آپ جتنی توجہ اپنی تعلیم میں دیا کرتی تھیں، وہ اب آپ کی بے پایاں مسرت میں گم ہوگئی ہے، حالانکہ آپ کی خوشی کا ردِ عمل

یہ ہونا چاہئے کہ آپ پہلے سے زیادہ صفائی پسند، سلیقہ شعار اور تعلیم میں پہلے سے کہیں زیادہ ذوق و شوق دکھا سکیں۔ میں نے دیانت داری سے محسوس کیا ہے کہ آپ نے آزاد الجزائر کی حکومت قائم ہونے پر اس کے شایانِ شان خوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اظہارِ مسرت آپ کے مستقبل کو درخشاں نہیں بنا سکتا، اس کے لئے آپ کے پُرجوش عمل کی بھی ضرورت ہے۔"

کرامت نے کہا، "مس عائشہ! آپ نے کمال کر دیا۔"

زبیدہ کے والدین نے باری باری عائشہ کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے اس کی سوجھ بوجھ کی تعریف کی۔

عزیزہ نے کہا، "عائشہ بہن آج آپ کی سنہری باتوں نے میرا دل اتنا موہ لیا ہے کہ میں تو آپ کو زبیدہ سے چھین کر اپنے ہمراہ لے جاؤں گی۔"

عزیزہ نے یہ فقرہ جوشِ مسرت میں بالکل اتفاقی طور پر ادا کیا لیکن اس فقرے نے جو اثر ڈالا وہ بہت معنی خیز تھا اس لئے آج تو سب کے سب اپنی مسکراہٹ اور ہنسی روکنے میں ناکام ہو گئے کرامت کبھی سر کو کھجلاتا اور کبھی گردن کو، متصلاً ہی اپنا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا مگر وہ بُری طرح ناکام ہوا۔

"زبیدہ نے موضوع بدلا"عائشہ بہن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جس ذوق شوق اور انہماک سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے، میں نہیں کر سکی۔ آپ نے مجھ سوئی ہوئی کو اسلام کی جس گرانقدر خصوصیت کا شعور دلا کر جھنجھوڑا ہے، وہ اسلامی خصوصیات میں بہت عظیم درجہ رکھتی ہے۔ حقیقتاً اسلام کا دوسرے مذاہب سے نمایاں فرق اس کے اس فطری اصولوں کی وجہ سے ہے کہ وہ انتہاپسندی کو پسند نہیں کرتا بلکہ اعتدال کے راستے کو معقولیت کا درجہ دیتا ہے آپ نے عائشہ بہن بالکل درست کہا ہے کہ اسلام کسی معاملے میں بھی انتہاپسندی کو پسند نہیں کرتا۔ یہی غم اور خوشی کو لے لیجے، نہ تو اسلام زیادہ حد تک خوشی کو معقول قرار دیتا ہے اور نہ غم کو۔ کیونکہ دونوں کا نتیجہ ——— "

عقیل نے فقرہ مکمل کر دیا۔" ہوش و حواس کو کھو دیتا ہے۔"

اس فقرے پر ساری محفل زعفران زار بن گئی۔عقیل نے مزید کہا۔" میں نے زبیدہ بہن کی بات میں لقمہ دو وجہ سے دیا ہے۔ایک تو اس وجہ سے کہ میں عائشہ بہن کی تائید کرنے کا وقت نکالنا چاہتا تھا اور دوسرے اس لئے کہ زبیدہ بہن کو بھوک لگ رہی تھی۔"

عقیل کی اس پر لطف بات نے زبیدہ کے والدین کو اس کے حق میں رطب اللسان کر دیا۔" آپ لوگ شاید سمجھے نہیں کہ عقیل میاں نے بھوک کا لفظ کیوں استعمال کیا ——— اس لئے کہ وہ اس سے پہلے کہہ چکے تھے۔کہ زبیدہ بہن کی بات میں لقمہ دو وجہ سے دیا ہے۔لقمہ دینے کی ایک وجہ یہ بتائی کہ اسے بھوک لگی ہے۔"

اس تفہیم پر زبیدہ کی والدہ نے یونہی ایک بات پیدا کرنا چاہی جبھی تو انھوں نے کہا۔" عقیل میاں بہت مطلب پرست آدمی ہیں، لقمہ دیا تو اس کو جس نے اس کی خدمت کی ہے اور خدمت کرنے والی کے والدین کو پوچھا بھی نہیں"۔

زبیدہ کی والدہ کی زبان سے یہ فقرہ بالکل غیر ارادی طور پر نکلا لیکن عقیل اور زبیدہ کو اس قسم کی الجھن میں ڈال گیا جس قسم کی الجھن کرامت اور عائشہ کو ہوئی تھی۔اس الجھن کو دور کرنے کے لئے عقیل نے عزیزہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔" محترمہ ہمشیر صاحبہ کیا آپ کو کھانا منگانے کا خیال آئے گا یا نہیں ؛ بھوک کے مارے میرا تو برا حال ہو گیا۔"

الجھن محسوس کرنے والے دوسرے فرد نے اپنی الجھن یہ کہہ کر عزیزہ کے پیچھے بھاگتے ہوئے دور کی۔" میں کھانا لاتی ہوں۔"

جب وہ باورچی خانے میں پہنچی تو عزیزہ موجود تھی۔ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کی ہنسی نکل گئی۔اب دل کا چھپا ہوا راز ان کے قہقہوں نے فاش کر دیا۔

عزیزہ نے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔" زبیدہ بہن! سچ پوچھئے تو میں نے آپ کا بہت لحاظ کیا ہے کہ عائشہ کے ساتھ آپ کے بارے میں نہیں کہہ دیا کہ آپ کو بھی ہمراہ لے چلوں گی۔"

زبیدہ محبت بھری چپت رسید کرتے ہوئے بولی۔ "میں دیکھوں گی کہ تم کیسے جرأت کرتی ہو۔"

عزیزہ نے کہا "وہ تو جرأت کر کے دکھادوں گی لیکن آج آپ کی رسید کی ہوئی کراری چپت کا بدلہ اپنے بھائی جان سے ضرور لے کر رہوں گی۔"

اس جملے پر زبیدہ آپے سے باہر ہوگئی اور اسے زوردار گھونسا مارنے کے لئے بڑھی لیکن عزیزہ دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ زبیدہ دوسرے کمرے میں تعاقب کرتی چلی گئی اور عزیزہ نے تیسرے کمرے میں جا کر اپنے آپ کو دروازے کی اوٹ میں چھپالیا۔

اتنے میں والدہ کی آواز آئی۔ "کھانا کیوں نہیں آرہا؟"

زبیدہ نے وہیں سے جواب دیا: "بشارت لا رہا ہے۔"

زبیدہ اور عزیزہ دیر تک لڑتی جھگڑتی رہیں، اتنے میں بشارت نے کہا "بہنو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور آپ لوگ یہاں گرم ہو رہی ہیں، چلئے نا آپ کو بلایا جا رہا ہے۔"

پھر جب دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بازو ڈالے عقیل کے کمرے میں گئیں تو زبیدہ کے والدین کو یہ منظر بہت ہی بھلا معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا "خدا اس جوڑی کو ملائے رکھے۔"

کھانا کھانے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق تھوڑا بہت سامان جو عقیل اور اس کے بھائی بہن کے پاس تھا، ایک ٹیکسی میں رکھا کر چلنے کو تیار ہوئے۔ اس وقت سب کے دل رقت کی وجہ سے آنکھوں کی کھڑکیوں میں آگئے، سب نے ایک دوسرے کو بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا، اور جب ٹیکسی سٹارٹ ہونے لگی تو عقیل اور کرامت کی نگاہیں بے اختیار زبیدہ اور عائشہ پر اٹھ گئیں جن کی نگاہوں کی حسرت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عقیل اور کرامت کی نگاہیں تو زبیدہ اور عائشہ پر اٹھیں مگر شریر عزیزہ کی نگاہیں اپنے بھائیوں پر گڑ گئیں اور اس نے ذرا واضح آواز میں کہا "نہیں رہ سکے نا آپ دونوں۔" ڈرائیور بات کو سمجھا یا نہ سمجھا لیکن اس نے زیرِ لب مسکرا کر ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔

۲۸

جب سے قاہرہ میں فرحت عباس نے الجزائر کی آزاد حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا، تب سے حکومت فرانس نے قدرتی طور پر یہ سمجھا کہ مصر کا صدر جمال عبدالناصر الجزائر کے باغیوں کو الجزائر کی کامل آزادی کے حصول کے لئے شہ دے رہا ہے کیونکہ الجزائری مجاہدین کے لئے گولہ بارود سے بھرے ہوئے جہاز مصر سے روانہ ہو کر الجزائر کی بندرگاہوں پر پہنچتے تھے۔ ان جہازوں میں علاوہ گولہ بارود کے ناجائز درآمد کی ہوئی اشیاء بھی شامل تھیں۔ یہی دولت اور سامان آزاد حکومت چلانے کے کام آتا رہا۔ آزاد حکومت کے کارکن قاہرہ میں بیٹھ کر الجزائر کے طول و عرض میں اپنی مشینری کو حرکت دیتے رہے۔ اگر الجزائر کی آزاد حکومت نے الجزائر میں ہیڈ کوارٹر بنایا ہوتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ چونکہ ہمسایہ نو آزاد ممالک کو الجزائر کی جدوجہد جان سے زیادہ عزیز تھی اس لئے انھوں نے آزاد حکومت کو زیادہ سے زیادہ امداد بہم پہنچانے میں خوشی محسوس کی۔

جب سے جنرل ڈیگال نے جنرل سالان کو انسپکٹر آف ڈیفنس کا اعزازی تحفہ دے کر پیرس میں بلا لیا تھا تب سے وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ عہدہ اس کے لئے اعزاز نہیں بلکہ ایک چال ہے۔ پھر جب اس نے الجزائر کی آزاد حکومت کو اپنے پروگرام پر عمل درآمد کرتے دیکھا تو اسے اپنے الجزائر سے پیرس میں آجانے سے بڑی حسرت ہوئی۔ آزاد الجزائر کے کارندے الجزائر کی سرکاری فوج کا جب کامیابی سے مقابلہ کرتے تو جنرل سالان کو بہت افسوس ہوتا۔ وہ اپنے دل میں کہتا کہ ان دنوں اگر وہ الجزائر میں موجود ہوتا تو نام نہاد آزاد حکومت کے کارندوں کی مدافعت کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیتا۔

جنرل سالان کی جنرل ڈیگال سے چند بار ملاقات ہوئی تو اس نے سالان کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے دیکھے وہ ان شکنوں کا مطلب صاف سمجھتا تھا اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس وقت جتنی اہمیت الجزائریوں کی شکنوں کی ہے اتنی سالان کی شکنوں کی نہیں۔ اور جب سے اس نے صدارت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی تب سے وہ الجزائریوں کی پیشانیوں کی شکنیں دور کرنے کی فکر میں تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا راستہ شمال کی طرف تھا اور سالان کا جنوب کی طرف۔ وہ ایک راستے کے راہی نہ تھے بلکہ دونوں کی منزل مقصود مختلف تھی۔

الجزائر میں مقیم یورپی آبادکاروں کا بھی خاصا حصہ حکومت کے ان مسلسل حملوں سے تنگ آچکا تھا جو الجزائر کو فرانس کا حصہ بنائے رکھنے کے لئے روز بروز اپنی پورشیں جاری رکھتا تھا اور ان یورشوں میں کچھ تعداد یورپی آبادکاروں کی بھی فائرنگ کی شکار ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ان یورشوں کو فرد کرنے کے ساتھ جب آزاد الجزائر کے مجاہدین ایک طے شدہ پروگرام کے تحت منظم ہو کر فرانسیسی اور یورپی آبادکاروں پر حملہ آور ہوتے تو زیادہ تر خیال یہی کیا جاتا کہ یہ سب کچھ حکومت کے حملوں کا ردعمل ہے۔ مزید برآں فرانسیسیوں اور یورپی آبادکاروں کی کچھ تعداد آزاد حکومت کی قید و بند میں چلی جاتی تو قیدی باشندے اور قیدیوں کے عزیز رشتہ دار آزاد حکومت کو برا بھلا کہنے کے ساتھ حکومتِ فرانس کو بھی سخت سست کہنے لگتے، کیونکہ ان پر ظاہر تھا کہ قتل و غارت اور قید و بند کی سختیاں حکومت فرانس کی فوجی کارروائی کا لازمی ردعمل ہیں۔ اگرچہ فرانسیسی باشندے اور یورپی آبادکار کسی صورت میں الجزائر کو فرانس سے

الگ دیکھنا نہ چاہتے تھے لیکن خانہ جنگی سے بھی وہ اتنے تنگ آگئے تھے کہ کسی کسی وقت ان کی زبان سے یہ جملہ نکل جاتا تھا: "الجزائر الجزائریوں کو اب مل ہی جائے تو اچھا ہے، یہ خانہ جنگی اور روز کی دہشت تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔"

اس وقت فرانسیسی حکومت میں دو پارٹیاں بن گئی تھیں، ایک بڑی پارٹی جو صدر ڈیگال کے ساتھ تھی اور دوسری چھوٹی پارٹی جو سالان کی ہم خیال تھی۔ ڈیگال چونکہ بہت سمجھدار حکمران تھا اور وہ فوج اور پولیس پر کنٹرول رکھنے کی خاص اہلیت رکھتا تھا اس لئے مخالفین کی مخالفتیں اور اقدامات ذرا سی سرزنش پر اپنی موت آپ مر جاتے تھے۔

سالان اس وقت صدر ڈیگال کی کھل کر مخالفت کرنے کے حق میں نہ تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی گرفتاری یا نظربندی فوراً عمل میں آسکتی تھی۔ جنرل سالان نے فرانس میں آنے کے فوراً بعد اپنے ہم خیالوں کی جماعت بنانے کا کام شروع کر دیا۔ جو لوگ اس کے خیالات سے دو ٹوک مخالفت کا اظہار کرتے ان کے ساتھ اس کا رویہ بدل جاتا اور یہ ظاہر کر کے کہ مخاطب کا خیال صحیح ہوگا، وہ اپنی رائے زنی سے پیچھا چھڑا لیتا۔ جنرل سالان بڑی دانائی، بڑی ہشیاری اور بڑی رازداری کے ساتھ فوج کے جتنے اہم عہدہ داروں کو اپنے ساتھ ملا سکتا تھا ملاتا چلا گیا، وہ فرانس میں کئی فرانسیسیوں کو تو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کی الجزائر کی اس فوج تک رسائی نہ ہو سکی جو اس کے زیر ہدایت مدت تک لاکھوں الجزائریوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔

الجزائر کے علاقہ قصبی میں، جہاں کبھی فوجی سپاہیوں نے جمیلہ بوحائرڈ کو گرفتار کیا تھا وہ فوج اپنے ہاتھ لاتعداد انسانوں کے خون سے رنگ رنگ کر سخت تنگ آگئی وہ اب طیش میں اگر وہ الجزائری مجاہدین کو نہ صرف قتل کر کے اپنا فرض پورا کرنے پر اکتفا کرتی بلکہ اس کے طیش کی آگ اس وقت تک سرد ہونے میں نہ آتی جب تک وہ اذیتیں پہنچا پہنچا کر جانیں نہ لے لیتی۔

الجزائر کی فرانسیسی فوج کے کچھ عہدہ دار الجزائر کی بے ہنگم جنگ سے اس قدر تنگ آگئے کہ انھوں نے استعفٰے دے دینے کا فیصلہ کر لیا۔ الجزائر میں حملے کرنے کے دوران ان تین افسروں

نے ایسی بہادری دکھائی کہ فوج میں تینوں کے ناموں کی بجائے غیر سرکاری طور پر بہادر نمبر ا بہادر نمبر ۲ اور بہادر نمبر ۳ نام پڑ گئے۔ یہ تینوں بہادر ایک دن ایک دوست کے ہاں کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ بہادر نمبر ۳ نے استعفے کا ذکر چھیڑ دیا۔

"دوست مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں کے کیا ارادے ہیں لیکن میں تو آج ہی استعفا دینے کو تیار ہوں۔"

بہادر نمبر ا نے کہا "بھئی استعفا تو دے ہی دینا ہے پھر آج کیوں؟"

بہادر نمبر ۳ نے جواب دیا "اس لئے کہ آج کا کام کل پر نہیں ٹالنا چاہئے۔"

بہادر نمبر ۱ نے کہا "مگر استعفا منظور کون کرے گا۔ فوج سے استعفا دینا آسان کہاں ہے۔"

بہادر نمبر ۲ نے جواب دیا "کیا میں نے اس معاملہ پر تم سے تبادلۂ خیال نہیں کیا تھا؟"

"کیا تو تھا" وہ فوراً بولا "مگر ہو سکتا ہے تمہارا بہانہ تمہیں کامیاب کر دے لیکن ہمیں نہ کر سکے۔ یہ بات تو تم بھی تسلیم کرو گے کہ اگر تینوں میں سے ایک کا استعفا منظور ہوئے بغیر رہ گیا تو معاملہ ٹھیک نہ ہوگا۔ اور تم اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتے کہ ہم تینوں کے استعفے منظور ہو جائیں گے۔"

بہادر نمبر ا نے کہا "میں جو شروع سے استعفے دینے کی مخالفت کر رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں تمہارا ہم خیال نہیں بلکہ اس لئے کہ فوج سے استعفا دینا مشکل ہے، خاص طور پر آج کل کے حالات میں جب کہ حکومت کو تجربہ کار افسروں کی اشد ضرورت ہے۔"

میزبان نے اپنا خیال ظاہر کیا "دوستو! میں حیران ہوں کہ تم تینوں اتنے سمجھ دار ہوتے ہوئے ایک بات یکسر بھول رہے ہو۔"

"وہ کیا" تینوں بولے۔

میزبان نے کہا "وہ یہ کہ موجودہ وقت میں تم لوگوں کے استعفے پیش کرنے کا فوراً مطلب یہ لیا جائے گا کہ تم الجزائری قوم پرستوں کے ساتھ ملنا چاہتے ہو۔"

میزبان دوست کی اس دلیل پر تینوں خاموش ہو گئے۔

کچھ وقفہ کے بعد نمبر ۳ نے کہا "واقعی یہ مسلمہ بات ہے کہ قتل و غارت کی وارداتوں کے باعث میرے دماغ نے بالکل جواب دے دیا ہے، جبھی تو میرے دماغ میں یہ معمولی سی بات نہیں آئی۔ واقعی اگر ہم استعفا پیش کرنے کا اقدام کرتے تو ہمیں سخت سزائیں بھگتنی پڑتیں۔"

بہادر نمبر ۱ نے نمبر ۲ کی تائید میں کہا "ویسے بھئی لطف ہی آجاتا کہ ہمیں لاکھوں الجزائریوں کو قتل کرنے کا یہ معاوضہ ملتا کہ ہم کورٹ مارشل کر رہے ہوتے۔"

میزبان دوست نے کہا "اس بات کے علاوہ میرا یہ بھی خیال ہے کہ فوجی فرائض ادا کرنے علاوہ ہمارے شانوں پر قومی فرائض کا خوشگوار بوجھ بھی تو ہے، ہمیں قومی لحاظ سے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ہمیں ملک کے باغیوں کو قتل کرتے کرتے خود بھی قتل ہو جانا پڑے تو ہمیں موت کا ہنس کر مقابلہ کرنا چاہئے۔"

بہادر نمبر ۱ نے کہا "و بھئی مجھے بھٹکا ہوا فوجی نہ سمجھنا۔ لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ الجزائری مجاہدین کو ہنستے ہوئے جان دیتے دیکھ کر مجھے بڑا ہی رشک آتا ہے۔"

بہادر نمبر ۲ اور نمبر ۳ نے اس کی تائید کی لیکن ساتھ ہی کہا "حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دوست نے ہمیں ہمارا قومی فرض یاد دلا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اب ہمیں دوسری قوم کی تعریف میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔"

بہادر نمبر ۱ نے کہا "ہمیں فوجی ہوتے ہوئے کم ظرف بھی نہ ہونا چاہئے۔ ہمارے سامنے کسی دشمن کی بھی خوبی آئے تو ہمیں دشمنی کی وجہ سے خوبی کو بدی کے نام سے نہیں بدل دینا چاہئے۔ مثلاً تم جمیلہ اور جمیلہ بوپنرہ کو لے لو۔ کیا حقیقت نہیں کہ ہم نے ان پر ایسے ایسے ظلم روا رکھے کہ کسی دوسری قوم کی عورت ہوتی تو تیسرے چوتھے روز جان دے دیتی۔ لیکن دونوں نوجوان لڑکیوں پر نتیجتاً ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ جمیلہ بوپنرہ مدت مدید تک پاگل خانے میں رہی لیکن جب حواس درست ہوئے تو اپنے بیانات میں سرِ مو فرق نہ لا سکی۔ جمیلہ بو حائرڈ کو دیکھو کہ اس سے ہم راز کی کوئی بات فاش کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ انسان نہیں بلکہ اطلس کا پہاڑ ہے۔ اس نے جب سزائے

موت کا فیصلہ سنا تو اس کے حواس پر ذرا بھی ناگوار اثر نہ پڑا۔"

بہادر نمبر ۲ نے کہا۔ "لیکن ہماری فوج کا بھی یہ کم درجے کا کارنامہ نہیں کہ ہم نے اسے بالآخر گرفتار کر لیا۔"

نمبر ۱ نے فوراً کہا۔ "لیکن اس وقت جب کہ وہ اپنے فرائض قریباً پورے کر چکی تھی۔ ہمارے بہت سے حملوں کی ناکامی کا باعث یہی جمیلہ بوحائرڈ بنی ہے جس نے قومی جماعتوں کے رابطے کمال راز داری سے قائم کئے۔"

بہادر نمبر ۳ نے کہا۔ "یہ عجیب اتفاق ہے کہ جو بہادر عورت گرفتار ہوتی ہے۔ اس کا نام جمیلہ ہی ہوتا ہے۔"

بہادر نمبر ۱ نے کہا۔ "کیا وہ سرکلر آپ نے نہیں پڑھا جس میں ہمیں ایک جمیلہ کی جلد از جلد گرفتاری کے احکام موصول ہوئے ہیں؟"

"کب ہوئے ہیں۔" بہادر نمبر ۲ اور نمبر ۳ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

بہادر نمبر ۱ نے کہا۔ "آج۔"

یہ سن کر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، اس پر بہادر نمبر ۱ بھی کھڑا ہو گیا۔ اپنے دوست کے کھانے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد سب اپنے اپنے کوارٹر میں چلے گئے جہاں جاتے ہی انھیں سرکلر مل گیا اور پھر وہ تیسری جمیلہ کو جس کا نام جمیلہ بوپاشا درج تھا تلاش کرنے کے لئے متعد ہو گئے فوج نے شہر کے کونے کونے میں اس کی تلاش شروع کر دی اس کے متعلق فوج کو یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ وہ دہشت پسند مسلمان خفیہ جماعت کے پروگرام میں بہت مدت سے حصہ لے رہی ہے اور اس کا زیادہ تر کام فرانسیسی اور یورپی آباد کاروں کے گھروں، دفتروں اور ہوٹلوں پر بم پھینکنا ہے۔

فوج نے جمیلہ بوپاشا کے وہ تمام گھر تلاش کر ڈالے جن کے ساتھ اس کا تعلق ہو سکتا تھا۔ مثلاً والدین اور عزیزوں کے گھر۔

۱۹۵۹ء میں جب ۱۱ر فروری کا سورج طلوع ہوا اس وقت فوج کو اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا کہ وہ کتنے عرصہ سے ایک عورت ذات کو گرفتار کرنے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے لیکن وہ ان سے گرفتار ہی نہ ہو پاتی - برعکس اس کے وہ اپنے اپ کو ان کی نظروں سے اوجھل رکھ کر بموں کی بارش کئے جارہی ہے جس سے فرانسیسی اور یورپی آباد کاروں کی اچھی خاصی تعداد موت کے منہ میں چلی جارہی ہے۔

فوج جمیلہ بوپاشا کی گرفتاری عمل میں نہ آنے کی وجہ سے اپنے آپ کو لعن طعن کر رہی رہی تھی کہ بہادر نمبر ۲ نے کہا: "اگر وہ گرفتار ہو گئی تو میں اس کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالوں گا۔"

بہادر نمبر ۱ نے کہا: "فوج اور فوجی اسلحہ کے نزدیک یہ کون سی بڑی بات ہے کہ بوٹی بوٹی نوچ لی جائے لیکن ہمارا مقصد تو زندہ رکھ کر اس سے راز معلوم کرنا ہے۔"

بہادر نمبر ۲ نے کہا: "چلو یونہی سہی، میں نے اپنے دل ہی دل میں اس کے لئے ایسی ایسی سخت سزائیں تجویز کی ہیں جن کے بعد وہ سارے راز اگل ڈالے گی۔"

بہادر نمبر ۱ نے کہا: "بھئی ایسا دعویٰ قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ تجربہ نے تو یہ بتایا ہے کہ فوج دونوں جمیلاؤں سے سخت ترین سزاؤں کے بعد بھی راز معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔"

بہادر نمبر ۲ نے کہا: "مگر یاس انگیزی کا تذکرہ چھیڑنا فوجی سپرٹ کے خلاف ہے۔"

بہادر نمبر ۳ نے کہا: "واقعی یاس انگیزی فوجی سپرٹ کی موت ہے۔ ہمیں موت کی نہیں بلکہ زندگی کی باتیں کرنی چاہیئں۔"

الغرض آج کا سارا دن فوجیوں نے غم و غصہ میں گذارا۔ سفید پوش فوج جمیلہ بوپاشا کا کھوج لگاتے لگاتے تھک گئی۔ شام کے وقت اچانک ایک ٹیلیفون آیا جسے سننے کے بعد بہادر نمبر ۲ کی باچھیں کھل گیئں۔ اس نے کسی ہوئی وردی کو اور زیادہ کس لیا اور گھنٹی کھٹکھٹانے کے بعد شراب کی ایک بوتل طلب کی۔ اس نے چند ساتھی افسروں کے کان میں کوئی بات بھی کی جس کی سماعت کے بعد وہ افسر فوراً آگنتہ ہو گئے۔

جمیلہ کے والدین کے گھر اچانک ایک مرد آیا جسے اس کے والدین اور دوسرے عزیز دیکھ کر جھجھک سے گئے لیکن جب اس مرد نے اپنا لباس بدلا تو والدین نے آئے ہوئے مہمان کو باری باری گلے لگایا۔ یہ مہمان مرد نہ تھا لڑکی تھی اور اس کا نام جمیلہ بوپاشا تھا۔ اس نے کہا "اگرچہ میں بہت مدت کے بعد آسکی ہوں لیکن آج بھی میرے پاس وقت بہت کم ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ لوگوں سے چند گھنٹے بات کر کے چلی جاؤں۔"

والد بولے "بیٹی! تمہاری راہ تکتے تکتے ہماری تو آنکھیں ترس گئی ہیں اس لئے تمہیں دو چار دن تو ہمارے پاس ضرور گذارنے ہوں گے۔"

والدہ نے بھی کہا "بیٹی! یہ تو میرے بھی اختیار کی بات نہیں کہ تمہیں دو چار گھنٹے دیکھنے کے بعد الوداع کر دوں۔"

اسی طرح دوسرے عزیزوں نے بھی ٹھہرنے پر زور دیا۔ لیکن اس نے کہا "آج خفیہ پولیس میرے پیچھے سائے کی طرح لگی ہوئی ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اپنی جان جس طرح بچا سکوں بچالوں۔"

والدہ نے کہا "خیر کچھ بھی ہو، آج تو میں جانے نہیں دوں گی۔"

جمیلہ بولی "امی بحث تو بعد میں کیجئے گا پہلے میرے کھانے کا انتظام کیجئے۔ بھوک سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔"

بہن نے کہا "باجی! اتفاق دیکھئے آج ابا جان کے ایک دوست شکار کا گوشت تحفے کے طور پر دے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے یہ تحفہ آپ کے لئے بھیجا ہے سالن اور روٹی تیار ہے۔ ابھی پانچ منٹ میں تازہ بہ تازہ کھانا دستر خوان پہ پہنچ جاتا ہے۔"

جمیلہ نے کہا "نہ جانے کیا بات ہے اگرچہ میں خود نہیں ٹھہرنا چاہتی مگر امی نے کچھ ایسے انداز میں زور دیا ہے کہ میرا جی اب جانے کو نہیں چاہتا۔ میں اب غسل سے فارغ ہو کر اطمینان سے کھانا کھاؤں گی۔"

جمیلہ کے اس فیصلے نے سب کو شادماں کر دیا۔ باپ تو خوشی سے جھوم اٹھا" میں اپنی بیٹی کے لئے مٹھائی لاتا ہوں۔"

جمیلہ غسل خانے میں چلی گئی، والد مٹھائی لینے مکان سے باہر نکل گئے اور بہن نے دسترخوان پر کھانے کے برتن ترتیب دینے شروع کر دیئے۔

جمیلہ غسل خانے میں داخل ہو رہی تھی کہ اسے اپنے بہنوئی کا خیال آیا "امی کیا آپا کے ساتھ احمد بھائی آئے ہوئے ہیں۔"

اور انھوں نے مسرت انگیز آواز میں فوراً جواب دیا" ہاں بیٹی میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی تھی، اتفاق سے وہ بھی آیا ہوا ہے، شاپنگ کرنے گیا تھا، آنے والا ہوگا۔ واپس آجائے تو ہم اس سے کہیں گے کہ تم سے اچھا سودا تو ہم نے خریدا ہے۔"

جمیلہ ہنسنے لگی اور پھر اس نے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا۔ جمیلہ کی بہن جس کا نام نفیسہ تھا آج چھوٹی بہن بن کر شوق سے کام میں مصروف تھی، اس نے جب دسترخوان پر برتن رکھ دیے تو پھر جمیلہ کے لئے خوبصورت سا سوٹ نکالنے میں مصروف ہو گئی۔ شفق کی طرح سرخ سوٹ نکال کر غسل خانے کے دروازے پر لٹکا دیا۔

اتنے میں والدین ڈرائنگ روم کی کرسیوں پر بیٹھ کر جمیلہ کا انتظار کرنے لگے۔ جمیلہ سرخ سوٹ بدل کر نکلی ہی تھی کہ سیڑھیوں سے اس کا بہنوئی احمد آگیا۔ جمیلہ کو اچانک اپنے سامنے پا کر حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کا مظہر بن گیا، فرطِ جوش میں اس نے جمیلہ کو گلے لگا لیا اور اس کا ماتھا چومنے کے بعد کہا" آج ہمارے لئے عید کا دن ہے۔"

جمیلہ کنگھی کر کے دسترخوان پر آبیٹھی، اس کے آنے پر کھانے کا سامان بھی آگیا۔ سب نے بے تکلفی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران نفیسہ نے کہا۔ "جمیلہ تمہیں یہ سوٹ بہت اچھا لگتا ہے۔"

جمیلہ نے مسکرا کر کہا" دیکھوں اچھا نہ لگے جب کہ یہ سوٹ مجاہد کے لیے نہایت موزوں ہے سارا ملبوس خون سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

والد بولے "تم نے یہ کیا بدشگونی کی بات کہی"

اور والدہ بولیں "نہیں میری بیٹی نے بڑی مجاہدانہ بات کہی ہے، میں اس پر فخر کرتی ہوں"

جمیلہ اپنے جملے کی داد پا کر اٹھی اور والدہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگی "امی آپ بہت ہی اچھی ہیں خدا آپ کا ہم پر سایہ قائم رکھے"

جمیلہ نے کھانے سے فارغ ہو کر توجہ کے ساتھ نماز مغرب ادا کی، ادائیگی نماز کے بعد الجزائر کی آزادی اور مجاہدین کی کامیابی کے لئے دعائیں کی گئیں اور پھر سب کے سب کھانے کے کمرے میں قہوہ پینے کے لئے کرسیوں پر آ بیٹھے۔

قہوہ پینے کے دوران جمیلہ نے اپنی خفیہ قومی جماعت کی کارگذاری کے جستہ جستہ واقعات سنائے واقعات جوشِ عمل کا اتنا بڑا سبق تھے کہ نمازِ عشاء کے بعد بھی سب ان واقعات کے بقیہ حصے سننے میں مگن رہے، یہاں تک کہ سب چارپائیوں پر جا سوئے اور جب تک جمیلہ کو نیند نہ آگئی مسلسل واقعات سنتے رہے جمیلہ چونکہ بہت تھکی ماندی تھی اس لئے اسے بہت جلد نیند آگئی اور وہ خراٹے لینے لگی۔ اس کے محوِ خواب ہو جانے کے بعد والدین اور بھائی بہن اس کے متعلق باتوں میں بہت دیر تک مشغول رہے، یہاں تک کہ ان کے ہوش و حواس پر بھی نیند نے تانے لگائے اور سب کے سب گہری نیند سو گئے۔

جس محلے میں جمیلہ کے والدین کا مکان تھا وہ محلہ بھی رات کی خاموش تاریکی میں سنسان ہو گیا۔ ایسا سنسان کہ کسی متنفس کے پاؤں کی چاپ بھی ایک ایک فرلانگ تک سنائی دے سکتی تھی۔

کافی رات گذرنے کے بعد بھی کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دی البتہ مکان کے ارد گرد فوجیوں نے پہرہ جمالیا اور انھوں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ گھیرے میں لے لینے کے بعد بہت سے فوجی مکان میں داخل ہو گئے۔ دیکھا کہ ان کا شکار جمیلہ بو پاشا اور اس کے والدین وغیرہ میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔

ایک فوجی نے جمیلہ کا بازو پکڑ کر کھینچا وہ چیخ کر اٹھی، آنکھیں مل کر غور سے دیکھا۔ فوجی بولے

"مطمئن رہو یہ خواب نہیں بلکہ اسکی تعبیر ہے"

دوسرے فوجیوں نے جمیلہ کے والدین، بہن اور بھائی سبھی کو فوجی بوٹوں کی ٹھوکریں مار کر جگایا۔

سب ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے، اب انھوں نے فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"اب ہم دیکھیں گے کہ جمیلہ ہمیں اپنے راز کس طرح نہیں بتاتی"

جمیلہ نے کہا "آپ کے ہاتھ آگئی ہوں، گرفتار کر لیجے، جو ظلم ڈھانا چاہتے ہیں وہ ڈھائیے لیکن میری زبان میں جب تک قوتِ گویائی ہے، وہ اپنا کوئی راز ظاہر نہیں کرے گی"

باپ نے کہا "انشاء اللہ"

اور بیٹی نے دہرایا "ہاں انشاء اللہ"

فوجی سپاہیوں نے "انشاء اللہ" کے لفظوں کے بعد سب کو پٹنا شروع کر دیا۔ یقین نہیں ہوتا تھا کہ ان کی سخت مار پیٹ سے کوئی بچ بھی سکے گا یا نہیں۔ اگرچہ ان کے کپڑے پھٹ گئے، مار پیٹ کی وجہ سے چہرہ کا حلیہ بگڑ گیا، اس کے بعد انھوں نے سب کو سختی کے ساتھ کھینچ کھینچ کر فوجی گاڑی میں سوار کر دیا اور جمیلہ کی والدہ اپنے ساتھ یہ حسرت لے کر رہ گئی کہ اس نے اپنی بیٹی کو ٹھہرنے پر زور کیوں دیا تھا۔

عقیل اور اس کے بھائی بہن کے چلے جانے کے بعد زبیدہ کو اپنا گھر سونا سونا معلوم ہونے لگا

ایک دن سکول سے گھر واپس آکر زبیدہ نے ازراہِ شرارت عائشہ سے کہا "نہ جانے کیا بات ہے مہمانوں کے جانے کے بعد مجھی کو اس گھر میں سناٹا معلوم ہوتا ہے یا تمہارا بھی یہی حال ہے؟"

عائشہ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "زبیدہ! تم نے اپنے خیال کی تصدیق کے لئے ناموزوں آدمی سے خطاب نہیں کیا۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ مہمانوں کے جانے کے بعد یہ گھر ویرانہ معلوم ہونے لگا ہے۔"

اس پر زبیدہ نے دانتوں سے لب کاٹتے ہوئے ایک ہلکی سی چپت رسید کی اور کہا۔ "تم بڑی شریر ہو لیکن اس خدا کا شکر ہے کہ جس نے تمہیں شریر بنایا ہے۔"

عائشہ نے کہا۔ "ہم ان کے گھر تین بار جا چکے ہیں مگر ان لوگوں کو اس طرف آنے کا خیال نہیں آتا

اس بات کی ہمیں ان سے بہت شکایت ہونی چاہیئے۔"

زبیدہ نے سرد آہ کھینچ کر کہا "لیکن شکایت تو وہاں جاکر ہی کی جاسکتی ہے۔"

"میرا خیال ہے۔" زبیدہ نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا "تم ابا جان سے ان کے ہاں جانے یا انھیں بلانے کے بارے میں بات کرو۔"

عائشہ نے کہا "بھلا تم کیوں نہ بات کرو۔"

"میں اس لئے نہیں۔" زبیدہ نے کہا کہ مجھ پر انھیں شک ہو جائے گا۔"

اور عائشہ نے کہا "تو کیا مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ کوئی مجھ پر شبہ کرے۔"

عائشہ کے اس پُر لطف جواب پر زبیدہ ہنس دی اور اس ہنسی کی آواز جب اس کے والد کے کانوں میں پہنچی، جو کھڑے کھڑے بچوں کی طرح شیرینی کھا رہے تھے، نزدیک آکر کہنے لگے "تمہیں ہنستے دیکھ کر مجھے عقیل اور اس کے گھر کے آدمی یاد آگئے ہیں وہ بھی خوب ہنسا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے میں آج انھیں یہاں لے آؤں —— مجھے آج فراغت ہے اور گھر میں خوب رونق رہے گی۔"

اس جملے سے عائشہ اور زبیدہ کا قہقہہ نکل گیا جس کا مطلب ان کے والد نہ سمجھ سکے مگر وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ "بھئی جب تمہارے قہقہے ختم ہوں تو چلنے کے لئے تیار ہو جانا، آج میزبانی کرنے کا ارادہ ہے۔"

زبیدہ کی والدہ جو کڑھائی کے کام میں مصروف تھیں، بولیں۔ "بیٹی! مہمانوں کو لینے چلی ہو تو تین چار روز کے لئے لانا ورنہ انھیں میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔"

اس بات پر عائشہ اور زبیدہ خواہ مخواہ شرما گئیں چونکہ شرم کا اظہار قطعی بے جا تھا اس لئے دونوں نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت اچھا امی جان۔"

آخر جب سب جانے کے لئے تیار ہو گئے تو زبیدہ نے والد کے گلے کا ہار بنتے ہوئے غیر ارادی طور پر کہا "ابا جان! ہماری گاڑی کب آئے گی اپنی گاڑی ہوتی تو ہم کئی بار آجا چکے ہوتے۔"

والد نے پوچھا "کہاں؟"

اور زبیدہ جلدی میں یہی جواب دے سکی "کرامت بھائی اور عزیزہ کے پاس"

آج پہلا دن تھا جب کہ زبیدہ کے اس جواب سے اس کے والدین یقینی طور پر سمجھ سکے کہ ان کی بیٹی کی محبت کا مرکز عقیل ہے۔ عقیل مرکز نہ ہوتا تو زبیدہ بے تکلفی سے عقیل کا نام ضرور لیتی۔

والدین نے زبیدہ کی غیر معمولی اور مدہوش کن مسرت کو پاکر ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور اس منظر کو عائشہ نے بھی غور سے ملاحظہ کیا تو اسے یہ نظر آیا کہ دونوں کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلی جو اگرچہ خاموش تھی لیکن صاف کہہ رہی تھی "ہم نے چور پکڑ لیے"

اس رواروی میں اتنا موقع نہ تھا کہ عائشہ زبیدہ پر اس کے والدین کے تاثرات ظاہر کر سکتی سب باہر نکل آئے ٹیکسی کو اشارا سے بلایا اور اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

بیس پچیس منٹ میں عقیل کے مکان پر پہنچ گئے۔ اجازت لے کر داخل ہوئے تو کرامت نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ اس کے استقبال کرنے کے انداز میں کسی قدر سرد مہری محسوس ہوئی کیونکہ وہ خاموش خاموش سا تھا اور جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تو کرامت کے خاموش ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ عقیل کی آنکھیں نم آلود سی تھیں اور عزیزہ باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

سب نے بالعموم اور جلیل صاحب نے بالخصوص گھبرا کر پریشانی کی وجہ پوچھی۔

عقیل نے کہا "اتفاق سے مجھے بابا یار چوکی کے پاس جانے کا موقع ملا ہے اور میں نے جمیلہ بوپاشا اور اس کے عزیزوں کی جیسی دردناک چیخیں سنی ہیں وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں میں جب تک بابا یار چوکی میں ٹھہر سکا، جمیلہ اور اس کے عزیزوں کو سخت تکلیف دہ سزائیں پاتے دیکھا ہے۔ یہی کیفیت میں نے گھر آکر سنائی تو کرامت نے کھانا چھوڑ دیا اور عزیزہ کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا ہے"

زبیدہ چونکہ عقیل کی طرح سیاسی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتی تھی اور عملی طور پر تحریکوں میں حصہ لینے کی طبعاً متمنی تھی اس لیے اس نے جب جمیلہ بوپاشا کا حال سنا تو وہ بھی بے کل سی ہو گئی۔ کہاں وہ کوئل کی طرح آتے ہی چہک رہی تھی اور کہاں اب جمیلہ بوپاشا کے تذکرہ سے معنی خیز خاموشی اختیار کر بیٹھی۔

جلیل صاحب بولے "وہ آج ہم خوشی خوشی آپ لوگوں کو لینے آئے تھے مگر اس طرح غمگین پاکر لے جانے کو جی نہیں چاہتا البتہ اس خیال سے کہ آپ لوگوں کی طبیعت ہمارے گھر کی رونق کے باعث بہل جائے گی، تم سب اسی وقت ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جمیلہ بوپاشا پر فوج نے جو ظلم روا رکھا اور جو ظلم روا رکھ رہی ہوگی ایسا ہی ظلم سات سال سے الجزائری مجاہدین پر کر چکی ہے۔ جمیلہ بوحائرڈ اور جمیلہ بوئنزہ کی طرح جمیلہ بوپاشا نے بھی جس روز میدانِ سیاست میں قدم رکھا ہوگا، یہ یقین کر کے رکھا ہوگا کہ اسے پھانسی پر بھی چڑھایا جائے گا جس جاں سپار نے میدانِ شہادت میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی اپنی موت کا یقین کر لیا ہو اسے موت کبھی نہیں ڈرا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ جمیلہ اور اس کے عزیزوں پر جو ظلم ہو چکے ہیں یا جو ستم ہو رہے ہیں ان کی سماعت کے لئے ہمارے کان تیار نہیں لیکن بہ حیثیت مسلمان ہمیں اس دعا کے ساتھ کہ ان بچاروں پر سے ظلم و ستم کا ہاتھ اٹھ جائے یہ دعا بھی مانگنی چاہئے کہ خدا جمیلہ اور اس کے عزیزوں کو استقامت بخشے۔ مجاہد اور بہادر غازیوں کے حق میں اچھی دعا ان کے جسم کی سلامتی نہیں بلکہ ان کے عزائم کی سلامتی ہے۔

جلیل صاحب نے مختصر سے وقت میں اپنے خیالات کا جو اظہار کیا تو اس سے دوسرے بھی متاثر ہوئے مگر سب سے زیادہ متاثر ان کی صاحب زادی زبیدہ ہوئی، کہنے لگی۔

"ابا جان! آپ کے خیالات تو مجاہدانہ ہیں۔ آپ کو تحریکوں میں عملی طور پر ضرور شامل ہونا چاہئے تھا۔"

عقیل نے تائید کی "ہاں ضرور"

مگر جلیل صاحب نے کہا "میں اگر عملی میدان میں قدم رکھنے کی توفیق پاتا تو میری اس سے بڑی کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی شکر ہے کہ میں نے اپنے موقف کو کبھی غلط نہیں ہونے دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی موقع پیدا ہوا تو میں پیچھے رہ جاؤں گا لیکن ؎

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند۔

میری گناہ گاری مجھ سے کہتی ہے کہ میں میدانِ عمل میں شاید پورا نہ اتر سکوں، آپ سب دعا کیجیے کہ مجھے توفیق ملے۔"

زبیدہ نے کہا "ابا جان! آپ کی زبان سے آج کیسے بے باک خیالات کا اظہار ہو گیا لیکن جب میں تحریکوں میں کام کرنے جانا چاہتی تھی تو آپ مجھے دلائل دے کر روک لیتے تھے۔"

جلیل صاحب نے کہا "میں تمہیں اب بھی روکتا ہوں، کیونکہ میرے خیال میں تم طبعاً بہت جلد مشتعل ہو جانے والی ہو۔ سیاسی میدان میں صرف جوش کام نہیں دیتا جوش کے ساتھ ہوش کا دامن تھامے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح کا جوش نہ تو تم سے کسی تحریک کے لئے مفید کردار ادا کرا سکتا ہے اور نہ تحریک تم سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔ تم اپنی اشتعال پسند طبیعت کے باعث بہت جلد گرفتار ہو جاتیں اور پھر تمہارے مارے جانے میں دیر نہ لگتی۔ کیونکہ حکومت ان مجاہدین کو مارنے میں دیر لگاتی ہے یا مارنے کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے جو ہوش کا دامن تھامے رکھنے کے ساتھ نہایت چابک دستی اور استقلال سے اپنی تحریک کے پروگرام کو پروان چڑھانے پر مسلسل عمل درآمد کر چکی ہو۔ اس کے مقابلے میں جو مجاہدین صرف جان ہی دینا جانتے ہوں، جان کو حفاظت میں رکھ کر اس سے تحریک کے لئے فائدہ اٹھانا نہ جانتے ہوں حکومت ایسے لوگوں کی پروا نہیں کرتی یہ ہے ساری وجہ جس کی بنا پر تمہیں تحریک میں شامل ہونے سے روکا جاتا رہا ہے۔ البتہ میں اس قدر ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ دو تین موقعوں پر تمہاری "ہاں" کی مامتا نے تمہاری سلامتی ضرور چاہی تھی۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ اس مامتا میں میری پدرانہ محبت بھی شامل ہو گئی تھی، ان مواقع کے علاوہ کوئی ایسا موقع پیدا نہیں ہوا جب کہ تم تحریک کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ اب میرے خیال کے مطابق الجزائر کی غلامی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ ایسے موقع پر تمہاری طرح ہماری ہمدردیاں تو تحریکِ آزادی کے ساتھ شامل ہیں لیکن تربیت یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت ہماری شمولیت ہو سکتا ہے، فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان کا باعث ہو۔

کرامت نے جلیل صاحب کے یہ خیالات دل کے کانوں سے سنے اور کہا "مجھے آپ کے ان خیالات سے بے پناہ خوشی حاصل ہوئی ہے لیکن جمیلہ بو حائرڈ کو سزا ملنے کے معاملے میں آپ میرے ساتھ شامل ہو گئے تھے جس کا یہ خیال تھا کہ اسے پھانسی کی سزا ہو کر رہے گی۔"

جلیل صاحب بولے۔ "بھئی میرے نزدیک وہ شرط محض تفنن طبع کے لئے تھی اس لئے تمہارا پلڑا کمزور دیکھ کر میں تمہاری مدد کو پہنچ گیا، تمہیں یاد ہوگا، جمیلہ بوحائرڈ کی سزائے موت کا فیصلہ بدل جانے پر میرے خیالات مذاق مذاق میں دوسری پارٹی کا ساتھ دینے لگے تھے۔"

"ہاں یہ تو درست ہے۔" کرامت نے کہا۔

جلیل صاحب اچانک موضوع بدل کر بولے۔ "ہاں بھئی تم سب کے بارے میں مجھے ایک شکایت پیدا ہوئی ہے۔"

"کونسی شکایت۔" عزیزہ نے گھبرا کر پوچھا

"وہ یہ شکایت۔" جلیل صاحب نے بظاہر سنجیدگی سے بات پوری کی "آپ لوگ میرے کہے کو بالکل بکواس سمجھتے ہیں۔"

عقیل، کرامت اور عزیزہ تینوں گھبرا کر کہنے لگے۔ "توبہ توبہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں، ہم کبھی ایسے نہیں ہو سکتے۔ آپ کوئی حکم دے کر دیکھئے اور پھر دیکھئے کہ ہمارے عمل کا کیا حال ہوتا ہے۔"

جلیل صاحب کو موقع ملا، بولے۔ "بہت اچھا میرا حکم یہ ہے کہ کم سے کم پانچ روز کے لئے ہمارے ہاں چلو، زبیدہ کی والدہ آپ کا شدت سے انتظار کر رہی ہے۔"

عائشہ نے کہا۔ "ہاں، انھوں نے یہ پیغام دیا تھا کہ اگر زیادہ دن کے لئے آنے کا پروگرام نہ ہو تو آنے کی تکلیف نہ کریں۔"

عقیل نے کہا۔ "چچا جان! اس میں شک نہیں کہ آپ لوگوں سے انتہائی محبت اور خلوص کی وجہ سے یہ ساری باتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن آپ لوگوں کے یہ انداز بڑے تحکمانہ ہیں۔"

عقیل کے اس فقرے پر سب ہنس دئے اور پھر سب کے سب تیار ہو کر زبیدہ اور عائشہ کے گھر کو محبت کی روشنی بخشنے کے لئے تیار ہونے لگے۔

عائشہ اور زبیدہ نے جلدی جلدی گھر کا سامان ترتیب دینے میں مدد دی اور پھر دو ٹیکسیاں کرایہ پر لیں۔

راستے میں زبیدہ کو خیال آیا کہ کیوں نہ بابا رچو کی سے گذریں۔ ہو سکتا ہے جمیلہ بوپاشا کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوں۔ لیکن کرامت نے اس تجویز سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم لوگوں نے ہمارے غم سے اندازہ نہیں لگایا کہ محض بھائی سے واقعات سننے سے ہمارا کیا حال ہوا۔ اب اگر دوبارہ مزید حالات معلوم ہوئے تو ہماری رہی سہی ہمت بھی جواب دے دے گی۔

عقیل نے کہا۔ "مگر ہمیں باہمت اور متحمل مزاج ہونا چاہئے۔"

عائشہ بولی۔ "جبھی تو آپ اپنی باہمتی اور متحمل مزاجی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔"

اس پر سب ہنس دیئے اور اگلی ٹیکسی کا ڈرائیور گاڑی روک کر کہنے لگا۔ "کہیئے سرکار باہمت بننے کا ارادہ ہے یا بزدل؟"

اس جملے کے جواب میں زبیدہ بولی۔ "باہمت، جراُت مند اور بہادر بننے کا ارادہ ہے۔"

زبیدہ کے اس جواب پر عقیل دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور بظاہر بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

گاڑیاں بابا رچو کی طرف روانہ ہوئیں۔ قریب پہنچنے نہ پائے تھے کہ چوکی سے دُور دُور فاصلے پر فوج کھڑی دکھائی دی۔ اس فوج نے چوکی کے پاس سے گذرنے والے راستے بند کر رکھے تھے ناچار گاڑیاں دوسرے راستے سے گذرانی پڑیں۔

دوسرے راستے پر جاتے ہوئے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر مجاہدین کا ایک گروہ۔ "الجزائر زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا نظر آیا۔ نعروں کی آواز میں ایک آواز یہ گونجی "فوج نے جمیلہ بوپاشا کی ایک پسلی توڑ دی ہے ہم اسکا انتقام لیں گے۔"

اس آواز نے سب کو غمگین بنا دیا۔ مصلحت یہی تھی کہ یہاں رُکا نہ جائے۔ چنانچہ گاڑیاں اس جگہ سے دور نکل گیئں۔ اب گھر نزدیک آنے والا تھا۔ عائشہ نے کہا "وہ دیکھو کچھ لوگ سر وں پہ سفید کپڑے باندھے چلے آرہے ہیں۔ سب نے نظر اٹھائی تو یہ ایک مختصر سا جلوس تھا۔ جلوس میں شامل ہونے والے ایک ایک آدمی نے سر پر کفن باندھ رکھا تھا اور سب "الجزائر زندہ باد" "جمیلہ کو رہا

کردو" کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔

زبیدہ نے عقیل کی طرف دیکھا اور عقیل نے زبیدہ کی طرف۔ اس دیکھنے کے انداز میں اس وقت محبت نہیں بلکہ اس بات کی حسرت پائی جاتی تھی کہ کاش مجاہدین کے اس ٹولے میں وہ دونوں موجود ہوتے۔

اس گاڑی میں زبیدہ، عقیل، عائشہ اور کرامت بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری میں جلیل صاحب اور عزیزہ۔ جس وقت سب چلنے کو تیار ہوئے تھے اس وقت جلیل صاحب نے عزیزہ کو اصرار کر کے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا اس بات سے کرامت اور زبیدہ وغیرہ کسی حد تک متعجب بھی ہوئے تھے لیکن جلدی میں انھوں نے اسکی وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

دوران سفر عزیزہ نے کہا "چچا جان! اگر ہماری امی اور ابا زندہ ہوتے تو آپ سے ایک بات کہنے کا فرض ادا کرتے ... ..."

یہ کہتے ہوئے عزیزہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کونسا فرض" جلیل صاحب نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم اب زبیدہ کو اپنی بہن اور اس کے والدین کو اپنے والدین تصوّر کیا کرو"

عزیزہ نے کہا "یہ تو آپ کی عنایت ہے چچا جان! مگر ... ..."

"مگر کیا بیٹی" جلیل صاحب نے بات کاٹی۔

بات یہ ہے چچا جان! کہ جو کام بزرگوں کے کرنے کا تھا وہ اب مجھے کرنا پڑ رہا اس کی تمام تر وجہ امی اور ابا کا بے وقت انتقال ہے۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ جو چیزیں میں آپ سے مانگنا چاہوں گی وہ آپ مجھے دے دینے کے قابل بھی سمجھیں گے یا نہیں؟"

جلیل صاحب نے کہا "تم اطمینان رکھو بیٹی یہ گھر ہی تمہارا ہے۔ صرف تم ہمارا ایمان نہ مانگنا کیونکہ اسی کی تھوڑی بہت پونجی ہمارے لئے قیامت کے وسیع سمندر میں تنکے کی حیثیت رکھتی ہے"

عزیزہ نے کہا "نہیں چچا جان! میں ایمان کیوں مانگنے لگی"

جلیل صاحب بولے "بیٹی! پھر تم ہم سے ہر چیز چھین سکتی ہو، تمہیں پوری اجازت ہے۔"

عزیزہ نے کہا۔ "ممکن ہے جو چیزیں میں آپ سے مانگوں وہ چچی جان نہ دینا چاہیں۔"

جلیل صاحب بولے "کیا مجال ہے اس کی۔ اول تو وہ تمہاری مانگی ہوئی چیز پر کبھی ناخوش نہیں ہو سکتی۔"

"مگر میں تو" عزیزہ نے فوراً کہا "ایک چیز نہیں دو چیزیں مانگنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں دو ہی مانگ لو" جلیل صاحب خوشی سے کہنے لگے۔ "دو چھوڑ تین، چار، دس مانگ لو۔"

اس کے بعد عزیزہ نے بسم اللہ پڑھ کر زبان کا تیر چھوڑ دیا۔ "میں آپ سے اور چچی جان سے زبیدہ اور عائشہ کو مانگنا چاہتی ہوں۔"

"بس یہی بات تھی" جلیل صاحب نے کہا۔ "تم یوں سمجھو کہ تمہاری چچی جان بھی اسی ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی ہیں اور وہ میری رضامندی کے ساتھ اپنی رضامندی کا بھی اظہار کر رہی ہیں۔"

"سچ؟ کیا یہ سچ ہے کہ آپ رضامند ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ میں تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔" عزیزہ نے فرطِ مسرت میں جلیل صاحب کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ جب اس نے ہاتھ چھوڑے تو وہ خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے۔ عزیزہ نے جلدی سے آنسو بھرے ہاتھوں کو اپنے برقعے کے دامن سے صاف کرنا چاہا مگر جلیل صاحب نے آنسو بھرے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا "بیٹی اس پانی کی قدر و قیمت تم نہیں جان سکتی۔"

عزیزہ نے کہا "چچا جان! آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ چچی جان کی بھی رضامندی شامل ہو گئی۔"

جلیل صاحب بولے۔ "گھر تک پہنچنے میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا ہے میں تمہیں مختصراً بتائے دیتا ہوں کہ تھوڑا عرصہ گذرا میں نے اور تمہاری چچی نے بھانپ لیا تھا کہ عقیل اور زبیدہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہنا تو برا نہیں ہوتا لیکن جوانی میں انسان اندھا ہو جاتا ہے اس لئے ہم نے تم لوگوں کو اپنے گھر جانے کی اجازت آسانی سے دی تھی ورنہ کبھی ایسا نہ ہوتا۔

اسلام نے والدین پر اپنی اولاد کے حقوق پورا کرنے اور ان کی دیانت دارانہ حفاظت

کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ جب لڑکا لڑکی دونوں شریف اور نیک ہیں اور جب ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں تو پھر ہم بہت بیوقوف ثابت ہوں گے اگر ان کی رضامندی پر اپنے بے جا حکم کا ڈاکہ ڈالیں۔"

عزیزہ نے کہا "چچا جان! آپ کتنے اچھے باپ ہیں، آپ تو عام باپوں سے بہت مختلف اور نرالے ہیں۔"

"نرالا اس لئے ہوں" جلیل صاحب نے کہا "کہ مجھے کچھ خدا کا خوف ہے اس خدا کا خوف جس نے میری اولاد کو کچھ حقوق دیے ہیں اور ان کی حفاظت کا کام میرے ذمہ کیا ہے۔۔۔ میرے ذمہ بھی اور تمہاری چچی کے ذمے بھی۔"

عزیزہ نے کہا۔ "چچا جان! میں پھر کسی وقت آپ سے شادی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کروں گی۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ اولاد آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے کو پسند کر لیں اور والدین ان کے فیصلہ پر صاد کر دیں۔"

جلیل صاحب بولے۔ "ہاں بیٹی یہ معاملہ تفصیل طلب ہے پھر بھی میں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اسلام نے اتنی آزادی نہیں دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی رضامندی معلوم کرنے سے پہلے اس اولاد کی تربیت کی ذمہ داری بھی والدین پر ڈالی گئی ہے۔ ظاہر ہے اگر والدین اس ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوتے تو وہ اپنی اولاد کی پسند یا ناپسند کو بھی گویا آپ ہی غیر صحت مند اور غیر معیاری بنا دیتے ہیں۔ خیر اس مسئلہ پر میں پھر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالوں گا۔"

عزیزہ نے کہا۔ "چچا جان! اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اور چچی جان نے میرے سوال کو درخورِ اعتنا سمجھ لیا ہے۔"

جلیل صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں سمجھ تو لیا ہے لیکن ابھی تم لوگوں سے بہت منت سماجت کرانی ہے۔"

چونکہ گھر نزدیک آگیا اس لئے یہ موضوع بھی رک گیا۔ مہمان میزبان گاڑیوں سے نکلے۔ عقیل اور کرامت نے کرایہ دینا چاہا لیکن جلیل صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں یہ جرأت

کبھی نہیں کرنی چاہیئے۔"

اس جواب سے عزیزہ، عقیل اور کرامت بے حد خوش ہوئے اور زبیدہ کے ساتھ عائشہ کا بھی سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

عائشہ، زبیدہ کے گھر کے افراد میں اس طرح رچ گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو زبیدہ کی بہن سے کم درجہ نہ دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زبیدہ کے ساتھ عائشہ نے بھی گویا اپنے باپ کے اچھے کردار پر فخر کیا۔"

مہمانوں کے مکان میں داخل ہونے کی دیر تھی کہ زبیدہ کی والدہ فرشِ راہ ہو کر آگے آگئیں۔ ہر ایک سے محبت کے ساتھ ملیں، ہر ایک کے ماتھے پر بوسہ دیا اور پھر بھیگی ہوئی آنکھوں سے جو ان کی آمد کی خوشی سے بھیگ گئی تھیں، دیر تک ان کا نظارا کرتی رہیں۔

عزیزہ آگے بڑھ کر ایک بار اور ملیں۔ "چچی جان! آپ بہت اچھی ہیں، آپ ہمارے بغیر نہیں رہ سکتیں تو ہم بھی کب رہ سکتے ہیں۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔ "تم لوگ تو رہ سکتے ہو، ہم سے نہیں رہا جاتا۔"

عزیزہ نے کہا۔ "جبھی آپ نے گھر جانے کی اجازت فوراً منظور کر لی تھی۔"

یہ جملہ کہہ کر عزیزہ نے چور آنکھ سے جلیل صاحب کی طرف دیکھا جن کی طرف زبیدہ کی والدہ استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

عزیزہ نے دونوں کی حیرت کو یوں ختم کیا۔ "اچھا چچی جان! اب میں دیکھوں گی کہ آپ ہمیں اپنے مکان سے کس طرح نکالتی ہیں۔"

عزیزہ کی اس عجیب و غریب اور معمہ قسم کی گفتگو کا مطلب اور کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔

عقیل نے کہا۔ "عزیزہ! تمہاری گفتگو ایک پہیلی ہے۔"

جلیل صاحب نے کہا۔ "اور ہم دونوں اس پہیلی کا مطلب خوب سمجھ رہے ہیں۔"

کرامت نے کہا۔ "دونوں سے مطلب آپ اور عزیزہ ہیں۔"

جلیل صاحب بولے۔ "جی ہاں، میں اور عزیزہ۔"

والدہ کہنے لگیں "اگر آپ مجھے بھی شامل کر لیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تینوں کو اس معمے کا حل معلوم ہے۔"

عائشہ بولی "آج کل پارٹیوں کا دور ہے۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے چچا جان، چچی جان اور عزیزہ کی پارٹی بن گئی ہے۔"

کرامت بولا۔ "جبھی تو گاڑی میں چچا جان اور عزیزہ اکٹھے بیٹھے تھے۔"

زبیدہ بولی "مگر امی تو گاڑی میں نہیں تھیں جو ان کی پارٹی میں شامل ہو گئیں۔"

"تھیں کیوں نہیں" عزیزہ نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "پوچھ لیجیے چچا جان سے، چچی جان کار میں موجود تھیں۔"

"ہاں یہ درست ہے" جلیل صاحب نے کہا "گویا وہ بھی کار میں موجود تھی۔"

عقیل، کرامت اور زبیدہ حیران ہو کر کہنے لگے "ایک معمے کا حل ابھی معلوم نہیں ہوا کہ دوسرا سامنے آ گیا۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا "بخدا اس معمے کو میں بھی نہیں سمجھ سکتی"

عزیزہ، جو زبیدہ کے والد کی رضامندی سے بے انتہا خوش تھی، کہنے لگی "چچی جان! آپ کار میں بیٹھی ہوئی تھیں یا نہیں لیکن ہم نے آپ کو وہاں ضرور دیکھا اور آپ نے میری بات بھی مان لی۔"

جلیل صاحب ہنس کر کہنے لگے "ہاں میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔"

زبیدہ کی والدہ بولیں "یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے!" ۔ ۔ اب چلئے لنچ روم میں، وہ دیکھئے بشارت انتظار میں کھڑا ہے، رہا یہ معمہ تو اس کا حل بعد میں دیکھا جائے گا۔"

جلیل صاحب نے کہا "میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس معمے کا گہرا تعلق پہلے معمے کے ساتھ ہے"

زبیدہ کی والدہ دانتوں میں انگلی دبائے دوسرے معمے کا حل سوچتی رہ گئیں اور مہمان، میزبان سب انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

اس بار زبیدہ کے والدین ان لوگوں کو بہت دن تک اپنے گھر میں مہمان رکھنے پر بضد رہے ابھی چوتھا یا پانچواں روز تھا کہ ان کو اس بات کی اطلاع ملی کہ جمیلہ بوپاشا کو بایار چوکی سے حسین ڈے چوکی پر لے جایا گیا ہے۔ کچھ روز اور گذرے تو معلوم ہوا کہ ایک فرانسیسی سپاہی نے محض اس وجہ سے نوکری چھوڑ دی ہے کہ وہ جمیلہ پر ہوتے ہوئے مظالم نہیں دیکھ سکتا۔ اس سپاہی کو بھی جمیلہ بن جانا پڑا اور وہ بھی اس کی طرح اپنے بھائی بندوں سے قسم قسم کی سزائیں پانے لگا۔

بہت دن گذر گئے تو عقیل اور کرامت نے گھر جانے کی اجازت چاہی۔

عزیزہ نے بھی منت سماجت سے کہا "اب جانے دیجے اور جلد ہی از خود ہم ملنے آجائیں گے"

زبیدہ کی والدہ نے کہا "میں تو اس وقت تک عزیزہ کو نہیں جانے دوں گی جب تک معمہ نمبر ۲ حل نہ ہو جائے"

عزیزہ بہت حیران ہوئی کہ زبیدہ کی والدہ کو معمے کی بات کس طرح یاد رہی۔ عزیزہ نے کہا "مگر اس معمے کے حل میں تو وقت لگے گا۔"

زبیدہ کی والدہ بولیں "بس پھر ٹھیک ہے دوسرے لوگ چلے جائیں صرف عزیزہ ایک اور دن کے لئے رہ جائے گی۔ اس کے چچا اسے پہنچا دیں گے۔"

عقیل نے کہا "بہت اچھا جناب! آپ معمے حل کرائیے اور ہم معموں کی الجھن میں گرفتار ہوکر روانہ ہوتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے عقیل اور کرامت چل کھڑے ہوئے اور سب نے انھیں خوشی خوشی الوداع کہا۔ جب وہ مکان سے نیچے اترے تو عقیل کے ایک دوست مل گئے جس سے وہ محوِ گفتگو ہی رہا تھا کہ کرامت کے پاؤں کے نزدیک ایک کنکر آکر گرا۔ کرامت نے نظر اٹھائی تو عائشہ مسکرا رہی تھی۔

کرامت بہت شرمیلا نوجوان تھا اور اسے دل کی ان دھڑکنوں کا قطعی علم نہ تھا جو کنکر کے گر جانے پر معاً شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک سخت ناتجربہ کار صاحبِ دل تھا۔ اس نے دوبارہ اوپر دیکھنا چاہا مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔ اسے فوراً یاد آ گیا کہ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے ان کی نگاہیں کئی بار ٹکرائی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ بلاشبہ اس وقت بھی وہ مقناطیسی نگاہوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان نگاہوں سے زیادہ اثر آج کے کنکر میں پایا گیا ہے۔ اس وقت اس کی کیفیت یہ تھی کہ نہ وہ وہاں ٹھہرنا چاہتا تھا اور نہ جانا ہی چاہتا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ عقیل کی اپنے دوست کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ کب ختم ہوتا ہے مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کا دوست مصافحہ کر کے جانے لگا ہے تو وہ دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ ابھی پانچ منٹ اور ٹھہر جائے۔

اتفاق کی بات کہ اس کی دعا قبول ہوگئی۔ عقیل کا دوست یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا "ہاں عقیل میاں ضروری بات تو میں تم سے کرنا بھول ہی گیا۔"

اب کرامت نے بڑی ہمت کر کے نظر اٹھائی تو اسے کھڑکی بے آباد نظر آئی۔ اسے عائشہ پر خواہ مخواہ

غصہ آنے لگا۔ اب اس نے کھڑکی کی طرف بار بار دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا توں توں کرامت کی نگاہیں گھبرائے چلی جا رہی تھیں۔ دو تین منٹ اور گذرنے پر عقیل کا دوست بات ختم کرنے کے موڈ میں دکھائی دینے لگا۔ اس پر کرامت کی دھڑکن بے حد تیز ہو گئی۔ اس نے آخری بار کھڑکی کی طرف دیکھا تو وہاں اب بھی ویرانی برس رہی تھی۔ وہ عقیل کی طرف قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو ہی رہا تھا کہ اس کے سر پر کوئی چیز گرتی محسوس ہوئی۔ اس کی نظر اس چیز پر پڑنے کی بجائے کھڑکی پر پڑی تو ویرانہ، آبادی میں منتقل ہو چکا تھا۔ اس طرف سے پہلے کی طرح مسکراہٹ کی کرن آئی جس کا جواب بڑی ہی مشکل سے مسکراہٹ میں دیا گیا۔ پھر اچانک اس کی نظر زمین پر پڑی تو وہاں ایک لفافہ پڑا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھانے کے ساتھ وہ کنکر بھی اٹھا لیا جس نے سبقت کی تھی۔

یہ دونوں یادگاریں جیب میں ڈالنے کے بعد وہ اضطراری کیفیت لیے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ عقیل نے اپنے بھائی کا تعارف کرایا اور پھر دونوں بھائی اپنے گھر پہنچنے کے لئے ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔ ٹیکسی آئی اور دونوں بھائی اس میں سوار ہو گئے۔

گھر آ کر کرامت کو سوا اس کے کوئی ہوش نہ تھا کہ اس کی جیب میں دو بیش بہا چیزیں پڑی ہیں۔ اس نے کنکر کو تو جیب کا مہمان رہنے دیا لیکن لفافہ کھول کر عبارت پڑھنی شروع کر دی۔

جناب کرامت صاحب السلام علیکم

مختصر سے وقت میں اپنی محبت کا تحفہ پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ اگر میں نے اسلام قبول کر لیا ہے تو مجھے قدرت کی طرف سے آپ جیسے اچھے آدمی کا ساتھ ضرور ملنا چاہئے۔ یہ ساتھ مجھے دو وجہ سے عزیز ہو گا۔ ایک تو عقیل بھائی کی وجہ سے، دوسرے اس وجہ سے کہ آپ لوگوں کے تعلق کے باعث زبیدہ کے گھر سے میرا واسطہ قائم رہ سکے گا۔

میں طبعاً بھٹکنے والی عورت نہیں، پہلا ماحول شاید مجھے بھٹکا دیتا لیکن اب

جو سنجھا ہوا ماحول میسر آیا ہے وہ میری ایک ہی آدمی سے محبت کرائے گا۔ اگر آپ نے انکار کر دیا

تو پھر میں کسی اور کو ساتھی نہیں بناؤں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔

آپ کی اجازت کے بغیر
آپ کی عائشہ

یہ خط پڑھ لینے کے بعد کرامت کا دل دو قسم کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ ایک خوشی کے جذبات سے اور دوسرے بیقراری کے باعث اسکا واسطہ کبھی محبت کے پہلے تیر سے نہ پڑا تھا اب جو پڑا تو اس نے محسوس کیا کہ تیر کا زخم... زخم کیساتھ محبت کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ یعنی زخمی انسان زخم کو دور کرنا بھی چاہتا ہے اور نہیں بھی چاہتا۔

خط پڑھ لینے کے بعد جو اس کا اس نے اثر قبول کیا تو اس کے دوران ہی اسے یہ محسوس ہوا کہ عائشہ کی ہر چیز اچھی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی جدائی بھی بڑی دلآویز۔۔۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جیب سے کنکر نکالا اور اسے دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے منہ سے نکلا "کیسا خوبصورت کنکر ہے۔"

وہ اپنے خیالات میں گم خوبصورت کنکر کو ہاتھ میں لیے ہوئے بیٹھا تھا کہ اچانک عقیل آگیا۔

"یہ کیا ہے کرامت!" اس نے پوچھا۔

"یہ ایک کنکر ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اسے دیکھ کر حیران ہوں کہ کتنا ٹھوس ہے ایسے ہی کنکر سمینٹ میں مل کر فرش کو مضبوط بنا دیتے ہیں۔"

عقیل کو کرامت کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی مگر وہ اس کی تہ میں جانے کی بجائے یہ کہنے لگا۔

"بھئی آج تو میں جمیلہ پھوپا کے حالات معلوم کر کے ہی آؤں گا۔"

کرامت کنکر کو جیب میں ڈالنے کے بعد بولا "بھائی جان! آپ بھی بڑے ضدی آدمی ہیں۔ بھلا آج کل کے مخدوش حالات میں آپ کو گھر سے نکلنا چاہئیے؟ آج کل بازاروں اور گلیوں میں موت اتنی سستی ہو گئی ہے کہ زندگی کا بھروسہ جاتا رہا ہے۔"

عقیل نے کہا "کرامت بھئی زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ ہے۔ وہ بچانا چاہے گا تو بڑے بڑے معرکوں میں بچائے گا اور مارنا چاہے گا تو ہمارے ابا جان کی طرح بہانہ بنا دے گا۔"

کرامت نے کہا "لیکن اس قسم کا بھروسہ اور توکل احتیاط اور کوشش کے بعد جائز ہے

اس سے پہلے نہیں ـــــ یا تو یہ ہوتا کہ آپ تحریکوں میں عملی طور پر حصّہ لے رہے ہوتے ـــــ
اگر نہیں لے رہے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ زندگی کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالا جا رہا ہے ـــــ
گھر سے جا کر آپ نہ جانے واپس کب آئیں گے اور میں خواہ مخواہ انتظار میں گھلتا رہوں گا۔"

عقیل نے کہا۔" میں چوکی پر نہیں جا رہا بلکہ کسی دوست کے گھر جا رہا ہوں جس سے مجھے حمیدہ کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ بشرطِ زندگی دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

کرامت نے کسی قدر خفگی میں کہا۔" ہاں بشرطِ زندگی واپس آ یئے گا۔ ورنہ آپ کی لاش کی مجھے ضرورت نہیں۔"

عقیل نے جاتے وقت مسکراتے ہوئے کہا۔" بہت اچھا جناب آپ کے پاس انشاءاللہ زندگی ہی آئے گی، لاش نہیں۔"

عقیل کے چلے جانے کے فوراً بعد کرامت نے محسوس کیا کہ جان رکھتے ہوئے وہ خود بھی تو عائشہ کے بغیر لاش سے کم نہیں۔

کرامت تو اپنے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا اور اسے یہ یاد ہی نہ رہا کہ عزیزہ اور زبیدہ کے والدین نے معمے کے کیا حل دریافت کیے ہوں گے۔

دوسری صبح جب کہ زبیدہ اور عائشہ دونوں تعلیم کے لیے سکول روانہ ہو چکی تھیں، زبیدہ کی والدہ نے معموں کا ذکر چھیڑ دیا۔

جلیل صاحب کہنے لگے۔" دونوں معموں کا حل اس واقعے کے بیان میں مل جائے گا کہ عزیزہ چھوٹی عمر کی ہونے کے باوجود اب بڑی عمر کی ہو گئی ہے۔"

زبیدہ کی والدہ نے تنگ آ کر کہا۔" یہ آپ نے معموں کا کیسا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اب یہ تیسرا معمہ ہے۔"

عزیزہ ہنس پڑی اور جلیل صاحب نے ایک بار اور کہا۔" یہ معمہ نہیں بلکہ ایک تفریح کا آغاز ہے جو پچھلے معموں کو بھی حل کر دے گی۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ عزیزہ چھوٹی عمر کی ہوتے

کے باوجود بڑی عمر کی ہے۔ اس نے ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے یہ تذکرہ چھیڑ دیا کہ ہم اسے زبیدہ اور عائشہ دے دیں۔ اس تذکرہ سے پہلے وہ اپنے مرحوم والدین کا ذکر کر کے بے ساختہ رو پڑی تھی۔ کہنے لگی کہ وہ ہوتے تو مجھے بڑا نہ بننا پڑتا۔ میں نے اسے جواب میں کہا کہ تم یوں سمجھو کہ تمہارے والدین زندہ ہیں۔ تم ہمیں اپنا والدین سمجھو۔'

زبیدہ کی والدہ بولیں "بھلا اس میں شک ہی کیا ہے۔ اتفاقات نے جو ہمیں آپس میں ملا دیا ہے اور پھر ہماری طبیعتیں بھی مل گئی ہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے کہ تم لوگ ہمیں اپنے ماں باپ سمجھو۔"

عزیزہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اس نے اس کیفیت میں سرنگوں ہو کر کہا "تو پھر مجھے خوشی دیجئے تاکہ میں بھی مطمئن ہو سکوں، میں آپ کو کیا بتاؤں اسی خوف سے کہ کہیں آپ ہمیں نالائق سمجھ کر انکار نہ کر دیں، غمگین رہنے لگی ہوں۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا "دیکھو بیٹی! ہم کسی قیمت پر تمہیں غمگین دیکھنے کو تیار نہیں۔ اس لئے تم چاہو تو دونوں لڑکیوں کو جب وہ سکول سے واپس آتی ہیں اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ دیہں نکاح پڑھا لینا ہم بھی پہنچ جائیں گے۔"

عزیزہ کو زبیدہ کی والدہ کے اس جواب نے دیوانہ بنا دیا۔ وہ ان کے ساتھ چمٹ گئی۔ کبھی ہاتھ چومتی، کبھی پاؤں پر بوسہ دیتی اور کبھی ان کے گال اپنے گالوں سے لگاتی، الغرض وہ ایسی حرکات کر رہی تھی جو خاموش شکریہ کا بہترین انداز تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک بھی تھی اور لبوں پر مسکراہٹ بھی نمودار تھی۔

جلیل صاحب بولے "میں تو بھی اپنی بیٹیاں ایک شرط پر عزیزہ کے حوالے کروں گا۔"

عزیزہ نے غیر ارادی طور پر بغیر سوچے سمجھے کہا "چچا جان آپ جو بھی شرط پیش کریں گے مجھے منظور ہو گی۔"

جلیل صاحب نے کہا "بس یہی شرط کہ تمہیں ہم اپنے گھر رکھ لیں گے۔"

"ضرور، ضرور" عزیزہ نے کہا۔ لیکن فوراً ہی سوچا کہ "گھر رکھ لیں گے" کے کچھ اور معنی بھی تو ہو سکتے ہیں، وہ شرما سی گئی۔

جلیل صاحب بولے "عزیزہ ہماری اپنی بیٹی ہے۔ اس کا بیاہ میں اپنے بھانجے سے کروں گا اگر میرا لڑکا ہوتا تو میں اسے اس کے ساتھ بیاہ دیتا لیکن عزیزہ کو اپنی جان کے ساتھ رکھنے کے لئے میں یہ ضرور کروں گا کہ اپنے بھانجے کو بھی اپنے پاس رکھ لوں"۔

"یہ ٹھیک ہے" زبیدہ کی والدہ نے کہا "ابھی وہ مصر میں ہے اور چند سال بعد آجائے گا"۔

جلیل صاحب کو شرارت سوجھی۔ اس نے کہا "کیوں بیٹی یہ شرط منظور ہے نا؟"

اور منظوری دینے والی عزیزہ شرم کے مارے بھاگ گئی۔ اب وہ اپنے بھائی کا انتظار کرنے لگی جو آکر اسے گھر لے جائے۔

دوسری صبح عقیل نے کرامت سے کہا کہ وہ اپنے سکول سے واپس آکر عزیزہ کو لینے چلا جائے گا۔ کرامت نے دل ہی دل میں کہا "بھائی جان کیسے خود غرض اور ہوشیار ہیں کہ عزیزہ کو لینے کے بہانے اپنی زبیدہ کو بھی دیکھ لیں گے، بھلا مجھے کیوں نہیں بھیجتے"۔

کرامت کو ایسا معلوم ہوا جیسے عقیل نے اس کے دل کی بات سن لی ہے، ذرا ٹھٹک کر کہنے لگا "کرامت! میرا تو یہ خیال ہے کہ تم ہی عزیزہ کو لے آؤ، میں نہیں جاتا"۔

کرامت نے کہا "بہت اچھا میں آپ کے سکول سے واپس آنے تک عزیزہ کو لے آؤں گا"۔

عقیل سلام کر کے سکول کو روانہ ہو گیا اور کرامت اس سوچ میں پڑ گیا کہ زبان سے کہہ دینا کتنا آسان ہے مگر عمل در آمد کس قدر محال۔ اس نے دل میں کہا "میں نہیں جاؤں گا، میں نہیں جا سکوں گا، میں زبیدہ کے گھر کیونکر جا سکوں گا جہاں عائشہ بھی رہتی ہے۔ اس کے آغازِ عشق کے کنکر نے کل ہی تو میرے دل کو زخمی کیا تھا۔ ابھی میرا زخم مندمل نہیں ہوا، میرا یہ فیصلہ ہے کہ میں عزیزہ کو لینے نہیں جاؤں گا"۔

اس فیصلے کے تھوڑی دیر بعد اسے یاد آیا کہ زبیدہ اور عائشہ تو باقاعدہ سکول میں تعلیم حاصل کرنے جاتی ہیں جو سہ پہر کو واپس آتی ہیں اس لئے وہ دوپہر سے پہلے پہلے کیوں نہ جا کر عزیزہ کو لے آئے .. .. .. اب اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر فوراً ہی ایک اور خیال آیا "میں کتنا بدقسمت ہوں کہ عائشہ کے گھر جانے کا بہانہ اور سبب بن رہا ہے مگر اس زرین موقع کو اپنی بے وقوفی اور نادانی کے سبب ضائع کر رہا ہوں۔"

اس خیال کی آمد کو اس نے قدرت کا اشارہ سمجھا اور عین اس وقت گھر سے نکلا جب اس کے خیال میں زبیدہ اور عائشہ بھی سکول سے واپس آ رہی ہوں گی۔ زبیدہ کے گھر پہنچا تو صرف عزیزہ اور زبیدہ کی والدہ موجود تھیں۔ عزیزہ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس نے زبیدہ کی والدہ سے جانے کی اجازت چاہی تو انھوں نے کہا "جب تک کرامت بٹیا کو چائے نہ پلاؤں تب تک کیونکہ جانے دے سکتی ہوں۔"

کرامت نے دل میں کہا "کیا معلوم چاۓ تیار ہونے تک زبیدہ اور عائشہ بھی سکول سے واپس آ جائیں۔"

کرامت نے کہا۔ "چچی جان! یہ تکلیف نہ کیجیے۔ آپ سے تو ہم ہزار بار کھا پی چکے ہیں۔"

زبیدہ کی والدہ بولیں۔ "اول تو یہ مبالغہ آرائی ہے لیکن اگر ایسا ہو بھی تو تم لوگوں کا اس گھر پر سو فیصد حق ہے۔"

عزیزہ نے کہا۔ "چچی جان! میں نے آج تک آپ سے اچھا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔ "چلو ہٹو میری خوشامد نہ کرو، ورنہ میرا مزاج بگڑ جائے گا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھو کہ بشارت میاں چاۓ تیار رہے ہیں یا نہیں؟"

عزیزہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بشارت تو بہت ذمہ دار آدمی ہے، بہرحال میں پتہ کرتی ہوں۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔ "بشارت ہے تو بہت ذمہ دار آدمی لیکن بالکل خاموش طبع۔ تم

ہی کہو تم نے اپنے قیام کے دوران کبھی اس کو زیادہ بولتے دیکھا؟"

عزیزہ نے کہا۔ "ہاں ایک بار دیکھا تھا۔"

اس پر زبیدہ کی والدہ اور کرامت کھلکھلا کر ہنس پڑے اور عزیزہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ عزیزہ نے بشارت کو چولھے کے قریب بیٹھے لطیفوں کی کتاب کا مطالعہ کرتے دیکھا اس نے پکارا۔

"بشارت۔"

"بشارت نے سر کے اشارے سے جواب دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"چائے تیار ہو گئی؟"

بشارت نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"کتنا وقت لگے گا؟"

ہاتھ کی دو انگلیاں دکھلاتے ہوئے سمجھایا۔ "دو منٹ!"

اور دو منٹ کے بعد واقعی چائے دسترخوان پر آ گئی، جہاں عزیزہ کرامت اور زبیدہ کی والدہ بیٹھ گئیں۔ اچانک عزیزہ کی زبان سے نکلا۔ "آج زبیدہ اور عائشہ نے دیر نہیں لگا دی کیا؟"

"نہیں ہرگز دیر نہیں لگائی" یہ الفاظ زبیدہ کے تھے جو اچانک کمرے میں وارد ہوئی تھی۔"

"تمہاری بڑی عمر ہے۔" عزیزہ نے کہا۔ "تمہارا نام لیا ہی ہے اور تم آ گئیں ——
اور ہاں عائشہ کہاں ہے!"

زبیدہ نے جواب دیا۔ "اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے۔" واقعی عائشہ بھی کمرے میں آ گئی۔

"السلام علیکم۔"

کرامت کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "میں کپڑے بدل کر ایک

منٹ میں آتی ہوں"۔

اس نے اپنی گھبراہٹ دور کرنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا۔ کپڑے بدل کر آئی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی کرامت دائیں طرف سامنے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ زبیدہ نے عائشہ سے چائے بنانے کو کہا اور اس نے ہر ایک سے چینی کی مقدار پوچھنا شروع کر دی۔ کرامت نے بھی نگاہیں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دو چمچ"

آج دونوں نے اپنی بے اختیارہ حرکات کی وجہ سے سب پر محبت کا پول کھول دیا۔ چائے پینے کے بعد جب عزیزہ کو اجازت ملی تو کرامت نے بڑی ہی مشکل سے عائشہ کو اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر دکھایا، جسے اس نے کارنس کے کونے پر رکھ دیا۔

پھر جب عزیزہ اور کرامت مکان سے نیچے اتر گئے تو موقع پا کر عائشہ نے وہ لفافہ کرامت کو دکھا دیا تاکہ اس بزدل کو یہ اطمینان رہے کہ لفافہ مکتوب الیہ تک بحفاظت پہنچ گیا ہے۔

عزیزہ اور کرامت چلے گئے اور عائشہ ایک دوسرے کمرے میں رقعہ پڑھنے چلی گئی۔

پیاری عائشہ! سلام محبت

مجھے تمہارا پھینکا ہوا وہ کنکر بہت عزیز ہے جس نے محبت کا آغاز کر دیا میں نے اس کنکر کو حفاظت سے رکھا ہوا ہے وہ انشاءاللہ ساری عمر میرے ساتھ رہے گا۔

میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس سلسلے میں پہل عشق کرتا مگر حسن سبقت لے گیا ہے اور شاید بقول ایک فارسی شاعر کے سب سے پہلے محبوب کے دل میں درد پیدا ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے یہ بھی کہا ہے کہ ؎

مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں
عشق کیوں درمیان ہے پیارے

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے میرے معاملے میں یہ جذبہ زیادہ صحیح ہے۔

میں تمہیں اپنی گھبراہٹ اور بے چینی کا نقشہ الفاظ میں کھینچ کر نہیں دکھا سکتا جو پہلے روز مجھ پر

طاری ہوئی یہ بھی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں اور یہ بھی چاہتا تھا کہ یہاں سے ہلنے کا نام نہ لوں۔
اب کوئی صورت ملاقات کی نکلنی چاہیئے ورنہ یہ بزدل آدمی کبھی زندہ نہ رہ سکے گا۔

۵ر مارچ ۱۹۵۹ء — صرف تمہارا

کرامت

۲۱

جمیلہ بوپاشا کے مقدمے کی سماعت کی تاریخ پہلے ۱۸ مئی مقرر ہوئی مگر بعد میں جب جمیلہ نے تحقیقات کا مطالبہ کیا تو تاریخ سماعت ۱۷ جون تک ملتوی کر دی گئی۔ اس سے پہلے جب کہ ۱۸ مئی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی، جمیلہ بوپاشا کے وکیل غزلی حلمی نے جمیلہ پر کیے گئے مظالم کی سرکاری تحقیقات کرانے کے لیے درخواست پیش کی تو عدالت نے ۱۸ مئی کی بجائے ۱۷ جون کی تاریخ مقرر کر دی۔

جب سے جمیلہ بوپاشا اور اس کے والدین کی گرفتاری عمل میں آئی تھی اس روز سے ۳۳ روز تک بایارجو کی اور پھر حسین ڈے جو کی پر فوج نے ناقابل برداشت مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان مظالم میں ذہنی کوفت پہنچانے کا بھی زبردست سامان موجود تھا۔ پھر اس خیال سے کہ جمیلہ اس کے والد اور بہنوئی جیل میں ایک جگہ رہ کر ایک ہی طرح کے ظلم وستم کی داستان عدالت میں پیش نہ کر دیں جمیلہ کو ہسپتال بھجوا دیا اور باقی عزیزوں کو الگ الگ جیلوں میں۔

۱۸ مئی کی تاریخ کا ہر الجزائری باشندے کو انتظار تھا بلکہ الجزائریوں کے ان عوام و خواص کو بھی انتظار تھا جو الجزائر کو فرانس سے وابستہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ جمیلہ کو کب سزائے موت ملتی ہے جس سے دوسرے مجاہدین خوف زدہ ہو کر الجزائر کی آزادی کا خیال دلوں سے محو کر دیں۔

زبیدہ اور عقیل کے گھروں کو بھی اس روز کا بہت انتظار تھا۔ اس موقع کے لئے زبیدہ کے والد بھی منتظر نظر آرہے تھے۔ ۱۷ مئی کو زبیدہ کے گھر کا ایک ایک فرد عقیل کے گھر میں مہمان ہو گیا، رات وہیں گذاری اور صبح صبح عدالت کا رخ کیا۔ عدالت سے باہر لوگوں کا جم غفیر نظر آیا۔ کسی کو کمرۂ عدالت میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ لوگ جم غفیر سے بہت دور کھڑے ہو گئے کہ اگر عدالتی کارروائی نہیں سنی جا سکتی تو کم از کم پیکرِ حریت جمیلہ بوپاشا ہی کا دیدار کر لیا جائے انھیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ ایک فوجی گاڑی میں جمیلہ بوپاشا آتی ہوئی نظر آئی جسے دیکھتے ہی الجزائریوں نے فلک شگاف نعرے لگائے "جمیلہ بوپاشا زندہ باد۔ جمیلہ بوحارڈ زندہ باد الجزائر پائندہ باد۔"

جمیلہ نے اپنے خستہ حال چہرے پر سدا بہار مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے متحمل ہونے کی درخواست کی"۔

جمیلہ کے کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہی اس کی وہ تحریری درخواست اس کے وکیل عزنی حلمی نے مجسٹریٹ کو پیش کر دی جس میں اس پر کیے ہوئے مظالم کی تفصیل موجود تھی۔

جمیلہ کے وکیل نے مجسٹریٹ کو بتایا کہ اس کا مدعی تحریری درخواست کے ساتھ اپنی زبان سے بھی کچھ تقریر کرنا چاہتا ہے۔ مجسٹریٹ نے اجازت دی تو جمیلہ بوپاشا نے مظالم کی کیفیت تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد کہا کہ اگر اس سے بھی زیادہ مظالم روا رکھے جائیں تب بھی وہ الجزائر کے مطالبۂ آزادی سے کبھی دست کش نہ ہو گی۔

جمیلہ کی زبانی اور تحریری درخواست میں مظالم کی سرکاری تحقیقات کرانے کا مطالبہ موجود

تھا اور یہ مطالبہ اسی وقت تسلیم کرنے کے بعد تاریخ سماعت پورا ایک مہینہ بعد یعنی ۱۷ جون تک ملتوی کر دی گئی ۔ اس کے بعد جمیلہ کو واپس جیل میں بھیج دیا گیا ۔

عزنی حلمی عدالت سے باہر نکلا تو الجزائریوں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔ وہ بڑی محبت سے یہ جواب دیتا رہا ۔ "آپ لوگوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے ۔ خدا رحم کرے گا ۔"

عزنی حلمی اور زبیدہ کے والد ہم جماعت رہ چکے تھے کارروائی کے بعد اس کی نظر ان پر پڑی تو لپک کر آیا اور انھیں اپنے ساتھ لپٹا لیا ۔

"کہئے جلیل صاحب آپ کے مزاج کیسے ہیں ۔ آپ سے کتنی لمبی مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے ——— آپ کی زبیدہ کس حال میں ہے ۔"

جلیل صاحب نے زبیدہ کو نزدیک بلاتے ہوئے کہا "لیجے زبیدہ سے مل لیجے ۔"

زبیدہ نے مؤدبانہ سلام کیا اور پھر عزنی حلمی نے کہا "ہماری بیٹی تو بہت لمبی اونچی ہو گئی ہے ۔"

"جلیل صاحب نے اپنی بیگم سے بھی ملایا اور پھر عزیزہ ، عائشہ سے بھی ۔ اس کے بعد کرامت اور عقیل کا بھی سرسری سا تعارف کرا دیا ۔"

عزنی حلمی نے کہا ۔ "اچھا جلیل صاحب آپ سے اور آپ کے بیٹوں بیٹیوں سے مل کر بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے لیکن ، یہ تو بتائیے کہ اب آپ سے کب ملاقات ہو گی ۔"

جلیل صاحب نے کہا "کل ہمارے غریب خانہ پر جہاں آپ شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھا رہے ہیں ۔"

عزنی حلمی نے کہا "آپ کی محبت کا بہت بہت شکریہ لیکن میرے مؤدبانہ انکار کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں کہ مجھے جمیلہ بوپاشا کا کیس تیار کرنے میں کوئی وقت نہیں ملتا ، ہاں اگلی تاریخ سماعت کے بعد اگر میں نہ آؤں تو آپ ضرورت شکایت کر سکتے ہیں ۔"

جلیل صاحب نے کہا ۔ "تو گویا آپ مجھے شکایت کا موقع دینا چاہتے ہیں ۔ غریب خانہ

کی دعوت کا موقع نہیں دینا چاہتے۔"

عزلی حلمی ہنس پڑے۔"جلیل صاحب! آپ تو مجھ سے زیادہ اچھے وکیل معلوم ہوتے ہیں۔ بات سے کیسی بات نکالی ہے۔"

جلیل صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے مگر یاد رکھئے، آج ون کے بعد کی دعوت دینے میں میرے علاوہ تمام گھر کا بھی شوق شامل ہے۔"

عزلی حلمی نے کہا۔" بخدا میں ان سب کی دعوت کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھوں گا۔"

اس کے بعد جلیل صاحب عزلی حلمی سے الوداعی مصافحہ کر کے اپنے گھر آ گئے۔

گھر آئے تو بشارت نے سب کو لنچ روم میں پہنچنے کا اشارہ کیا اور سب کے سب وہیں پہنچ گئے۔ تھکے ماندے تو تھے ہی مگر بھوک بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ آج پہلا موقع تھا کہ ٹیبل ٹاک کی بجائے ٹیبل پر پڑی ہوئی سالن کی پلیٹوں کو صاف کرنے میں وقت صرف کیا گیا۔ کھانا کھاتے وقت سب کے سب بشارت بنے رہے یعنی کسی کے منہ میں زبان معلوم نہ ہوتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو بشارت جھٹ قہوہ لے آیا۔ بھوک چونکہ مٹ چکی تھی اس لئے قہوہ پینے سے پہلے ٹیبل ٹاک کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے عائشہ نے خاموشی کو توڑا۔

"میرا خیال ہے بے خوفی بھی انسانی زندگی میں لازوال نعمت ہے۔ میں نے حمیلہ بوپاشا کے چہرے پر اس نعمت کے بھرپور آثار پائے۔"

جلیل صاحب بولے۔"بیٹی تمہارا مشاہدہ بالکل درست ہے۔ میں نے بھی اس کے چہرے کے آثار میں جو اطمینان دیکھا تو مجھے اس پر رشک آنے لگا۔"

کرامت بولا۔" یہ بے خوفی اور بے نیازی کی قدر و منزلت دیکھنی ہو تو بڑے بڑے امیروں کی گرفتاری کے وقت دیکھئے، ڈر اور خوف کی وجہ سے ان کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ بیان دیتے وقت زبان ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ ذلیل ترین خوشامد پر اتر آتے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر انسانیت کانپ اٹھتی ہے اور اسے ایسے لوگوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا: "اس کی وجہ بنیادی تربیت ہے یا محض اتفاقی طور پر ودیعت شدہ نعمت"

جلیل صاحب بولے "زیادہ تر اس میں تربیت کا ہاتھ ہوتا ہے اور یہ تربیت زندگی کا مقصد نظر قائم کرنے سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ ہماری سنہری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں حضور رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی بے خوفی اور جرأت مندی کے واقعات کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہمارے یہ سب بزرگ جہاں تلواروں سے کفار کی فوج کو کھیت کی طرح کاٹ ڈالتے تھے وہاں ان کے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ناقابل فراموش مثالیں بھی قائم کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبعاً جنگجو نہ تھے بلکہ وقت کا تقاضا پورا کرنا جانتے تھے۔ مروت کا وقت آیا تو غیر اقوام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا رحم کرنے کا وقت آیا تو ایسے وقت عام معافی دے دی جس وقت کسی کو بچ سکنے کا خیال تک نہ تھا۔ اسی طرح انصاف کا موقع آیا تو قاضی نے خلیفۂ وقت کا بھی لحاظ نہ کیا اور جنگ کا وقت آیا تو دشمن کی فوج میں شامل باپ کی جان بھی نہ بچائی۔ مسلمان کے کریکٹر کے یہ سارے پہلو بتاتے ہیں کہ وہ سچائی اور فطرت پر مبنی تعلیم سے استفادہ کرتے تھے اور ان کی تربیت ایسے ماحول میں ہوتی تھی جہاں کی غالب اکثریت کسی پہلو میں بھی انسانیت اور انصاف کے دائرے سے باہر نہ نکلتی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ الجزائریوں کی بھی غالب اکثریت زیادہ سے زیادہ حد تک ان اوصاف کی حامل ہے۔ انسان کے اندر ہر قسم کی صلاحیتوں کے جوہر موجود ہوتے ہیں اور یہ جوہر عملی زندگی میں صحیح اور پاکیزہ تربیت ہی لا سکتی ہے۔ جمیلہ بوپاشا کو بھی ایسی ہی تربیت ملی ہے جس کے باعث موت کے پنجے سے ہاتھ ملا لینا اس کے نزدیک معمولی سی بات ہے"

عقیل نے کہا "چچا جان! آپ کے خیالات سن کر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیا آپ صدر ڈیگال کے بارے میں بتا سکتے ہیں کہ آیا اس کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں؟ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ صدر ڈیگال الجزائر کا کئی بار دورہ کر کے مسلمانوں کو اپنی ہمدردی کا یقین دلا چکے

ہیں ۔"

جلیل صاحب نے جواب دیا۔" برخوردار ہمیشہ یاد رکھو صدر ڈیگال کو اگر ہمارے ساتھ ہمدردی ہوگی تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے حالات کے آئینے میں یہ حقیقت صاف اور واضح طور پر دیکھ لی ہے کہ الجزائر میں خوں ریزی اور قتل و غارت جس قدر بھی کیا جائے گا۔ اس کا فائدہ کچھ نہ ہوگا کیونکہ دس لاکھ کے قریب شہادتوں کے بعد بھی الجزائری مسلمانوں کے مطالبہ کی کیفیت میں ذرا فرق نہیں آیا بلکہ اور اضافہ ہو گیا ہے ۔"

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ صدر ڈیگال اب الجزائر کا تنازعہ نپٹانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں جو ساڑھے چار کروڑ فرانسیسیوں نے ان کے شانے پر ڈال دی ہے ۔ علاوہ ازیں پارلیمنٹ کے ممبر بھی الجزائر کے متعلق ان کی پالیسی کے حق میں نہیں ۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم بھی الجزائری تنازعہ کے حل میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں ۔

اس ساری صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ فرانسیسی عوام کے نزدیک صدر ڈیگال کی ہر دلعزیزی جلد ختم ہو جائے گی ۔ لیکن پارلیمنٹ کے اراکین اور وزیر اعظم اچھی طرح جانتے ہیں کہ الجزائر کے تنازعہ کا حل صدر ڈیگال کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا ۔ اس ساری کشمکش کا باعث الجزائریوں کا وہ عزم ہے جو اطلس سے بھی زیادہ اٹل اور ٹھوس ہے ۔"

زبیدہ نے کہا ۔" ابا جان! آپ کے سامنے بولنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے لیکن آپ ہی کے دلائے ہوئے شعور کی روشنی میں، میں اپنا ایک خیال ظاہر کرنا چاہتی ہوں ۔"

" ضرور کرو بیٹی ۔" اس کے والد کے ساتھ اس کی والدہ نے بھی کہا ۔" اس سے زیادہ اور خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ تم اتنی چھوٹی عمر میں ملک کے حالات سے بھی باخبر ہو اور حالات پر صحت مندانہ تنقید کرنا بھی جانتی ہو ۔"

زبیدہ نے کہا ۔" میرا یہ خیال ہے کہ صدر ڈیگال ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہے جو فطرتاً حقیقت پسندانہ نظر رکھتے ہیں ۔ میرے خیال میں صدر ڈیگال برسر اقتدار آتے ہی

الجزائری عوام کے لئے حق خود ارادیت کا حامی تھا' وہ صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ آیا حق خود ارادیت کے حصول کی الجزائریوں کے اندر سچی تڑپ بھی موجود ہے یا نہیں، جب اس نے دیکھ لیا کہ موجود ہے' یعنی الجزائریوں کے اٹل عزائم نے ثابت کر دیا کہ تڑپ ضرور موجود ہے تو پھر وہ نہایت چابک دستی کے ساتھ اس حق کو دے دینے کے سامان کرنے لگا۔ اب بھی میرا خیال یہ ہے کہ وہ کسی بھی الجزائری رہنما کو سزائے موت نہ دلائے گا' اور اگر دلائے گا تو بعد کو سزا میں تخفیف کرنے کے بعد رہا کر دے گا۔ ابا جان! میں نے حالات کا عمیق ترین مطالعہ کیا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی بات آئی ہے، آپ لوگ ناراض نہ ہوں تو یہ کہوں کہ میں صدر ڈیگال کو محسن سمجھتی ہوں۔"

عقیل نے کہا "خیر میں اسے محسن تو نہیں سمجھتا مگر سمجھ دار سیاست دان ضرور سمجھتا ہوں۔"

عائشہ نے زبان کھولی۔ "آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے پرانے ہم مذہب کی تعریف کی۔"

اس جملے پر سب ہنس پڑے اور پھر قہوے سے فارغ ہو کر سب منتشر ہو گئے۔

۳۲

۷ جون کا سورج طلوع ہوگیا اور اس کی روشنی میں ۱۸ مئی سے بہت زیادہ خلقت عدالت کے باہر جمع ہوئی۔ زبیدہ اور عقیل کے گھر والوں نے اس مرتبہ وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ ۱۷ مئی کے تجربے نے ان پر ثابت کر دیا تھا کہ عدالتی کارروائی کسی صورت میں نہیں سن سکیں گے۔ البتہ آج یہ دونوں گھر اپنی اپنی جگہ عدالت کی کارروائی سننے کے لئے بے چین تھے جو انھیں عدالت کے برخاست ہونے پر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔ دوسرے انھیں یہ بھی خیال تھا کہ جب وہ غزالی حلمی کو دعوت پر بلائیں گے تو پوری تفصیل سن لیں گے۔

آج سہ پہر کو جلیل صاحب غزالی حلمی کے مکان پر گئے۔ جہاں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس نے جلیل صاحب کو دیکھتے ہی خدا کا شکر کیا اور الگ لے جا کر کہنے لگا "لوگ تو میرا پیچھا نہیں چھوڑتے اس لئے آپ مجھے کل صبح اغوا کر کے لے جائیے میں کل آپ کے ہاں کھانا کھاؤں گا۔

مگر شرط یہی ہے کہ مجھے چھپا کرے جائیے۔"

جلیل صاحب بہت خوش ہوئے کہ انھیں دعوت پر بلانے کی تحریک نہ کرنی پڑی۔ چنانچہ دوسرے روز کی رخصت دلا کر زبیدہ اور عائشہ کو جدید قسم کے مینو کے مطابق کھانے تیار کرنے کو کہہ دیا۔ عقیل کے گھر بھی اطلاع دے دی جو دوسری صبح پہنچ گئے۔

عزلی حلمی کے ساتھ زبیدہ کے والد کا یہ پروگرام طے پایا تھا کہ وہ انھیں گیارہ بجے لینے آئیں گے، چنانچہ زبیدہ کے والد گھر سے ساڑھے دس بجے نکل گئے۔ بشارت نے زبیدہ کے زیرِ ہدایت خاص طور پر اچھے کھانے تیار کئے اور وہ گیارہ بجے تک تیار ہو چکے تھے۔ اب گھر والوں کو عزلی حلمی کا انتظار تھا۔ خیال تھا کہ گیارہ بجے نہیں تو ساڑھے گیارہ بجے پہنچ جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

درحقیقت عزلی حلمی کے بے تکلف دوستوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، دو دوست جاتے تھے تو چار اور آجاتے تھے۔ آخر جلیل صاحب نے حکمتِ عملی سے کام لیا اور کافی انتظار کے بعد کہا "عزلی بھائی میں آپ کے احباب کو آپ کی ملاقات سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اتنی دیر تک بیٹھا رہا اب چونکہ پانی سر سے گذرنے والا ہے۔ اس لئے میں آپ کے احباب سے معذرت خواہ ہوتے ہوئے آپ کو کہیں لے جانا چاہتا ہوں۔"

عزلی حلمی نے اسی وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر بہانہ بنا لیا "ہاں جلیل صاحب وہ کیس تو بہت ہی ضروری ہے۔"

احباب نے اب عزلی صاحب کو ٹھہرنے پر مجبور نہ کیا اور عزلی کپڑے بدل کر جلیل صاحب کے ساتھ باہر آگئے۔ اگرچہ باہر بھی کئی دوست مل گئے جو ان کے پاس بیٹھنے آئے تھے لیکن انھوں نے معذرت کر دی اور پھر جلیل اور عزلی دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں پہنچ گئے جہاں بہت سی مخلصانہ نگاہیں فرشِ راہ بنی ہوئی تھیں۔

زبیدہ اور عائشہ نے آج بڑے کمرے میں دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ کمرہ اندر کی

طرف تھا۔ مصلحت اس میں یہ رکھی گئی کہ گفتگو کی آواز باہر نہ جاسکے گی اور گھر کے تمام افراد وسیع جگہ پر بیٹھ سکنے کی گنجائش پا سکیں گے۔

جلیل صاحب اور عزلی کے تعلقات بہت گہرے تھے اس لیے آج کی دعوت میں انھوں نے اپنی بیوی کا بھی پردہ اتروا دیا۔ اس طرح سب ایک جگہ بیٹھ کر دعوت میں شریک ہوئے۔ اور فراغت کے بعد جب قہوے کا دور آیا تو سیاسی گفتگو کی ابتدا ہو گئی۔

زبیدہ کی والدہ کے دریافت کرنے پر عزلی حلمی نے بتایا کہ حمیدہ بو پاشا صرف جری اور بہادر ہی نہیں، بے حد زیرک اور مدلل بھی ہے۔ میں نے اس کا جتنا کیس تیار کیا اس میں اس کے دخل کا بہت سا حصہ شامل ہے۔"

زبیدہ نے پوچھا: "آپ کے خیال میں حمیدہ کو سزا ہو گی یا نہیں؟"

عزلی حلمی نے کہا: "یقیناً ہو گی —— کیونکہ حمیدہ اخلاقی قیدی نہیں بلکہ سیاسی قیدی ہے اور سیاسی قیدی کو عدالت میں ہمیشہ رسم پوری کر کے لوگوں کی اشک شوئی کرنا مقصود ہوتا ہے۔"

کرامت کی دریافت پر اس نے کہا: "آپ کو معلوم نہیں کہ سیاسی شخصیتوں کا مقدمہ لڑنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ کمرہ عدالت میں سیاسی شخصیت کے سر سے خون بھی بہتا نظر آئے تو مجسٹریٹ کو وہ کبھی نظر نہیں آتا۔ اس ڈاکٹر کو بھی یہ خون نظر نہیں آتا جسے مجسٹریٹ معائنہ کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ ملزم کے حق میں بیان دینے سے اس کی اپنی جان پر بن سکتی ہے۔"

عائشہ نے کہا: "سنا ہے آپ کو مقدمے کی تیاری کا شروع میں بہت کم وقت دیا گیا۔"

عزلی حلمی نے کہا: "ہاں بالکل کم وقت دیا گیا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ حمیدہ کی پہلی پیشی ۱۹ مئی کو تھی اور مجھے صرف ۱۶ سے ۱۹ مئی تک مختصر مدت کے لئے الجزائر میں رہنے کی اجازت ملی۔ اس طرح گویا مجھے تیس گھنٹے تیاری کے ملے، اب آپ ہی کہئے کہ اس طرح کے طرزِ عمل کا کیا مطلب ہے، صرف یہی کہ میں اپنے موکل کا کیس کسی حد تک بھی مضبوط نہ بنا سکوں۔

پہلی پیشی کے بعد جب کل پیشی ہوئی تو میں اور حمیدہ اس بات سے ضرور خوش تھے کہ ہم دونوں نے

اپنی بھڑاس نکال لی۔ جمیلہ کی طرف سے کیے گئے مظالم کی تفصیل پڑھی گئی۔"

یہ کہہ کر عزلی حلمی نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کہا۔" یہ دیکھیے اس کی درخواست کی میں نے ایک نقل اپنے پاس رکھ لی تھی۔ درخواست میں مظالم کی فہرست ملاحظہ ہو۔ جمیلہ نے لکھا۔"

"۱۱ اور ۱۲ فروری کی درمیانی رات کو قریباً پچاس سپاہی میرے والدین کے گھر گھس آئے۔ انھوں نے مجھے، میرے والدین، میری بہن اور میرے بہنوئی کو خوب پیٹا، پھر انھیں بایار چوکی پرے گئے۔ جہاں فرانسیسی فوجیوں نے مجھے انتہائی زدوکوب کیا۔ اس قدر زیادہ کہ میری پسلی ٹوٹ گئی۔ زدوکوب کرنے کا یہ سلسلہ پانچ روز تک ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ ہمیں حسین ڈے چوکی پرے گئے جہاں ظلم وستم کا دوسرا دور شروع ہوا۔ میری چھاتیوں، رانوں، چہرے اور میرے جسم کے دوسرے نازک حصّوں کے ساتھ بجلی کے تار باندھ کر برقی جھٹکے لگائے گئے۔ جب برقی رو بند ہو جاتی تو مجھ پر گھونسوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ میرے جسم کو سلگتے ہوئے سگریٹوں سے داغا گیا۔ یہی نہیں، مجھے لکڑی کے ایک ڈنڈے سے باندھ کر الٹا لٹکایا جاتا رہا اور اس کے بعد میرے سر کو پانی سے بھرے ہوئے ایک برتن میں بار بار ڈبویا جاتا رہا۔ غوطے آنے کی وجہ سے میں کئی بار بے ہوش ہو جاتی رہی۔ مجھ پر سب سے زیادہ ذلیل اور گھناؤنا جو ظلم کیا گیا وہ یہ تھا کہ مجھے ایک خاص زاویے میں الٹا لٹکا کر میرے جسم کے اندر لمبی سی بوتل ٹھونس دی جاتی، جس سے میرا درد کے مارے برُا حال ہو جاتا اور میں فلک شگاف چیخیں مارنے لگتی۔

میرے علاوہ میرے باپ اور بہنوئی کو خاص طور پر مظالم کا شکار بنایا گیا۔ یہ منظر میری آنکھوں کے لئے اور اُن کی چیخیں میرے کانوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ اِس طرح مجھے ذہنی کوفت پہنچائی گئی۔

اس ساری کارروائی کے بعد مجھے تو ہسپتال بھیجا گیا مگر میرے والدین اور بہنوئی وغیرہ کو مختلف جیلوں میں پہنچا دیا گیا۔" اس سارے امر واقعہ کو آپ کی خدمت میں پیش کر کے ملتجی ہوں کہ میرے ان مظالم کی سرکاری تحقیقات کرائی جائے۔"

عزلی حلمی نے کہا۔" یہ بھی درخواست جمیلہ بوپاشا کی جو عدالت میں پیش ہوئی۔ دوسری بیٹی

کے موقع پر مجسٹریٹ نے جمیلہ پر یہ فردِ جرم عائد کیا کہ اس نے اسی سال کے ماہ جنوری میں ایک کیفے پر دستی بم پھینکا تھا۔ نیز وہ الجزائری حریت پسندوں کو ان کی روپوشی میں مدد دیتی تھی۔"

کرامت نے پوچھا۔ "عدالت کی کارروائی تو سنائیے۔"

عزی حلمی نے کہا۔ "کارروائی یہ ہوئی کہ عائد کردہ الزامات کے حق میں عدالت کو کوئی شہادت نہ مل سکی ایک فرانسیسی ڈاکٹر کی رپورٹ پیش ہوئی جس نے جمیلہ کے زخموں کا معائنہ کیا تھا۔

اس نے یہ رپورٹ دی کہ واقعی جمیلہ بوپاشا کے جسم پر تشدد کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

اس رپورٹ کے بعد غیر معین عرصہ کے لئے مقدمہ میں التوا پڑ گیا ہے۔ اب دیکھئے فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ ہمارے اندازے کچھ بھی ہوں لیکن درحقیقت فیصلے کا علم تو عالم الغیب ہی کو ہے۔"

عزی حلمی آج قریباً سارا دن اپنے دوست جلیل کے گھر رہے اور پھر شکریہ کے بعد اجازت لے کر چلے گئے۔

۳۳

جنرل سالان جسے فرانس کے صدر ڈیگال نے اپنے عہدِ حکومت میں الجزائر سے پیرس میں طلب کرکے انسپکٹر آف ڈیفنس کا اعزازی عہدہ دے دیا تھا، اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ اس کے لئے اعزاز نہیں بلکہ سیاسی چال ہے، چنانچہ وہ جنرل ڈیگال کے سخت خلاف ہوگیا اور فوج میں اپنے ہم خیالوں کی جماعت بنانے پر مستعد ہوگیا۔ چونکہ فوج سے استعفا دینا آسان نہ تھا اس لئے وہ خاموش رہ کر ہی اپنی کوششیں جاری رکھ سکا۔ لیکن اس کی یہ کوششیں اس کے مقصد کو کم تقویت نہیں پہنچا رہی تھیں اس نے اپنی خاموش پالیسی کے تحت اپنے ڈھب کے بہت سے آدمی چن لئے تھے۔ اب وہ اس انتظار میں تھا کہ اس کی ملازمت کے دن کب پورے ہوتے ہیں۔ اسے اگلے سال کے ماہ جون کا شدید انتظار تھا، آخر یہ مہینہ آیا تو ریٹائر ہونے کے فوراً بعد اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "اب میں آزاد ہوں" چنانچہ اس نے فوراً حکومت کے خلاف تقریریں کرنا شروع کردیں،

اور خفیہ طور پر الجزائر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے آندرے ذیلر اور ریڈمنڈ جو ہاڈ کو ہمراہ لیا اور اپنے گھر پہنچا۔ اس گھر میں اس کی بیوی اور بیٹی موجود تھیں۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی وردی پہنی اور پھر جنرل مارس کے ہیڈ کوارٹر میں (جو الجزائر میں سالان کی جگہ متعین تھا) گیا اور وہاں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کی۔

اس نے جن لوگوں پر اعتماد کر کے انھیں جنرل ڈیگال اور وزیروں کو قتل کرنے بھیجا، ان میں سے دو آدمی دلی طور پر اس تحریک کے خلاف ہو گئے جس کے باعث جنرل ڈیگال تک حکومت کا تختہ الٹنے کی خبر پہنچ گئی۔ اس نے ان لوگوں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے اور جنرل مارس اور ذیلر گرفتار کر کے فرانس روانہ کر دیے گیے۔ اب حکومت کو جنرل سالان اور جو ہاڈ کی تلاش تھی مگر وہ دونوں روپوش ہو چکے تھے۔ عدالت نے جنرل سالان اور جنرل جو ہاڈ کی فوری گرفتاری کے احکام جاری کر دیے جب وہ دونوں گرفتار نہ کیے جا سکے تو عدالت نے ان کی غیر موجودگی میں دونوں کو سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس لمحہ بھی ان کی گرفتاری عمل میں آئے گی انھیں سزائے موت مل جائے گی۔

جنرل سالان کو جب اپنی سزائے موت کا علم ہوا تو وہ فرانس سے بھاگ کر سپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں پہنچ گیا۔ یہاں وہ محض اپنے آپ کو حکومت اور پولیس کی نگاہوں سے بچاتا نہ رہا بلکہ وہ کام کرتا رہا جسے وہ اپنے ضمیر، اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔ یعنی وہ الجزائر کو فرانس سے منقطع نہ رکھنے کے لئے اپنے حامیوں کی تعداد میں خفیہ طور پر اضافہ کرتا رہا تھا۔

۱۹۶۰ء کے آخری دو مہینوں کے اندر فرانس کی رونق میں پھیکا پن پایا جانے لگا۔ ہر ایک کا یہی احساس تھا کہ یہ میلہ چار دن کا ہے۔ اس کے بعد ویرانی کا تسلط ہو جائے گا۔ لوگوں کے چہروں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ جنرل کی حکومت کا کون حامی ہے اور کون دشمن اور اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ جنرل سالان دوسرے اہم ریٹائرڈ فوجیوں کے ساتھ مل کر خاموشی سے اپنا محاذ مضبوط بنائے جا رہا تھا آخر جب ۱۹۶۱ء کا سورج طلوع ہوا تو اس کے عزائم ایک عظیم الشان تنظیم بنانے پر تل گئے

چنانچہ ۱۵ ر فروری کو جنرل سالان نے اپنے حامیوں کے سامنے او۔ اے۔ ایس کے قیام کی تجویز رکھی جس کا مقصد خفیہ طور پر دہشت پسندانہ کارروائیوں میں اس حد تک حصہ لینا تھا کہ الجزائری اپنے مطالبۂ آزادی سے باز آجائیں۔ جنرل سالان کی اس تجویز کو فوراً منظور کر لیا گیا۔

تنظیم بن جانے کے بعد حکومت فرانس جس قدر اس کی سرگرمیوں کو کچلنے پر مستعد ہوئی اس سے زیادہ تنظیم نے اپنا اثر رسوخ الجزائر کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اگرچہ حکومت فرانس کے نزدیک سالان کی جماعت چند سرپھرے سیاستدانوں کا گروہ تھا۔ لیکن درحقیقت حکومت ان سرپھروں کی کارگذاریوں سے خوف کھانے لگی۔ سالان کی یہ جماعت آزاد الجزائر کی اس حکومت کا اثر و رسوخ ختم کرنا چاہتی تھی جس کی خفیہ کارگذاریاں یورپی آباد کاروں کے لئے ناقابل برداشت مصیبت بنتی چلی جارہی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں او اے ایس کی تنظیم الجزائر کی آزاد حکومت کا ردِ عمل تھی، حالانکہ الجزائر کی آزاد حکومت خود مدت مدید سے او اے ایس کی تنظیم کے پیدا ہونے والے جذبات کے علاوہ فوجی کارروائیوں کا ردِ عمل تھی۔ اس وقت یہ حال تھا کہ آزاد الجزائر کے افراد مدافعت کے لیے جتنے حملے کرتے، او۔ اے۔ ایس کے دستے اس سے زیادہ مظالم کا سلسلہ شروع کر دیتے۔

سالان کی خفیہ تنظیم نے اپنی کارروائی شروع کرنے سے پہلے الجزائر میں مقیم یورپی آباد کاروں کے بیشتر مکانوں کو پلاسٹک کے بموں سے بھر دیا تاکہ مدافعت یا جارحانہ کارروائی کے وقت وہ دہشت پھیلانے میں کمزوری نہ دکھا سکیں۔

خفیہ تنظیم کے دستوں کی کارروائی اس طرح شروع ہوئی تھی کہ ایک کار آکر ایک مسلمان کے مکان کے پاس رکی اور اس میں سے ایک آدمی نکل کر مکان کے دروازے میں ٹائم بم رکھ کر کار میں واپس آگیا اور کار کے روانہ ہونے کے کچھ منٹ بعد بم چل گیا جس نے گھر والوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔

خفیہ تنظیم کے کارکنوں نے راہ چلتے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر فرار ہونا شروع کر دیا۔ کاروں میں ٹائم بم رکھ کر بھاگ گئے۔ کیفوں اور ہوٹلوں کو پلاسٹک

کے بموں سے اڑا دیا۔ تیز رفتار جیپوں سے مشین گنوں کے ذریعے گولیوں کی بوچھاڑ کی جاتی رہی۔

عقیل، کرامت اور عزیزہ کو جب ان دنوں زبیدہ کے والدین کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو راستے میں وہ معجزانہ طور پر بچ سکے۔ اگر ان کی ٹیکسی ایک فرلانگ پہلے رک جاتی تو تینوں میں سے کوئی بھی نہ بچتا۔ آج انھوں نے زبیدہ کے گھر جاکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شکرانے کے نفل ادا کرنے کے بعد کچھ رقم خدا کی راہ میں تقسیم کی۔

عزیزہ نے سب کے درمیان سوال کیا۔ "دہشت پسند خفیہ تحریک کے پاس اسلحہ اور بارود کہاں سے آگیا ہے؟"

زبیدہ نے جواب میں کہا۔ "حکومت مہیا کرتی ہے اور کہاں سے حاصل ہوتا ہے۔"

جلیل صاحب بولے۔ "حکومت تو خیر مدد نہیں کرتی کیونکہ جنرل ڈیگال اس تحریک اور اس کے بانیوں کے سخت خلاف ہے البتہ حکومت کی فوج اور پولیس کا وہ حصہ چوری چھپے ضرور امداد بہم پہنچاتا ہے جن کی ہمدردیاں جنرل ڈیگال کے ساتھ نہیں بلکہ سالان کے ساتھ ہیں۔"

عائشہ نے پوچھا۔ "کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جنرل ڈیگال اپنے موقف میں دیانت دار ہے؟"

جلیل صاحب نے جواب دیا۔ "حالات تو یہی بتاتے ہیں۔"

عقیل بولا۔ "جنرل سالان اور جنرل جوہاڈ روپوش ہونے کے بعد پیرس اور الجزائر کے جن فوجیوں کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں وہ لازمی طور پر اس تحریک کو ہر قسم کی مدد پہنچا رہے ہوں گے اور پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ ان کی یہ مدد بھی کم نہیں کہ وہ ہر قسم کا اسلحہ فراخ دلی سے مہیا کر رہے ہیں لیکن اس سے زیادہ مدد یہ ہے کہ وہ اس خفیہ تحریک کی کارروائی میں مزاحم بالکل نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کی خفیہ تحریک تھوڑا سا اقدام بھی کرتی ہے تو ان کی گرفتاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔"

کرامت نے کہا۔ "میرا خیال ہے اس تحریک کو فوج کے علاوہ الجزائری باشندے بھی مدد دیتے ہیں۔"

جلیل صاحب مسکرا کر بولے۔ "ہاں الجزائر میں رہنے والے یورپی آباد کار اور فرانسیسی باشندے

خود بھی مدد دیتے ہیں اور ان سے مدد لی بھی جاتی ہے۔"

عقیل نے کہا" چچا جان اس کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ ہے" جلیل صاحب نے جواب دیا۔ "سالان کی خفیہ فوجی تنظیم کے ساتھ جو فرانسیسی اور یورپی آباد کار دلچسپی رکھتے ہیں وہ تو خود بخود زر و دولت سے مدد پہنچاتے ہیں لیکن جنھیں خیال نہیں آتا ان سے مدد بلیک میلنگ کے ذریعے لی جاتی ہے۔ مثلاً ڈرا دھمکا کر حتیٰ کہ قتل و غارت کر کے بھی جبراً مدد حاصل کی جاتی ہے۔ جس خاندان کے دو افراد کو قتل کیا اس خاندان سے زر و مال کی بھی زیادہ سے زیادہ مدد حاصل کی۔ جو فرانسیسی اس تحریک سے نفرت کرتے ہیں انھیں اغوا کر لیا جاتا ہے اور پھر ان کے عزیزوں سے ان کی جانوں کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ بلیک میلنگ کا طریقہ اٹلی کے بدنام ڈاکو اور لٹیرے عام طور پر اختیار کرتے ہیں۔ لیکن فرانسیسی دہشت پسند محض اپنی سیاسی اغراض کے لئے ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔"

عقیل نے کہا۔ "چچا جان! فرانسیسی دہشت پسندوں نے جن باشندوں کو بلیک میل کیا ہے ان میں فرانس کے بڑے بڑے سرمایہ دار اور مشہور اکابر بھی تو شامل ہیں۔"

جلیل صاحب نے جواب دیا۔ "بالکل درست ہے۔ اور تو اور ذرا آپ لوگ خیال کیجے کہ جس روز دہشت پسندوں کو یہ خیال آیا کہ ایکٹر اور ایکٹرسیں بھی بہت مال دار ہیں، کیوں نہ ان سے مال حاصل کیا جائے .. .. تو انھوں نے برجی باردت نامی ایک ایکٹریس کو اس مضمون کا خط لکھا۔ "تم فلاں وقت مقررہ پر ایک مخصوص رقم چندے کے طور پر خفیہ فوجی تنظیم کو نہیں بھیجو گی تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔"

برجی باردت نے یہ خط فوراً پولیس کے حوالے کر دیا اور اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وہ اس تنظیم کو امداد دینے کی بجائے قتل ہو جانا گوارا کرے گی۔"

کرامت نے کہا۔ "چچا جان! آج کل فرانسیسی دہشت پسند اپنی کارروائیوں میں اس قدر تیز ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جنگ کی آگ بھڑک جانے کا خطرہ ہے اس کا اندازہ مجھے اس بات

سے ہوتا ہے کہ میں نے کئی مقامات سے گذرتے ہوئے یہ آوازیں سنی ہیں۔

"ڈیگال کو پھانسی پر لٹکا دو۔"

"الجزائر فرانس کا حصہ ہے۔"

"ہم مسلمانوں کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔"

ان نعروں کے بعد مسلمانوں کا قتل و غارت شروع ہو جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ الجزائری پولیس یہ سارا تماشا دیکھتی ہے مگر بجائے دہشت پسندوں کو کچھ کہنے کے۔ مسلمانوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرتی رہتی ہے۔"

زبیدہ نے کہا "ابا جان! میرے خیال میں دہشت پسندوں کی سرگرمیوں میں اضافہ اس وجہ سے بھی ضرور ہوگا کہ ڈیگال آزاد الجزائر کے ساتھ مذاکرات کر رہا ہے۔"

جمیل صاحب بولے "اور کیا ۔۔۔ آزاد الجزائر کا نام سنتے ہی دہشت پسندوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی خفیہ طاقت کے بل بوتے اور زعم پر یقین رکھتے ہیں کہ آزاد الجزائر کی آرزوؤں کو کسی صورت شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا جائے گا۔ آج کل فرانسیسی پولیس دہشت پسندوں کی کھلم کھلا مدد کر رہی ہے۔ شہر کے بیشتر حصوں پر خفیہ فوجی تنظیم کا قبضہ ہے۔ وہ علاقے جہاں مسلم اکثریت ہے۔ وہاں محاذ آزادی کے رضاکار غالب ہیں اور ان کی فرانسیسی دہشت پسندوں سے ہر روز جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ روزانہ قریب قریب بارہ آدمی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ جب ان علاقوں میں فرانسیسی دہشت پسندوں کا پلڑا نیچا ہونے لگتا ہے تو فرانسیسی پولیس مداخلت کر کے اونچا کر دیتی ہے۔ اس طرح دونوں پارٹیوں سے کچھ کچھ افراد گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ مسلمانوں کو تو جیل میں بھیج دیا جاتا ہے لیکن دہشت پسندوں کو پر اسرار طور پر آزاد کر دیا جاتا ہے۔"

عائشہ نے کہا "چچا جان! پھر یہ بھی تو بتا دیئے تا کہ الجزائر کا مسئلہ اب امن سے حاصل ہو سکے گا۔"

جلیل صاحب نے کہا: "یہ سوال ایسا ہے کہ اس کا جواب میرے خیال میں صدر ڈیگال کے پاس بھی نہیں۔ الجزائر کی ہفت سالہ جنگِ آزادی کو موت کی نیند سلانے کے لیے الجزائری رہنماؤں اور فرانسیسی حکام کے درمیان جو مذاکرات ہو رہے ہیں ان کے جو بھی نتائج نکلیں، یہ خوف ہر وقت قائم ہے کہ سرزمینِ الجزائر ابھی تک لالہ زار بنی رہے گی ۔ دہشت پسندوں نے الجزائر کے پُرامن حل کو ایک خواب بنا دیا ہے۔"

کرامت اور عائشہ کی زبان سے اتفاقاً ایک ہی وقت یہ الفاظ نکلے "چچا جان!"

دونوں "چچا جان" کے تخاطب کے بعد کوئی سوال کرنا چاہتے تھے لیکن الفاظ کے تکرار نے سنجیدہ چہروں کو یک لخت قہقہوں کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا۔

اگر یہ تکرار دوسرے افراد کا بھی ہوتا تب بھی قہقہے گونج سکتے تھے لیکن کرامت اور عائشہ کے تکرار نے قہقہوں کو کوشش کے باوجود بند نہ ہونے دیا۔ ان قہقہوں میں دونوں کی شرم و حیا بھی شامل تھی جسے وہ حتی المقدور ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اس کے بعد جو بھی اور جس کی زبان سے بھی کوئی موضوع چھڑا آپ ہی آپ بلا وجہ قہقہے بلند ہو گیے۔ ان قہقہوں سے چھٹکارا اسی وقت ممکن ہوا جب کرامت بہانہ بنا کر کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا گیا۔

الجزائر کی جنگِ آزادی میں مجاہدین کی سرگرمیاں صرف الجزائر کے شہروں تک محدود نہ رہیں انھوں نے پیرس کی شاہراہوں اور چوکوں پر بھی زبردست مظاہرے شروع کردیئے اور ان مظاہروں کی گرمجوشی کو حکومت کی گرفتاریاں ختم نہ کرسکیں بلکہ اس کے ردِعمل کے طور پر ریستورانوں میں بم پھینکنے کے متعدد واقعات رونما ہونے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پیرس نہیں بلکہ الجزائر کا اہم شہر ہے جس میں الجزائری مجاہدین کھلم کھلا کارروائی کررہے ہیں۔

حکومت فرانس کے ساتھ حکومت الجزائر کے مذاکرات میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا توں توں فرانسیسی دہشت پسند اپنی دہشت پسندانہ کارروائیوں میں تیز تر ہوتے گئے۔

انسانی جسموں میں جب تک خدا نے جان محفوظ رکھی ہے تب تک حرکات وسکنات کے تقاضے نہیں ٹل سکتے یہی وجہ ہے کہ یورپی دہشت پسندوں کے قیامت خیز حملوں کے باوجود زندگی اپنا

ثبوت دینے کے لیے گنجائش نکال ہی لیتی رہی۔ آزاد الجزائر کے رہنماؤں کے مذاکرات نے یورپی دہشت پسندوں کو نعل در آتش کر دیا جس سے ان کے اقدامات میں جنون کی کارفرمائی نظر آنے لگی۔ اس جنون نے اب اپنے ہی بھائی بندوں یعنی ان یورپی آباد کاروں کا قتل عام شروع کر دیا جنھیں دہشت پسندوں کی کارروائیوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ یورپی آباد کار اس وجہ سے بھی دہشت پسندوں کے خلاف ہو گئے کہ ان کی کارروائیوں کا ردِ عمل مجاہدین کی جوابی کارروائیوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ اب انھوں نے تنگ آ کر الجزائر کو خیرباد کہنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے بہت سے الجزائری دہشت پسندوں کی کارروائیوں سے بچنے کے لیے تیونس اور مراکش کو ہجرت کر گئے تھے مگر اب یورپی آباد کاروں نے بھی اپنے ملک فرانس کی طرف ہجرت شروع کر دی۔

اب سارے ملک میں یہ حال ہو گیا کہ عزیزوں دوستوں کی پانچ پانچ — دس دس منٹ کی علیحدگی اس بات کی ضمانت نہ دے سکتی تھی کہ وہ پھر بھی آپس میں زندہ مل سکیں گے۔

عوران کے ایک خطے میں بارہ آدمی اگر ایک دوست کے ہاں مہمان ہوئے اور دن چڑھنے پر سب کے سب الگ الگ مقامات پر اپنے اپنے پروگرام کے تحت تھوڑے سے وقت کے لئے چلے گئے لیکن شام کے وقت صرف دو آدمی واپس آسکے۔

اسی طرح الجزائر کے ایک ایک شہری کی زندگی لمحہ بہ لمحہ مخدوش سے مخدوش تر ہوتی چلی گئی۔ الجزیرہ قسطنطین اور بون کی آبادیاں بربادیوں میں تبدیل ہوتی چلی گیئں۔

دوسرے شہروں کی طرح شہر الجزیرہ کے حالات معمول پر آنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ چونکہ ہاتھ پاؤں رکھنے والے متنفس مخدوش حالات برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے وہ خطرات کو برداشت کرنے میں پیچھے نہیں رہتے تھے۔

زلزلہ آنے سے پہلے آبادی کے حصے کام کاج، کاروبار، تفریح اور عیش و عشرت میں پورا انہماک دکھا کر زندگی کی طمانیت حاصل کرتے ہیں اور زلزلہ کے بعد ہر متنفس کا چہرہ ماتم زدہ ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت الجزائر کے مختلف حصوں میں پیدا ہوتی رہی۔ زلزلہ ایک دو یا تین بار آئے تو انسان خوف کی سخت

کربناک تکلیف سے دوچار رہتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر زلزلے روزانہ آنے لگیں تو خوف کا اثر کم تر ہونا شروع ہو جاتا ہے دوسرے شہروں کی طرح الجزیرہ کا کوئی حصہ اپنی سلامتی کی کسی وقت ضمانت دینے کو تیار نہ تھا لیکن مصائب کا شکار انسان جب شہر میں آبادی کی رونق دیکھتا ہے تو یہ بھول جاتا ہے کہ اس رونق کو پلاسٹک کے دو تین بم بے رونقی میں تبدیل کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ انسان مصائب کا عادی ہو جانے کی وجہ سے اپنی زندگی کے معمولات کو جاری رکھنے پر مجبور تھا اس لیے وہ زلزلے سے پہلے اور زلزلے کے بعد بازاروں، چوکوں اور گلی کوچوں کی چہل پہل کا باعث بنتا رہا۔

اکتوبر کا مہینہ آیا تو زندگی اور موت کا کھیل آنکھ مچولی کا کھیل بن گیا۔ بم پھٹنے میں دیر لگی تو رونق پیدا ہو گئی۔ بم پھٹے تو رونق ختم ہو گئی —— اور پھر جب گذرگاہوں پر ٹریفک شروع ہو گئی تو زبیدہ اور عقیل کے گھر والوں نے بھی آنکھ مچولی کے کھیل میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک دن ان کے جی میں کیا آئی کہ وہ سیر کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ آج انھوں نے یہ پروگرام بنایا کہ تفریح اور سیر کے ساتھ کچھ شاپنگ بھی کریں گے اور کھانا گھر آکر کھانے کی بجائے باہر کسی ہوٹل ہی میں کھائیں گے۔ وہ ٹیکسیوں میں سوار ہو کر جگہ جگہ گھومتے رہے اور پھر تھوڑی سی شاپنگ کے بعد اتنے تھک گئے کہ انھوں نے ہوٹل کی راہ لی۔ ایک ہوٹل میں پہنچ کر کھانا منگایا اور پھر اسے ایسی اشتہا سے کھایا جیسے دو دن کے بھوکے ہوں۔

کھانا کھا لینے کے بعد چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی اور ہر ایک نے اپنا اپنا کپ لبوں سے لگا لیا۔ اس وقت ایک دوسرے کو چاہنے والی جوانیوں کی نگاہیں خفیہ اشاروں کے ذریعے دلآویز شرارت پر تلی ہی رہی تھیں کہ ایک نئی کیفیت نے باآواز خاموش انھیں یہ کہہ کر متنبہ کر دیا کہ ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب

ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

انھوں نے دیکھا کہ ایک مجاہد نے کسی شخص کو گریبان سے پکڑ کر ہوٹل کی چار دیواری میں کھینچا۔

زبیدہ کی نظر اس سے پہلے ہوٹل کے بیرونی دروازے سے باہر سڑک پر پڑی جہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس کا ڈرائیور ہوٹل کے اندر آکر پوچھنے لگا "کیوں سرکار اب چلا جاؤں؟" اور مجاہد نے جواب دیا۔

"ہاں چلے جاؤ۔"

زبیدہ اور دوسروں نے دیکھا کہ مجاہد نے دوسرے شخص کو کرسی پر گرانے کے بعد ایک آدمی کے پینے کھانے کا آرڈر دیا۔" زبیدہ اور دوسرے حیران تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

دوسرا شخص کرسی پر ٹکنے کا نام نہیں لیتا تھا مگر مجاہد نے اسے گھونسے مار مار کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہوٹل کا منیجر اور دوسرے چند لوگ اس کے نزدیک آ گئے۔ عقیل اور کرامت بھی چائے چھوڑ کر ادھر چلے آئے۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب! کیا میں دریافت کر سکتا ہوں؟" یہ سوال عقیل کا تھا۔

مجاہد نے کہا۔" یہ ایک نہایت سمجھ دار آدمی تھا مگر اب اپنا دماغ خراب کر بیٹھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا دماغ درست کر دوں۔"

دوسرے شخص نے عقیل کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہوئے مخاطب کرنا چاہا۔" دیکھیے صاحب معاملہ یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر مجاہد نے اس کا منہ بند کر دیا۔

"آخر معاملہ کیا ہے؟" یہ الفاظ ہوٹل کے منیجر، عقیل، کرامت اور دوسرے چند لوگوں نے کہے۔

"یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔" مجاہد پھر بولا۔" اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔"

دوسرے شخص نے رقت انگیز لہجہ میں کہا۔" کیا اس بات سے دماغ ماؤف نہ ہو گا کہ میں اپنی بیوی اپنے چار بچوں اور اپنے بھتیجے کو لے کر عوران سے الجزیرہ میں پہنچوں اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سب قتل کر ڈالے جائیں؟"

"کیا تم نے قتل کیا ہے؟" عقیل نے مجاہد کی طرف مخاطب ہو کر سنجیدگی سے پوچھا۔

مگر بجائے مجاہد کے دوسرے شخص نے جواب دیا۔" یہ کاہے کو قتل کرتا۔ یہ تو میرا بھائی ہے ۔ مسلمان ہے تو بھائی ہی ٹھہرا ـــــ اس نے میرے ساتھیوں کو قتل نہیں کیا۔ مگر اس نے ایک بہت بڑا

ظلم کیا ہے۔

یہ فقرہ کہ "بہت بڑا ظلم کیا ہے" اس شخص کی زبان سے بہت بلند اور غصیلی آواز میں نکلا۔ اس کی آواز سے سننے والے سہم سے گئے ——— "یہ مجھے مرنے نہیں دیتا۔ میں اکیلا جی کر کیا کروں گا۔"

اس فقرے کے پورا ہونے کے بعد وہ بیہوش ہو گیا۔ عین اس موقع پر بیرا کھانے کا ٹرے بھی لے آیا لیکن مجاہد نے کھانا واپس لے جانے کا اشارہ کر دیا۔ بیہوش آدمی کو جلدی سے بستر پر لٹا دیا گیا۔ ہوٹل کے مینجر نے فوراً ایک ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا جو دس منٹ میں دواؤں کا بیگ لیے ہوئے آگیا۔ اس نے بیہوش آدمی کی نبض دیکھی اور پھر ٹیکا لگایا۔ پانچ منٹ کے بعد بیہوش آدمی نے آنکھیں کھولیں اور پھر بلند آواز سے کہا۔ "مجھے مرنے دو" یہ کہنے کے بعد وہ پھر بیہوش ہو گیا۔

ڈاکٹر کافی دیر تک بیٹھا رہا، اس نے سوچ سوچ کر ایک دوسرا ٹیکہ لگایا اور پھر اس کا اثر ہونے سے پہلے پہلے مجاہد سے اس کے حالات دریافت کیے۔ مجاہد نے کہا۔

"کیا پوچھتے ہیں ڈاکٹر صاحب، یہ شخص میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ میں اس کے نام تک سے واقف نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ مسلمان ہے۔ میں مجاہدین کی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمیں اپنے ذرائع سے پتہ چلا کہ مارکیٹ کے نزدیک سالان اور جوہاڈ کے چیلے چانٹے معصوم انسانوں کو لقمۂ اجل بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ اطلاع ملتے ہی ہم بھی اسلحہ سے لیس ہو کر موقع پر پہنچ گئے۔ لیکن ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی شر پسند عناصر اپنا کام کر چکے تھے۔ مارکیٹ کے پاس انھوں نے نہایت چابک دستی کے ساتھ بے شمار ٹائم بم رکھے اور خود وہاں سے چلتے بنے۔ ان کے جاتے ہی بم چل پڑے جس کے نتیجے میں سینکڑوں راہگیر دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ حضرت اتفاق سے ایک دیوار کی اوٹ میں آگئے تھے اس لیے بچ رہے۔ چونکہ مارکیٹ میں اب مجاہدین اور دہشت پسندوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس لیے اس کے لواحقین کی لاشیں نہیں لائی جا سکیں۔ یہ شخص اپنے لواحقین کے قتل کے بعد دہشت پسندوں کی طرف یوں لپکارتا ہوا جا رہا تھا کہ اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا "مجھے بھی قتل کر ڈالو" میں اس وقت اس کی جان بچانے کے لئے اسے بازو سے پکڑ کر ادھر لے آیا گر

اس شخص کے جسم میں اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے اسقدر طاقت بھر گئی کہ اگر میں اسے خفا ہونے کے بعد گھونسے مار کے نہ لاتا تو یہ کبھی نہ آتا۔ یہ شخص مرنا چاہتا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ بچی ہوئی جان ضائع ہو جائے، اسی لیے میں اسے یہاں لے آیا ہوں حالانکہ میری وہاں بہت ضرورت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس فقرے کے مکمل ہونے کے فوراً بعد بیہوش آدمی نے ایک فلک شگاف چیخ ماری جس سے ڈاکٹر اور دوسرے لوگ بھاگے ہوئے اس کے بستر کے پاس آگئے۔ پاس آئے تو دیکھا کہ اجنبی پھر بیہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر نے نبض ہاتھ میں لی اور پھر مجاہد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔" دوست! تم اسے مر ہی جانے دیتے تو اچھا تھا۔ اپنے عزیزوں کے پاس تو ہوتا"

مجاہد نے حیران سا ہو کر پوچھا۔" ڈاکٹر صاحب ایسا کیوں؟"

ڈاکٹر نے اس کا بے حس بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔" اس لیے کہ اس بچارے نے اپنے عزیزوں سے کئی میل دور جان دے دی ہے۔"

مجاہد اور دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں اسطرح آنسو آئے۔ جیسے یہ ان کا اپنا عزیز تھا۔ مجاہد نے بہت دیر بعد آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔"بہت برا ہوا"

عقیل نے کہا۔" برا نہیں دوست! بلکہ اچھا ہوا یہ بچارا جی کر کیا کر لیتا؟"

اس وقت اجنبی کے پاس انسانوں کا گروہ جمع تھا جس میں زبیدہ اس کی والدہ اور عزیزہ بھی کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔

زبیدہ نے رقت انگیز آواز میں عقیل کی بات کاٹی۔" میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتی کہ اچھا ہوا ـــــــ اجنبی کو زندہ رہنا چاہیئے تھا تاکہ وہ اپنی زندگی کے آخری دموں کو بھی الجزائر کی آزادی کے راستے میں قربان کر سکتا ـــــــ الجزائر کا ہر نفس مصائب کا تحمل اور استقلال سے مقابلہ کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس کی زندگی خواہ کتنی ہی تکلیفوں سے معمور ہو، گریز اور فرار کی ضد ہے۔ اس وقت الجزائری مسلمانوں کا کوئی لمحہ بھی حصولِ آزادی کے سوا کسی دوسرے

مقصد کے لیے استعمال نہ ہونا چاہیئے۔"

زبیدہ کی زبان سے یہ الفاظ اتفاقی طور پر نکل گئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔"لڑکی تمہارا نام کیا ہے؟"

زبیدہ نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔" نام تو جناب میرا بہت اچھا ہے مگر کام اچھا نہیں۔ میرے عمل کا خانہ بالکل خالی ہے ورنہ مجھے یہ چاہیئے کہ اس اجنبی بھائی اور اس کے عزیزوں کے قتل کا بدلہ لینے اسی وقت مارکیٹ کی طرف روانہ ہو جاؤں —— اور کیا معلوم اس وقت میری امی میرے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالیں؟"

زبیدہ کے اس فقرے نے اس کی والدہ کو پریشانی میں ڈال دیا۔ اس نے اس وقت اس کے والد کی بڑی کمی محسوس کی۔ وہ خود اور عقیل وغیرہ تو خاموش رہے مگر ڈاکٹر نے کہا۔

"بیٹی! اگرچہ تم نے اپنا نام نہیں بتایا مگر تم بالکل جمیلاؤں کی ہم خیال اور ہم عمل معلوم ہوتی ہو۔ تم نے نام نہیں بتایا تو خیر نہ سہی مگر میں نے تمہارا نام جمیلہ رکھ دیا ہے۔"

زبیدہ نے سرنگوں ہو کر کہا۔" ڈاکٹر صاحب میں اس قابل کہاں؟" یہ کہتے ہی اس کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو گرنے لگے جنہوں نے اس کی والدہ اور دوسرے ساتھیوں کو بھی نم آلود کر دیا۔

ڈاکٹر نے زبیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" بیٹی تمہارا خیال اور ارادہ تمہارے دلی عزائم کا پتہ دیتا ہے مگر میرے خیال میں تمہیں جوش میں آ کر کسی تنظیم میں شامل ہوئے بغیر تنہا دہشت پسندوں کی آگ میں نہ کودنا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح کی قربانی کو اسلام واجب نہیں سمجھتا، یہ تو بغیر پروگرام کے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنا ہے۔ اور اس قسم کی جاں سپاری کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔"

زبیدہ جو اس وقت عمل درآمد کے لیے پابہ رکاب کھڑی تھی، بولی۔" تو پھر ڈاکٹر صاحب میں مجاہد کے ساتھ جا کر تنظیم میں شامل ہو جاتی ہوں؟"

"بہت نیک خیال ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔" لیکن بیٹی! یہ ایسا سخت قسم کا ہنگامی دور ہے جس

میں تمہیں ٹریننگ حاصل کرنے کا وقت نہ مل سکے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ گھر میں بیٹھ کر مجاہدین کی کامیابی کیلئے خضوع وخشوع سے دعائیں مانگو۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ اب حکومتِ فرانس الجزائر کو آزادی دینے پر تُل گئی ہے۔ ان دنوں دہشت پسندوں کے مقابلے میں (---- ڈاکٹر نے مجاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ----) ان مجاہدین کو جانے دو اور انھیں شہادت حاصل کرنے دو کیونکہ ان کی شہادت سے پہلے ایسے نوجوانوں کی لازوال بہادریاں دہشت پسندوں کو اپنے اٹل عزائم کا آئینہ دکھا چکی ہوں گی۔"

زبیدہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا نام زبیدہ ہے۔"

اس کے بعد اس نے دوسروں سے تعارف کرایا۔ "یہ میری والدہ محترمہ ہیں۔ یہ عائشہ جو حال ہی میں مسلمان ہوئی ہیں یہ میری بہن عزیزہ اور یہ میرے دو بھائی عقیل اور کرامت ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "بھئی تم لوگوں سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اس ملاقات کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ میری عمر اس وقت ۸۵ سال کے لگ بھگ ہے مگر تمہارے زندہ رہنے والے خیالات سن کر ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں جوان ہو گیا ہوں ---- اچھا تمہارے والد بقیدِ حیات ہیں نا؟"

زبیدہ نے کہا۔ "خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں۔"

"کیا کام کرتے ہیں۔"

"تجارت پیشہ ہیں۔"

"خوب میں ان سے ملنا چاہتا ہوں ----" ڈاکٹر نے ایک کاغذ نکال کر اسے دیا۔

"اس پر اپنے گھر کا پتہ نوٹ کر دو۔"

عقیل نے جیب سے پن نکال کر پتہ نوٹ کر دیا۔

مجاہد نے کہا۔ "زبیدہ صاحبہ! آپ سے اور آپ کے عزیزوں سے مل کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ سے مل کر خاص طور پر اس لیے خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے بالکل جمیلہ بوپاشا

معلوم ہوتی ہیں۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو امن ہو جانے اور دہشت پسندوں کے حملوں سے بچ جانے کی صورت میں بشرطِ زندگانی آپ لوگوں سے ملاقات کرنے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ آجاؤں۔"

زبیدہ نے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ہمیں خوشی ہوگی۔ آپ تو کافی عرصہ سے اپنی جماعت میں کام کر رہے ہوں گے ـــــ آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام حمید الدین ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "میں جمیلہ بوحائرڈ کی شمولیت سے پانچ روز پہلے شامل ہوا تھا۔"

زبیدہ نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو آپ کو الجزائر کے گوشے گوشے کی خبر ہوگی۔ آپ خدا کے لیے ضرور آئیے گا۔ ہم سب آپ کے بے حد ممنون ہوں گے۔"

زبیدہ اور دیگر افراد نے ان سے اجازت چاہی اور اجلبنی کی لاش پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد سرد آہیں بھرتے ہوئے ہوٹل سے نکل گئے اور مجاہد اجلبنی کے کفن دفن کے انتظام میں مصروف ہو گیا۔

۳۵

اکتوبر کے بعد نومبر اور دسمبر کا مہینہ گویا قیامت کو اپنے ساتھ لے آیا - آزاد الجزائر کے رہنماؤں کی حکومتِ فرانس سے کامیاب مذاکرات نے دہشت پسندوں کو درندوں میں تبدیل کر دیا - وہ گویا توپوں، مشین گنوں اور بموں میں تبدیل ہو گئے - ان دو مہینوں میں الجزائر کا گوشہ گوشہ بموں، توپوں اور مشین گنوں کی جاں گُسل آوازوں سے بھر گیا - ہر طرف دھواں اٹھتا نظر آنے لگا - ہر جانب مشین گنیں کھڑی دکھائی دینے لگیں - ہر سمت انسانوں کی بے حس لاشیں اور ان کو کھانے والے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ دکھائی دینے لگے - اس میں شک نہیں کہ دہشت پسندوں کا یہ دھاوا بظاہر مجاہدین کے بیدار عزائم کو موت کی نیند سلا دینے کے لیے کافی سے زیادہ معلوم ہو رہا تھا لیکن اس قیامت خیز حملوں کے وقفوں میں بھی مجاہدین یہی پکارتے سنائی دیتے تھے - "ایک کروڑ غلاموں سے دس کروڑ لاشیں بہتر ہیں"

سالان اور جوہاڈ کے خفیہ ہاتھ اس طرف الجزائریوں کے عزائم سلانے کی کارگزاری دکھاتے رہے اور اس طرف جنرل ڈیگال حالات کے صحیح حقائق سے مجبور ہو کر یہ اعلان کرتا رہا کہ الجزائریوں کو الجزائر کی آزادی دے دی جائے گی۔

آخر جب جنوری ۱۹۶۲ء کا سورج طلوع ہوا تو وہ اپنے ساتھ جنرل ڈیگال کا ایک اہم پیغام لایا۔ پیغام یہ تھا۔ "الجزائری باشندوں نے اپنی عظیم قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انھیں الجزائر کی آزادی بہت عزیز ہے۔ میری حکومت بھی الجزائریوں کو ان کی قربانی کا صحیح صلہ دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میں الجزائر کا پر امن حل تلاش کر چکا ہوں۔"

چنانچہ اس اعلان کے بعد آزاد الجزائر اور فرانس کے درمیان خفیہ بات چیت جاری رہی۔ جس میں نظر بند رہنما محمد بن بالّلہ اور دوسرے نظر بند رہنما بھی شامل تھے اور فروری کے وسط میں یہ گفتگو کامیاب ہو گئی۔

۷ مارچ کو ایویان میں آزاد الجزائر اور حکومت فرانس کے درمیان ایک کانفرنس کی ابتدا ہوئی۔ اس کانفرنس میں دوسرے رہنماؤں کے علاوہ عبدالرحمٰن فارس نے بھی حصہ لیا۔ اس کانفرنس کی کچھ نشستوں کے بعد فریقین کی طرف سے ۱۸ مارچ کو جنگ بندی کا واضح اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان میں یہ بھی بتایا گیا کہ مندرجہ ذیل امور پر سمجھوتہ ہوا ہے۔

۱:۔ آزاد الجزائر اور حکومت فرانس دونوں الجزائر کا حق خود ارادیت تسلیم کرتے ہیں اور استصواب رائے کو الجزائر کے مسئلہ کا واحد قابل عمل حل تصوّر کرتے ہیں۔

۲:۔ الجزائر کی آزادی کے بعد فرانس مارس الکبیر کی بندرگاہ سے بھی اپنی فوجیں ہٹائے گا۔ لیکن ایک معاہدے کے تحت بیس یا تیس سال تک اس بندرگاہ کو استعمال کر سکے گا۔

۳:۔ الجزائر کے یورپی نوآبادکار پانچ سال تک الجزائر کے شہری تصوّر کیے جائیں گے۔ اس کے بعد انھیں حق حاصل ہوگا کہ وہ فرانسیسی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ جو فرانسیسی نوآبادکار ابتدا ہی میں فرانسیسی شہریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے

ان کے حقوق اور ملکیتوں کی ذمہ داری حکومت کو قبول کرنی ہوگی ۔ ... ان باشندوں کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی ۔

۴۔ قومی محاذِ آزادی ان مسلمانوں سے جو فرانسیسی دورِ حکومت میں سرکاری عہدہ داروں پر فائز تھے ، سابقہ مراعات نہیں چھینے گا ۔

۵۔ قومی محاذِ آزادی کسی فرانسیسی نوآبادکار کے خلاف انتقامی کارروائی نہ کرے گا اور فرانسیسیوں کے سابقہ جرائم کو نظر انداز کر دے گا ۔

۶۔ فرانس صحرائے اعظم کو الجزائر کی ملکیت تصوّر کرے گا لیکن اس شرط پر کہ الجزائر صحرائے اعظم میں فرانسیسی مفادات کے تحفظ کی ضمانت دے ۔

۷۔ جنگ بندی کے معاہدے پر فوراً عمل کیا جائے گا اور ایک عبوری حکومت قائم کی جائے گی جس کا مقصد الجزائر میں استصواب رائے کرانا ہوگا ۔ یہ حکومت تھوڑے ہی عرصہ بعد مستعفی ہو جائے گی اور اس کے بعد قومی محاذِ آزادی کے کارکن اپنی آزاد حکومت بنائیں گے

۸۔ جنگ بندی کے سمجھوتے پر دستخط کے بعد نظر بند رہنماؤں کو آزاد کر دیا جائے گا ۔

۹۔ جنگ بندی کے معاہدے پر مؤثر عمل کرانے کے لیے ایک ایسی فوج تیار کی جائے گی جس میں ۸۰ فیصد مسلمان اور ۲۰ فیصد فرانسیسی ہوں گے ۔

خود صدر ڈیگال نے ٹیلی ویژن پر پورے سات منٹ کی تقریر کرتے ہوئے کہا ” آزاد الجزائر اور حکومت فرانس کا آج سمجھوتہ ہونے کے بعد جنگ بندی ہو گئی ہے اور اب الجزائر کو الجزائریوں کے حوالے کرنے کے انتظامات کیے جائیں گے ۔ “

اس اعلان کے ساتھ ہی انھوں نے جنرل سالان اور ان کے ساتھیوں کو متنبہ کیا کہ اپنی مذموم کارروائیاں ترک کر دیں ورنہ ان کا انجام ان کے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوگا ۔ آپ نے الجزائر کی نئی عبوری حکومت کے ساتھ جس کے صدر عبدالرحمٰن فارس ہوں گے ۔ یورپی آبادکاروں کو پوری وفاداری سے رہنے کی تلقین کی ۔

صدر ڈیگال نے الجزائری رہنماؤں سے بھی مخاطب ہو کر کہا۔ "ہم آپس میں جنگ کے لیے نہیں بلکہ باہمی تعاون کے جذبہ سے تہذیب کے راستے پر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ قدم بڑھانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔"

صدر ڈیگال کا دہشت پسندوں کو اپنی کارروائیاں ختم کرنے کے لیے متنبہ کرنے کی دیر تھی کہ انھوں نے الجزائر میں یورپی آباد کاروں کی ایک متوازن خفیہ حکومت بنا لینے کے بعد قتل و غارت کا پھر بازار گرم کر دیا اور یہ سلسلہ روز بروز تیز تر ہوتا چلا گیا۔

صدر ڈیگال کے کندھوں پر دو طرح کی ذمہ داریاں آ پڑیں۔ ایک نظر بند الجزائری رہنماؤں کا بحفاظت الجزائر میں پہنچانا اور دوسرے سالان اور جوہاڈ کی گرفتاری۔ انھوں نے سب سے پہلے مارچ کے وسط میں نظر بند الجزائری رہنماؤں کی رہائی کا انتظام کیا۔ فرانسیسی حکام کی خواہش کے مطابق بن باللہ اور ان کے ساتھی رہنماؤں کو مراکش بھجوانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ لیکن حریت پسندوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ یورپی دہشت پسند انھیں گرفتار کر لیں گے۔ کیونکہ انھیں اپنے مخبروں کے ذریعے یہ علم ہو چکا تھا کہ ان کے پاس سات جیٹ طیارے ہیں۔ اس خطرے کے پیش نظر الجزائری رہنما بن باللہ کو پہلے فرانس سے سوئٹزرلینڈ لے جایا گیا اور انھیں وہاں مراکش کے وزیر برائے امور افریقہ ڈاکٹر عبدالکریم خطیب کے حوالے کر دیا گیا۔ پھر مراکش کے شاہ حسین دوم کی درخواست پر صدر امریکہ مسٹر کینیڈی کی اجازت سے امریکی حکام نے ۷۰۷ نمبر کا تیز رفتار طیارہ تیار کیا جس میں بن باللہ کو آدھی رات کے وقت سوار کیا گیا اور وہ تیز رفتاری سے اڑتا ہوا فرانس کے علاقے سے دور دور رہتا ہوا آخر مراکش کے ہوائی اڈے پر اترا۔ یہاں الجزائر کی عبوری حکومت کے وزیر اعظم یوسف بن خدہ اور دوسرے کئی مراکشی حکام استقبال کے لیے موجود تھے۔

بن باللہ کے زمین پر اترتے ہی بن خدہ اور دوسرے حکام نے شوق اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

یورپی دہشت پسندوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ صدر ڈیگال خاص اہتمامات کے تحت الجزائری

رہنماؤں کو مراکش میں پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہے تو انھوں نے صدر ڈیگال کو قتل کر دینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ جنرل سالان اور جنرل جوہاڈ باوجود روپوشی کے صدر ڈیگال کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر حکومتِ فرانس بھی ان کے مکروہ عزائم سے بے بہرہ نہ تھی اس نے بھی اپنی وفادار فوج کا ایک حصہ دونوں جرنیلوں کی تلاش میں لگا رکھا تھا۔

الجزائر کے ہر گھر کی طرح زبیدہ اور عقیل کے گھروں میں بھی خوشی کا دور دورہ تھا۔ ویسے تو ہر کسی کے دل میں خوشی سمانہ سکتی تھی لیکن اپنے اپنے گھر میں زبیدہ اور عقیل کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا زبیدہ چاہتی تھی کہ عقیل کو خوشخبری دے اور عقیل چاہتا تھا کہ زبیدہ کو نویدِ مسرت سنائے۔ عائشہ اگرچہ نومسلم تھی لیکن اپنے سابقہ اسلامی مطالعہ کی وجہ سے اس کے دل و دماغ میں بھی سچی خوشی سمائی ہوئی تھی۔ اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ اپنی اس خوشی کا اظہار بزرگوں کے سامنے کرنے کے بعد کرامت کے سامنے بھی کرے جس کے پاس اس کا کنگن محفوظ ہے مگر یہ دن ایسے تھے کہ ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے زیادہ آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ یورپی دہشت پسند دستے اب جا بجا بم رکھ کر اپنے اس غم و غصہ کو کم کرنا چاہتے تھے جس کی شدت عبوری حکومت کے قیام نے ان کے دلوں میں پیدا کر رکھی تھی۔

آزاد الجزائر کی حکومت پہلے جلاوطن تھی مگر اب اس نے اپنے وطن میں سبز و سفید جھنڈا لہرا رکھا تھا۔

تینوں جمیلائیں —— جمیلہ بوحائرڈ، جمیلہ بوئنزہ اور جمیلہ بوپاشا۔ ابھی تک جیل کی سختیاں جھیل رہی تھیں۔ لیکن جب تینوں تک عبوری حکومت کے قیام کی خوشخبری پہنچی تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھیں جیل کی سختیاں اب الطاف و اکرام معلوم ہونے لگیں اور پھر جب تینوں جمیلائیں دوسری متعدد خواتین کے ساتھ ۱۲ر اپریل کو ایویان کے معاہدے کے مطابق رہا ہوئیں تو الجزائر کے رہنماؤں نے ان کا فقید المثال استقبال کیا۔ مردوں کے جم غفیر کے علاوہ بہت سی خواتین نے خوشی کا یہ ترانہ گایا۔

سنو صدا مادرِ وطن کی — سنو وہ ہم کو پکارتی ہے
فضائے جنگ و جدل کی جانب — سنو وہ ہم کو ابھارتی ہے

تم اس صدا پر جھکا دو سر کو — اسے شہیدوں کے خوں سے لکھ دو
کہ اِک امانت ہے یہ صدا بھی — اسے خوشی سے قبول کر لو

یہ داستان آنے والی نسلیں — کہا کریں گی، سنا کریں گی
وطن کی خاطر لہو بہا کر — فرائض اپنے ادا کریں گی

ہم الجزائر پہ جان و دل کو — بڑی خوشی سے فدا کریں گے
اور اس کی عظمت کی منزلت کو — بلند ہر دم کیا کریں گے

یہ عہد ہم نے کیا ہوا ہے — وطن کے دیوار و در سے کہنا
کریں گے آزاد ہم وطن کو — گواہ رہنا گواہ رہنا[1]

جمیلاؤں اور دوسرے حریت پسندوں کی رہائی کے موقع پر اخبارات کے نمائندے بھی پہنچے ہوئے تھے۔ فوٹو گرافر بھی موجود تھے۔ جو اس حسین و جمیل منظر کی مختلف زاویوں سے فوٹو کھینچ رہے تھے۔ نمائندوں میں سے ایک کو بمشکل تمام موقع ملا اور اس نے جمیلہ بوحائرڈ سے سوال کیا۔

"آج آپ کے ذہن پر قدیم اذیتوں کا کیا اثر ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تو صرف یہی اثر ہے کہ میرا دل خوشی سے معمور

---

[1] یہ نظم شرقی بن شتاق کی لکھی ہوئی ہے جو الجزائری ترانے کا ترجمہ ہے۔

ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے الجزائری حریت پسند بھائی ثابت قدم رہے جس کی وجہ سے ہمارے عزیز وطن کی آزادی کامیابی کے دروازے پر کھڑی ہے۔"

زبیدہ جیسے حریت پسندی کی وجہ سے جمیلاؤں سے عشق ہو گیا تھا اس کے والدین حیران تھے کہ وہ ان کے استقبال کے لیے کیوں نہ گئی۔ ایک بار اس کے والد نے کہا بھی۔ "بیٹی! جمیلائیں رہا ہو رہی ہیں۔ کیا تم ان کے استقبال کے لیے نہ جاؤ گی؟"

اور اس نے جب کہ وہ سکول جانے والی تھی، اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔" اور پھر فوراً سکول کو چل دی۔

زبیدہ کی والدہ کو خیال آیا کہ کہیں وہ جانا چاہتی ہو اور اس خیال سے کہ شاید ہم موجودہ حالات میں منع کر دیں گے، رک نہ گئی ہو، پریشان سے ہو گیے، چنانچہ جب وہ سکول سے واپس آئی جہاں اسے جمیلاؤں کی رہائی کی اطلاع مل چکی تھی، تو اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نہ پائے گئے، خوشی کی جگہ اس کے چہرے پر غم کے آثار تھے۔ عائشہ سے ماں باپ نے شام کو اس کا سبب دریافت کر لیا تو وہ کچھ اور نکلا جس سے ان کی اپنی پشیمانی جاتی رہی۔

عائشہ نے بتایا۔ "آج سکول میں زبیدہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ پھر جب رخصت ہوئی تو میں نے راستے میں اس سے اس کا سبب دریافت کیا۔ وہ کہنے لگی۔ جمیلہ بوحائرڈ، جمیلہ بوئنز اور جمیلہ بوپاشا تو بہت بلند پایہ اور خوش قسمت ترین لڑکیاں ہیں ان کی بلندی کو تو میری نظریں بھی چھو نہیں سکتیں، اور میں تو اپنے آپ کو ان معمولی قیدی لڑکیوں کے بھی قابل بھی نہیں سمجھتی۔ جن کا کسی کو نام تک یاد نہ ہوگا۔ اور وہ قومی تحریک کے کسی نہ کسی کام کے الزام میں گرفتار ہو چکی ہوں گی ——— میں فقط اس لیے پریشان ہوں کہ میں اپنے دل میں قومی خدمت کے بڑے بڑے ولولے رکھنے کے باوجود کسی خدمت کے قابل نہ ہو سکی اور مجھے آج تھوڑا سا یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس میں میرے والدین کی متجاوز محبت کا بھی ضرور قصور ہے جو مختلف دلائل کے زور پر مجھے تحریک میں حصہ لینے سے روکتے رہے۔"

عائشہ نے کہا" زبیدہ نے مجھ سے یہ بھی کہا " میں تو اس کشمکش میں ساری رات جاگتی رہی ہوں کہ جمیلاؤں کے استقبال کو جاؤں یا نہ جاؤں اگر جاؤں تو کیونکر جاؤں اور کیا منہ لے کر جاؤں ــــ ... وہ منہ لے کر جاؤں جو کسی محبت کی مسلسل خدمت کے لیے بھی گرد آلود نہیں ہوا، کیا میں ان کے سامنے اپنی تن آسانی لے کر جاؤں؟ کیا میں یہ کہنے جاؤں کہ اے حریت پسند بہو بیو! تمہیں سو سو مبارک ہو۔ ہم تمہارے دکھ درد کی داستانیں آرام کرسیوں پر بیٹھ کر اخبارات میں پڑھتی رہی ہیں ــــ؟"

عائشہ نے کہا" زبیدہ اس کے بعد کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اس کی آنکھوں میں سیلاب آگیا، میں نے بھی اسے اس خیال سے تسلی نہ دی کہ میری تسلی کہیں اس کے جوش سیلاب کو روک نہ دے ــــ چونکہ وہ جی کھول کر رو چکی ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ شام تک بالکل ہشاش بشاش ہو جائے گی۔"

جلیل صاحب نے کہا" بیٹی! یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ ساری کہانی سنا دی ورنہ ہم سخت پریشان رہتے۔ تم نے کہا ہے کہ شام تک وہ بالکل ہشاش بشاش ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس کے خوش ہونے میں کوئی فرق رہ بھی گیا ہوگا تو میں نے اس کا ابھی علاج سوچ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج شام کے وقفہ چائے میں اس کی طبیعت کا بقیہ تکدر بھی دور ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے ہم ماں باپ کے دلوں میں جو تھوڑی بہت گھٹن پائی جاتی ہے وہ بھی انشاء اللہ جاتی رہے گی۔ تم آج شام سے پہلے پہلے چائے جلد تیار کرا لینا کیونکہ میں اپنا معمہ اس وقت حل کر کے گھر بھر کو بھرپور مسرت سے معمور کر دینا چاہتا ہوں۔"

سالان کے معروف ساتھی جنرل جوہاڈ کا خفیہ ہاتھ بھی روپوشی کے زمانے میں الجزائری مسلمانوں کے قتل و غارت میں بہت موثر رہا۔ حکومت نے اسے بھی بڑی تگ و دو کے بعد گرفتار کیا۔ وہ بھی پیرس کی جیل میں دن کاٹ ہی رہا تھا کہ وہاں سے کئی نظر بند بھاگ اٹھے۔ ان میں جنرل جوہاڈ بھی تھا۔ الجزائر کے مختلف شہروں میں مقیم خفیہ فوجی تنظیم کے ارکان اس خوشی خبری پر ناچنے لگے اور انھوں نے یہ نعرے لگانے شروع کر دیئے "جوہاڈ! زندہ باد ——— جوہاڈ زندہ بچ گیا ... ... الجزائر فرانس کا حصہ ہے۔"

خوشی کا یہ اظہار یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ خفیہ فوجی تنظیم کے ارکان نے اس خوشی میں شہر کے کتنے ہی مکانوں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا۔ یہ مظاہرہ ایک گھنٹے تک رہا اور اس ایک گھنٹے میں لاکھوں روپے کا نقصان محض جنرل جوہاڈ کے فرار کی خوشی میں برداشت کرنا پڑا۔ آتش زدگی میں

تین مسلمان شہید اور چار زخمی ہوئے ۔۔ ۔۔ کتنی کم تعداد ہے ۔

جس قوم کی دس لاکھ آبادی نے اپنی جانیں قربان کردی ہیں ان کے مقابلے میں تین یا سات شہادتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں ۔

قدرت نے دنیا کا نظام ہی کچھ ایسا بنایا ہے کہ انسان بڑی سے بڑی مصیبتوں کا شکار ہونے کے کچھ عرصہ بعد انھیں اس حد تک ضرور فراموش کر دیتا ہے ۔جس سے وہ دنیا کے روزگار میں اپنے آپ کو مصروف رکھ سکے ۔اس طرح کی مصروفیت اس کے زخموں پر بقدرِ ہمّت وطاقت پھاہا رکھتی رہتی ہے ۔۔ ۔۔ انسان طبعاً غافل ہونے کے باعث یہی سمجھتا رہتا ہے کہ بازاروں ،گلیوں اور پارکوں میں آنے جانے والے مسکراتے ہوئے چہرے دلوں میں آلام نہیں رکھتے ۔حالانکہ اکثریت ایسی ہے جو آلام کو بھولنے ہی کی غرض سے دنیا کے کاموں میں لگی رہتی اور پارکوں وغیرہ میں تفریح کرتی رہتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی متنفس کسی وقت خوش ہی نہیں رہتا ـــــ نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ عام طور پر انسان تکلیفوں کا شکار رہتا ہے اور اپنی تکلیفوں پر خودداری کا پردہ ڈالے رکھتا ہے ۔

الجزائر میں عام طور پر کوئی گھر ایسا نہیں جس کا کوئی نہ کوئی فرد دہشت پسندوں کا شکار نہ ہوا ہو مگر انھیں کے لواحقین کچھ روز رو دھو کر خاموش ہو جاتے ہیں ۔اور پھر باقی لوگوں کے لئے روزی کمانے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں ۔وہ اپنے کاروبار یا ملازمتوں میں مصروف کار رہ کر اپنے آلام کو بھلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ۔کئی ایسے ہیں کہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور بعض ایسے جو غم کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے "اجنبی" کی طرح ہوٹل میں جان دے دیتے ہیں ۔

دہشت پسندوں کی بندوقوں ،مشین گنوں نے تندرست اور بیمار ، نوجوان اور بوڑھے ، عورت اور بچے میں کبھی تمیز نہ کی ۔جو بھی ان کی زد میں آیا لقمۂ اجل بن گیا ۔بعض خوش قسمت ناتواں لوگ اپنی جانیں بچاتے بچاتے کہیں کے کہیں پہنچ گیے ۔غریبوں کا ایک مختصر سا قافلہ اپنی جانوں کی

حفاظت کے لیے چلتا چلتا جنوبی صحرا میں پہنچ گیا۔ کھانے پینے کا جو اثاثہ ہمراہ لے جایا جاسکتا تھا۔ یہ قافلہ اپنے ہمراہ لے گیا۔

چاروں طرف دُور تک پھیلے ہوئے ریگستان، جہاں کوسوں دُور تک آبادی کا نام نشان تک نہ تھا، انسان تو انسان، مویشیوں نے کبھی ایسے مقام کو اپنا مسکن بنانے کا خیال نہ کیا تھا جو روئیدگی سے قطعاً محروم ہے۔ جہاں ریت کے ذرات کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن چونکہ اس جگہ دہشت پسند اور ان کے مرغوب اسلحہ کا نام نشان نہیں، اس لیے جانوں کی حفاظت چاہنے والوں کے نزدیک یہ کام بہت اچھا ہے۔ رہی یہ بات کہ اپنا اثاثہ کفایت شعاری سے ختم کرنے کے بعد وہ پھر کیا کریں گے؟ تو اس کی انھیں ابھی فکر نہیں جتنے دن کٹ سکیں گے کاٹ دیں گے، باقی دن خوراک کی تلاش میں میلوں کا سفر اختیار کریں گے۔ پھر بھی اگر انھیں خوراک میسر نہ آئی تو فاقے کر کے یہ سمجھ کر جان دے دیں گے کہ دہشت پسندوں نے حملہ کر دیا ہے۔

ریگ زار میں آئے ہوئے مختصر سے قافلے کے لوگوں میں دو نوجوان بھی ہیں، انھوں نے دوسرے لوگوں کی طرح سارے مہینے کے روزے رکھے ہیں۔ روزے رکھنا ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس سے کھانے میں کفایت ہو گئی۔ آخری روزہ رکھنے کے بعد شام کے وقت دو نوجوان افق کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے پاس ایک عورت بھی آگئی۔ "نہ جانے کیا بات ہے۔ آج تو چاند ہو ہی جانا چاہیئے۔ شاید میری نظر کمزور ہو گئی۔"

چند بچے بھاگے بھاگے آئے "آہا کل عید ہو گی، آہا کل عید ہو گی، ہم بچائی ہوئی شیرینی کھائیں گے۔"

ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ٹیکتا دونوں نوجوانوں کے قریب آیا۔ کہنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ میری نظر تو بس ایک فرلانگ تک کام دے سکتی ہے مگر چاند کو دیکھنے کا شوق اتنا زیادہ ہے کہ جب تم لوگ کہہ دو گے کہ چاند ہو گیا ہے تو گویا سچ مچ مجھے بھی چاند نظر آجائے گا۔ یعنی تمہارے کہنے سے جو خوشی میرے دل میں پیدا ہو گی وہ ایسی

ہی ہوگی جیسا کہ میں نے چاند دیکھ لیا ۔ ۔ ۔ ذرا دیکھو بیٹا! غور سے —— تم تو نوجوان ہو تمہاری نظر بہت تیز ہوگی۔"

اتنے میں ایک نوجوان کی زبان سے نکلا، "وہ چاند" اور بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔" اس نے اسی وقت ہاتھ پھیلا دیے۔ ہاتھ پھیلا کر اس نے رقت انگیز انداز میں دعا کرنی شروع کر دی۔ جن کو چاند نظر نہیں آیا تھا۔ انھوں نے چاند کو دیکھنے کی بجائے —۔ بوڑھے کے آنسوؤں سے دھلے ہوئے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔ جیسے ان کے لیے عید کا چاند یہی ہے۔ بوڑھا آنسوؤں کی جھڑی لگاتا ہوا برابر دعا کیے جارہا تھا۔

"اے مالکِ حقیقی! اے مسجودِ حقیقی! میرا دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبان سے وہ طاقت چھن گئی ہے جو تیرے الطاف و اکرام کی داستان بیان کر سکے، جو تیرا شکریہ ادا کر سکے۔

اے مالکِ حقیقی! اے مسجودِ حقیقی! تو نے ہمارے دلوں میں صحرا کی طرف آنے کا خیال پیدا کر کے ہماری جانوں کی جو حفاظت کی ہے اس کے احسان سے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح عہدہ برا ہوا جائے۔

اے مالکِ حقیقی! ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ہمیں اتنا ایمان دار، اتنا جری اور اتنا صابر بنا کہ ہم اپنے ملک کی آزادی کے لیے بڑے سے بڑا جانی اور مالی نقصان اٹھا کر بھی یہ کہیں کہ ان اللہ مع الصٰبرین۔

اے مسجودِ حقیقی! اگرچہ ہم آزادی کی نعمت کے حقدار تو نہیں لیکن تو ہمیں اس نعمت سے نواز کر شرمندہ کر دے تاکہ ہم تیری رحمتوں کے لیے تیری طرف زیادہ توجہ دینے کے قابل ہو جائیں۔

اے معبودِ حقیقی! تیرے خود سر بندوں نے تیری زمین پر ظالمانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے دلوں کو بدل ڈال۔ ان کے کافر دلوں کو مسلمان بنا دے۔

اے معبودِ حقیقی! جس طرح یہاں کی بے سرو سامانیوں میں ہمیں عید کا چاند نظر آرہا ہے۔ اسی طرح آزادی کا چاند بھی جلد نظر آجائے۔

اے خدا! آزادی کا چاند نظر آنے کے بعد ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اس نعمت سے جائز فائدہ اٹھا سکیں۔ ہم اپنوں اور غیروں سب کے ساتھ ایک جیسا انصاف کر سکیں۔

اے ربِ کریم! الجزائر کے جو مجاہد شہید ہو چکے ہیں، ان کا غم ہماری عید کو مٹا نہیں سکتا کیونکہ یہ شعارِ اسلامی ہے۔ ہم عید کے پیغام مسرت کو سن کر ایک بار پھر عزم کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی اور انسانیت کے اسلامی منشور کے لیے اپنی جانیں ہنس ہنس کر قربان کریں گے۔ ہم ہلالِ عید کی طرح قوم و ملک کی مسرت و شادمانی بنیں گے۔

دعا مانگ لینے کے بعد بوڑھے نے اپنی ڈاڑھی کو آنسوؤں سے صاف کرنے کے بعد ہر ایک کو سلام کیا بھی اور ہر کسی سے سلام لیا بھی۔

اندھیرے میں ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی کے اندر اس چھوٹے سے قافلے کے تفریحی قہقہے ہلالِ عید کی خوشی کا نقارا بن گیے — یہ چھوٹا سا قافلہ رات گیے تک آنے والی عید کی خوشیاں مناتا رہا۔

۳۷

ریگستان کے مہمان بوڑھے بزرگ کی دعاؤں کا رفتہ رفتہ اثر ہونے لگا۔ اور آزادی کے دن قریب سے قریب تر آنے لگے۔ لیکن آزادی کو ابھی اپنے لیے اور زیادہ قربانی کی ضرورت تھی۔ راہگیر اب بھی دہشت پسندوں کا شکار ہو جاتے رہے۔

عید پندرہ مئی کو تھی۔ مگر اس کے دوسرے ہی دن قافلہ کے جو چند افراد جن میں خواتین بھی شامل تھیں، بموں کا شکار ہو گئے۔ خواتین تو بال بال بچ گئیں مگر تین مردوں کا پتہ نہ چلا۔ بم چلنے کے بعد جو بھاگڑ مچی تو خواتین کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان کے عزیزوں کی لاشیں کہاں ہیں۔ وہ اپنی لاشوں کو تلاش کرتے کرتے دور نکل گیئں اور پھر کہیں جا کر پتہ چلا کہ لاشیں مسلم ہسپتال میں پہنچائی گئی ہیں۔ وہاں لاشوں کی اتنی زیادہ تعداد تھی کہ خواتین کا اپنی لاشیں پہچاننا مشکل تھا۔ زیادہ تعداد کے علاوہ بموں کے چلنے سے لاشوں کے چہرے اس قدر مسخ ہو گئے تھے کہ چہروں سے نہیں بلکہ ملبوسات

سے پہچاننا آسان تھا۔ لیکن کن ملبوسات سے پہچانتے، جب کہ تمام لاشوں کے ملبوسات کا ایک ہی رنگ تھا اور وہ تھا سرخ رنگ —— خون کی طرح —— بلکہ خونی۔

خواتین مجبوراً ہسپتال کے ایک ایسے کمرے میں چلی گئیں جہاں تین لاشیں پڑی تھیں۔ انھوں نے یہ تصوّر کر کے کہ یہ لاشیں ان کی اپنی ہیں، ماتم کرنا شروع کر دیا۔ یہ لاشیں ان کی اپنی نہ بھی ہوتیں تو جنگِ آزادی میں ہر لاش کا تعلق ہر حریت پسند سے ہو سکتا تھا۔

جنرل جوہاڈ جسے تیرہ اپریل کو سزائے موت مل چکی تھی، کسی طرح جیل سے بھاگ نکلا۔ اس کی گرفتاری دوبارہ عمل میں آئی اور اسے فرانسیسی حکومت کھینچ کر عدالت میں لے آئی۔

عدالت —— ایوانِ انصاف کی چھتوں پر مشین گنوں سے مسلح پولیس پہرہ دے رہی تھی۔ کمرۂ عدالت کے باہر اور اندر فوجی نوجوان رائفلیں سنبھالے کھڑے تھے۔ کمرۂ عدالت کی مدھم روشنی نے ایک قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ کمرۂ عدالت میں کسی غیر متعلق آدمی کو آنے کی اجازت نہ تھی، دروازے بند تھے۔

ڈائس پر نو ججوں کا ٹربیونل بیٹھا تھا۔ ان ججوں میں تین فرانسیسی جرنیل، تین مجسٹریٹ۔ دو معزز شہری اور ایک ایڈمرل تھا۔ ملزموں کے کٹہرے میں عظیم الجثہ ستاون سالہ سابق جنرل ریڈمنڈ جوہاڈ جو فرانسیسی فوج میں ایر فورس کے چیف آف سٹاف کی خدمات انجام دے چکا تھا، ایستادہ تھا۔ وہ جوہاڈ جو الجزائرمیں سالان کے بعد خفیہ دہشت پسند فوجی تنظیم کا دوسرا بڑا جرنیل تھا جسے گذشتہ ماہ بغیر کسی مقابلے کے گرفتار کر لیا گیا۔

ٹربیونل کے سامنے ملزم، اس کا وکیل اور وکیل استغاثہ کھڑے تھے، کارروائی شروع ہوئی۔

ملزم جوہاڈ پر الزام عائد کر دیا گیا۔

”مسٹر جوہاڈ! تم پر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام ہے۔“

”مائی لارڈ! کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔“

”ہاں۔“

"مائی لارڈ، عدالت کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں حکومت کا باغی ہوں۔ میں باغی نہیں بلکہ محب وطن ہوں۔ مجھے فرانس سے محبت ہے۔ میں نے او۔ اے ایس کی تنظیم میں اپنے ملک کی سلامتی کی خاطر شرکت کی ہے۔"

اب جو ہاڈ کی آواز قدرے تیز ہو گئی۔

"میں الجزائر میں پیدا ہوا۔ میرے آباؤ اجداد اسی سرزمین میں مدفون ہیں۔ میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں الجزائر کے ساحل پر جان دوں۔ لیکن میری یہ خواہش شرمندہ تعبیر ہوتی نظر نہیں آتی"

ایک جج نے سوال کیا۔ "مسٹر جو ہاڈ! اپریل کی بغاوت کے متعلق تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

جو ہاڈ نے جواب دیا۔

"مائی لارڈ، اپریل کی بغاوت کی ذمہ داری صدر ڈیگال اور ان کے حامیوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس بغاوت کی ذمہ داری اگر فرانسیسی فوج کے چند باغی افسروں پر ڈالی گئی ہے تو صدر ڈیگال اور اس کے ہم نوا بھی اس سازش سے بری الذمہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔"

اب اس کی آواز پہلے کی نسبت زیادہ تیز ہو گئی۔

"مائی لارڈ! اپریل کی بغاوت سے چھ روز پہلے حال ہی میں مستعفی ہونے والے وزیر اعظم ڈیبرے کی کابینہ کے ایک ممبر نے مجھے بتایا کہ اس کے خیالات میرے خیالات کے ہم آہنگ ہیں ــــ اگر ڈیبرے علی الاعلان اپنی آواز بلند کرنے میں گریزاں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے خیالات باغیانہ نہیں۔"

جج نے ایک اور سوال کیا۔

"او۔ اے۔ ایس کی تنظیم کا کیا مقصد ہے؟"

جو ہاڈ نے جواب دیا۔

"مائی لارڈ! او اے۔ ایس کی تنظیم کوئی معمولی گروہ نہیں بلکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس تحریک کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے۔ اس تحریک کا مقصد الجزائر کا سماجی بہبود ہے۔ اس

تنظیم میں الجزائر کے تمام یورپی باشندوں اور مسلمانوں کی کافی تعداد کام کر رہی ہے۔"

جو ہاڈ نے بیان جاری رکھا۔

"مائی لارڈ! میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ الجزائری مسلمانوں کے قتلِ عام میں او۔ اے۔ ایس کا ہاتھ ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم الجزائری مسلمانوں اور یورپینوں کے درمیان اتحاد کے خواہاں ہیں اور اب تک خفیہ تنظیم نے جو پارٹ ادا کیا ہے وہ مسلمانوں اور یورپینوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کے لیے کیا ہے۔ اب بھی اگر کوئی تیسری طاقت فریقین کے درمیان آنے کی کوشش کرے گی تو ہم اس کا بھی سختی سے مقابلہ کریں گے۔"

عدالت کے صدر نے سوال کیا۔

"مسٹر جو ہاڈ! اگر تم او۔ اے۔ ایس کی تنظیم کے زبردست حامی ہو تو دہشت پسندانہ کارروائیوں کے جواز میں تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

جو ہاڈ نے کہا۔

"مائی لارڈ! بلاشبہ میں او۔ اے۔ ایس کا زبردست حامی ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اس تنظیم کے ان کارناموں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں جو اس نے الجزائر میں انجام دیئے ہیں۔ ان سیاہ کارناموں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

جو ہاڈ کی دو گھنٹے کی تقریر کے بعد استغاثہ نے پانچ گواہوں کے نام عدالت کے روبرو پیش کیے اور کہا۔ "اتفاق سے سبھی زندہ ہیں۔"

ججوں کے طلب کرنے پر ایک ایک گواہ سامنے آیا۔ ہر گواہ زخمی تھا۔ کسی کے چہرے پر زخم، کسی کی گردن پر، کسی کی پیٹھ پر، کسی کے سینے پر اور کسی کے کندھے پر۔ سب گواہوں کی حالت بہت خراب تھی۔ ہر گواہ نے بڑی ہلکی اور دھیمی آواز میں اپنا اپنا بیان بمشکل تمام پورا کیا۔ ان گواہوں پر ایک سال کے دوران پانچ مرتبہ قاتلانہ حملے کیے گئے لیکن وہ ہر بار بچ نکلے۔

ایک گواہ نے جس کا نام جنرل جین آرتھس تھا بیان کیا کہ اس کے گیارہ ساتھی خفیہ دہشت پسند تنظیم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اور پچاس شدید طور پر زخمی۔

مخالف گواہوں کے بعد صفائی کے گواہوں کی ایک طویل فہرست جو ہاڈ کے وکیل کی طرف سے پیش ہوئی جن میں سے فرانسیسی آنجہانی البرٹ کیموس نامی، آدمی کی بیوی نے گواہی دیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے یہی کہا، "جو ہاڈ ہمیشہ اپنے وطن سے محبت کرتا رہا ہے۔ اور الجزائر کے متعلق اس کے خیالات اسی جذبہ سے متاثر ہوئے ہیں"۔

ان گواہوں کے بعد جو ہاڈ کے وکیل نے عدالت کو سالان کا ایک خط پیش کیا۔ اس خط میں جو ہاڈ کو فرانس اور مغربی تہذیب کا وفادار ثابت کیا گیا تھا۔

اس خط کے مطالعہ کے بعد صدرِ عدالت نے مسکرا کر کہا۔ "باغی کی سفارش کسی باغی کو سزا سے نہیں بچا سکتی"۔

صدرِ عدالت نے کہا مسٹر جو ہاڈ! تم اپنے اور اپنی پسندیدہ تنظیم کے متعلق کچھ اور کہنا چاہتے ہو تو عدالت کی طرف سے پوری اجازت ہے"۔

جو ہاڈ نے کہا۔

"مائی لارڈ! بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں خود محبّ وطن ہوں اور میری تنظیم کے مقاصد بھی اعلیٰ ہیں"۔

کارروائی کے دوران ایک سپاہی کمرۂ عدالت میں داخل ہوا اور اس نے ٹریبونل کی خدمت میں ایک تحریر پیش کی۔

صدرِ عدالت نے سپاہی کی لائی ہوئی تحریر ہاتھ میں لے کر ذرا درشت لہجے میں کہا۔

"کیا تمہاری خفیہ تنظیم کے یہی اعلیٰ مقاصد ہیں کہ گذشتہ ہفتے کے دوران میں تمہاری خفیہ کمین گاہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے تمہارے چیلے چانٹوں نے پانچ گھنٹوں تک فرانسیسی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ مگر انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ کیا یہی سنہری اصول ہیں تمہاری تنظیم

کے جو سالان کے لیے خفیہ اڈے بنانے کی کوشش کرتے رہے مگر آخر کار ناکام ہوئے ... میں نہیں سمجھتا کہ جس انسان کے دماغ میں تھوڑی سی بھی عقل ہے وہ ان کارناموں پر فخر کرسکتا ہے، ہاں ان کارناموں کی مذمت کی جاسکتی ہے... ... زوردار مذمت۔"

اس کے بعد فرانسیسی پراسیکیوٹر نے اپنے دلائل پیش کیے اور پھر مطالبہ کیا کہ جو ہاڈ کو سزائے موت دی جائے۔

ٹربیونل نے پراسیکیوٹر کی سفارش پر غور کرنے کے لیے عدالت کی کارروائی ملتوی کردی اور بند کمرے میں ٹربیونل نے ہر پہلو پر خوب اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد، جس پر دو اڑھائی گھنٹے کا وقت صرف ہوا، عدالتی کارروائی بحال کردی اور صدرِ عدالت نے فیصلہ سنایا۔

"مسٹر جوہاڈ! تمہیں حکومت کی بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی جاتی ہے۔"

سزائے موت کی آواز نے جو ہاڈ جیسے جری آدمی کے چہرے کا رنگ سفید کردیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اپنی جگہ کھڑا نہ ہوسکے گا۔ نزدیک ہی اس کی بیوی کھڑی تھی جو ہاڈ نے اس کو نظر بھر کر دیکھا، اس کی ویران آنکھیں آنسوؤں سے بے نیاز تھیں جو ہاڈ نے اس کو دیکھنے کے بعد اپنا سر جھکا لیا۔

جو ہاڈ کے وکیل نے کہا۔ "آپ کی سزا کے خلاف صدر ڈیگال کے پاس سفارش کی جاسکتی ہے۔"

جو ہاڈ نے جواب دیا۔

"صدر ڈیگال کے پاس رحم کی اپیل میری عزت اور وقار کی موت ہے۔"

آخر جو ہاڈ کو مسلح دستے کی حفاظت میں جیل بھجوا دیا گیا۔

جو ہاڈ نے واقعی صدرِ ڈیگال کے پاس رحم کی کوئی اپیل نہ کی البتہ بار ایسوسی ایشن نے اپنے طور پر صدر ڈیگال سے تحریری طور پر درخواست کی کہ وہ جو ہاڈ کی سزا میں تخفیف کردیں۔ بعض کا خیال تھا کہ سزا میں تخفیف ہوئی تو الجزائری مسلمانوں کے نزدیک اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ

حکومت مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

جوہاڈ کی سزائے موت کے بعد الجزائریوں اور فرانسیسیوں کی نگاہیں جنرل سالان کے مقدمہ پر لگ گئیں۔

۱۸ر مارچ کو جنگ بندی کے سمجھوتے پر دستخط ہو جانے کے بعد جو عبوری حکومت قائم ہوئی اس کے صدر عبدالرحمٰن فارس مقرر ہوئے۔ وزیر اعظم بن خدہ اور نائب وزیر بن باللہ جو ابھی تک الجوائر میں نہ پہنچے تھے، تین الجوائری وزراء، تین فرانسیسی اور طے شدہ معاہدے کے مطابق ان چھ وزیروں نے ایک اور وزیر کا انتخاب کر لیا۔

اب اس عبوری حکومت کا کام استصواب رائے اور کامل آزادی کے لیے راہ ہموار کرنا تھا جنگ بندی کے بعد یورپی دہشت پسندوں کی طرف سے جنگی کارروائیوں میں بالکل فرق نہ آیا حکومتِ فرانس کے لیے سالان کی کارروائیاں سخت پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔

دہشت پسند رہنما خفیہ ریڈیو بلکہ ٹیلیویژنوں کے ذریعے یورپی آباد کاروں سے اپیل کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہنے لگے۔ "ڈیگال کی حکومت کا تختہ الٹ دو —— جنرل ڈیگال

قوم کا غدار ہے، غدار کو پھانسی پر لٹکا دو۔ الجزائری مسلمانوں کی بوٹیاں نوچ ڈالو۔"

جنگ بندی کے بعد دہشت پسندوں کے دہشت پھیلانے میں کچھ فرق نہ آیا تو حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے میں اپنا سارا زور صرف کر دے گی۔ چنانچہ اس بار اس کی کوشش کارگر ہوئی۔

۱۵ اپریل کی دوپہر چمک رہی تھی۔ ریو دیس فانٹین کی بلند و بالا عمارت اپنی امارت کا پتہ دے رہی تھی۔ جس جگہ یہ عمارت موجود تھی اس کے ارد گرد بھی بہت سی اچھی عمارتیں موجود تھیں۔ لیکن عمارت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس علاقے میں زیادہ تر الجزائری سفید فام آدمی رہتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کمرہ نمبر ۲۵ کے سامنے ایک کار رکی جس میں سے چند سپاہی برآمد ہوئے۔ انھوں نے خفیہ پولیس کے سادہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ سپاہی جلدی سے تین کمروں والے مکان کے اندر داخل ہو گیے۔ تینوں نے نہایت پھرتی سے ایک زرد رو سیاہ مونچھوں والے ۶۲ سالہ شخص کے سینے پر پستول رکھ کر پوچھا۔

"تم ہی سالان ہو؟"

"جی۔"

سالان کے پاس اس کا ساتھی کیپٹن جین فرانڈی کھڑا تھا دو سپاہیوں نے اسے بھی گرفتار کر لیا۔

سپاہی اس کے بعد انھیں ہیلی کوپٹر کے ذریعے فرانسیسی فوج کے ہیڈ کوارٹر میں لے آئے۔ یہاں انھیں ان کے ایک قدیم ساتھی سے ملایا گیا۔ اس نے خود ہی پوچھا۔

"مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"جنرل چارلس ایلرٹ۔" جنرل سالان نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو پھر سنو۔" اس نے چلا کر کہا۔ "دہشت پسندوں نے اب تک جتنے ظلم و ستم کیے ہیں ان سب کے ذمہ دار تم ہو ـــــ تم۔"

سالان خاموشی سے سرنگوں رہا۔

پھر جب جنرل چارلس ایلرٹ نے الجزائر کے ریذیڈنٹ کمشنر جنرل موسیو فوشے کو جنرل سالان کی گرفتاری کی خبر پہنچائی تو وہ بے حد خوش ہوا اور کہنے لگا۔"اب الجزائر میں امن ہو جائے گا"۔

اگرچہ دہشت پسندوں کی سرگرمیوں میں ابھی تک فرق نہیں آیا تھا لیکن جب عوام کو یہ معلوم ہو گیا کہ جنرل سالان گرفتار ہو چکا ہے تو انھیں اب بد امنی کی فکر نہ رہی۔ یہ خبر بجلی کی طرح الجزائر، تیونس، مراکش، فرانس، پیرس بلکہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔

سالان کو جیل میں بھیج دیا گیا۔

اگرچہ جنرل سالان اور جنرل جوہاڈ دونوں کی غیر حاضری میں انھیں سزائے موت مل چکی تھی پھر بھی فرانس کے قانون کے مطابق اس پر مقدمہ چلانا ضروری تھا۔ سالان شروع سے آخر تک بہت کم گو رہا لیکن پیرس میں قید کے دوران وہ پولیس افسروں سے خود بخود کہنے لگا۔

"یہ میری غلطی تھی کہ میں ہر ایک سے بے تکلف ملتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے کسی راز دار نے مخبری کی ہو گی۔ بہر حال کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے"۔

دہشت پسندوں کے ریڈیو اب بھی پکار رہے تھے۔"ڈیگال کو قتل کر دو۔ اس کا تختہ الٹ دو۔ جنگ جاری رہے گی"۔

جنرل سالان کی گرفتاری کے بعد بھی جب قتل و غارت میں کوئی کمی نہ ہوئی تو صدر ڈیگال نے پانچ ہزار مزید فوجی الجزائر کے شہر وہران میں بھیجے۔ یہ فوج روانہ کرنے کے ساتھ ہی اس نے ایک اور کام کیا۔ وہ یہ کہ اس نے جنرل ایلرٹ کی بجائے جنرل فوکیٹ کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ یہ جنرل، صدر کے نزدیک حالات پر زیادہ چابک دستی سے قابو پانے والا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دہشت پسندوں کی تنظیم میں تنظیم کی روح کو اس قدر برقرار رکھا گیا تھا کہ اس کی کارروائیوں پر اپنے رہنما کی گرفتاری کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک ہی وقت میں حکومت کے افراد

اور خود سالان خفیہ ریڈیو سُن رہے تھے۔

آخر سالان کا مقدمہ دائر ہوا۔ وہ عدالت کے کمرے میں کھڑا تھا۔

دن کے عین پونے بارہ بجے اڑھائی تین گھنٹے تک نو ججوں نے سالان کے اہم ترین مقدمہ پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا۔ اس غور و خوض کے بعد وہ جج نہایت پراسرار طریق سے عدالت میں پہنچے اور کمرۂ عدالت میں جو سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، فیصلہ سنایا مگر اس فیصلے سے پہلے جب کہ کارروائی شروع ہوئی تھی ایک عجیب منظر کی حامل تھی۔

مقدمہ پیش ہوا تو سالان کے روسی نژاد وکیل نے، جس کا نام جارحس گاڈ ترمنوف تھا اور الجزائر میں پریکٹس کر رہا تھا، سالان کی طرف اشارہ کر کے خالص فرانسیسی انداز میں کہا۔

"جنرل سالان! میں خون آشام قسطنطین کی آواز ہوں۔ میں الجزائری اطفال، عوران اور باب العہد کے بے اثر عوام کی آواز ہوں۔ تمہیں ہلاک کرنا غیر مسیحی فعل ہوگا۔ کیونکہ تم نے الجزائر میں ہماری قسموں کی عزت قائم رکھی ہے۔ تمہیں سزائے موت ہوئی تو سمجھو ہم سب صلیب پر لٹک گیے ——— اے سالان! تم یقین رکھو کہ اگر تمہاری جان لی گئی تو ساری قوم صلیب کی طرف گامزن ہوگی۔ اے جرنیل! میں خون آشام قسطنطین کی آواز ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ ۔ .. اے جرنیل! تمہارا شکریہ۔ ۔ ۔ .. اے جرنیل الوداع۔ ..۔ اے جرنیل! زندہ باد!"

لیکن جب وکیل صفائی نے اپنے تین گھنٹوں کی تقریر میں سالان کی بنائی ہوئی تنظیم کے مظالم گنوائے تو وہ خاموش رہا۔

اس کے بعد پراسیکیوٹر جنرل ایم گوالدا نے سالان کے جرائم کی داستان سنانے کے بعد کہا۔ "خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔"

سالان آخر تک خاموش رہا۔ لیکن ایک فیصلہ سنانے سے پہلے، ایک جج نے اس سے کہا۔ "کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے کہا "ہاں۔"

جج بولا۔ "تو پھر کہو۔"

اور سالان بلند آواز سے پکارا۔ "فرانس زندہ باد۔"

اس پر شور اور ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لوگ تالیاں پیٹنے لگے۔ جب شور کچھ کم ہوا تو سالان نے کہا۔ "خدا آپ پر رحم کرے، خدا مجھ پر رحم کرے اور خدا وکیل استغاثہ پر رحم کرے۔"

پھر جب تو ججوں نے سالان کے مقدمہ پر باہمی اظہار خیال کرنے کے بعد فیصلہ سنایا تو کمرۂ عدالت کی عجب کیفیت ہو گئی۔

ججوں نے یہ فیصلہ سنایا کہ سالان کو عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔ اس فیصلہ کے بعد کمرۂ عدالت عیش و طرب کی تقریب میں تبدیل ہو گیا۔ یکایک ہر کوئی خوشی کے مارے رقص کرنے لگا۔ لوگ ایک دوسرے کا خوشی سے بوسہ لینے لگے۔ وکیل اعلیٰ خوشی کی وجہ سے ناچتا ناچتا بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے شور برپا ہوا۔ مگر کچھ دیر بعد وکیل ہوش میں آ گیا۔ اور ہوش میں آتے ہی نغمۂ مارسیلز[1] الاپنے لگا۔ اس نغمہ کے دوران یہ آوازیں بھی آنے لگیں کہ "الجزائر فرانس کا حصہ ہے۔ باوجود اس کے کہ وزیٹرز گیلری کے چاروں طرف بندوقیں سنبھالے ہوئے مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ اور عدالتی افسر اور جج نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے پھر بھی یہ کیفیت قابو سے باہر تھی۔ کمرۂ عدالت کے نصف میل دور فرانسیسی عوام نعرے لگا رہے تھے۔

آخر عمر قید کی سزا سنا کر سالان کو کمرۂ عدالت سے باہر نکالا گیا۔ اگرچہ وہ پولیس کے ہمراہ جا رہا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جلوس کے ہمراہ جا رہا ہے۔

جنرل سالان کا مقدمہ اپریل کے وسط میں شروع ہو کر پورے سات روز تک جاری رہا ایک پیشی میں استغاثہ کے وکیل نے، جو گنٹھیا کے مرض کی وجہ سے کھڑا ہو کر تقریر کرنے سے قاصر تھا، بیٹھے بیٹھے عدالت کے سامنے بحث کر رہا تھا۔ سالان کے لیے سزائے موت تجویز کرتے وقت اضطراری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سالان کو مخاطب

---

[1] فرانس کا نغمہ

کر کے کہنے لگا۔

"جنرل سالان! میرا خیال تھا کہ جیل کی کوٹھڑی میں تمہارا غرور ختم ہو چکا ہو گا اور تم یہاں عدالت میں ہر بات کی وضاحت کر سکو گے مگر افسوس کہ تم خاموش رہے۔ الجزائر میں جنگ بندی کے بعد تم بھی جنگ بندی کا حکم دے سکتے تھے۔ لیکن تم نے قتل و غارت روکنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ تم جمعہ کے مقدس دن کو گرفتار ہوئے۔ میں اپنے طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اس مقدس دن ہی کی بدولت تمہارا ضمیر جاگ اٹھا ہو گا۔ مگر تمہارا ضمیر خوابیدہ رہا۔ تم نے یہ کیونکر سوچ لیا تھا کہ تم پر قانون اثر انداز نہیں ہو گا اور تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی"

اس کے بعد وکیل صفائی نے جذباتی دلائل دیئے جن سے جج اکتا گیا اور کمرۂ عدالت سے اٹھ کر چلا گیا۔

اور پھر ... یہ معلوم ہو ہی چکا ہے کہ آخری پیشی میں سالان کو عمر قید کی سزا ملی جو سالان اور اس کے ہزاروں ساتھیوں کے نزدیک ایک بیش بہا تحفہ تھا — اور حقیقتاً ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے قاتل کے لیے عمر قید کی سزا ایک بیش بہا انعام تھا جو اسے نو ججوں کے متفقہ فیصلے نے دیا اور اس فیصلے کا انعام عدالت کے عائد کردہ ان دو جرموں کی بنا پر ملا کہ وہ فوجی بغاوت کا محرک اور دہشت پسند تنظیم او۔ اے۔ ایس کا قائد تھا۔

زبیدہ کے والد نے جس دوپہر کو عائشہ سے یہ کہا کہ شام سے پہلے چائے تیار ہو جائے۔ اس دوپہر کو زبیدہ کی والدہ سے علیحدگی میں شام کے وقت حل کرنے والے معمّے کے بارے میں گفتگو کی۔

شروع شروع میں تو زبیدہ کی والدہ نے شام کو ہونے والی بات کی مخالفت کی لیکن جلیل صاحب کے دلائل دینے پر وہ بالآخر مان گئی۔ اس نے کہا "واقعی غلطی کا اعتراف بہت ثواب کا درجہ رکھتا ہے اور ہمیں اس درجے کو حاصل کرنے میں غفلت نہیں دکھانی چاہیئے۔

زبیدہ کی والدہ کو خیال آیا کہ دل کی پوری صفائی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ عقیل وغیرہ کو بھی اس دعوت میں شریک کر لیا جائے کیونکہ ان کی موجودگی میں جن خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے ان کی سچائی کے وہ پوری طرح قائل ہیں۔ جلیل صاحب نے یہ تجویز بے حد پسند کی اور وہ انھیں لانے

کے لیے چل پڑے۔ عقیل اور اس کے بھائی بہن حیران تھے کہ آج شام کی چائے پر خاص طور سے بلاوا کیوں آیا ہے؟ عزیزہ نے جلیل صاحب سے کہا: "آپ یہیں رات گذارنے کے لیے بھی کہہ رہے ہیں۔ لیکن شام کی چائے کی خصوصیت پر بہت زور دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہو پائی"

جلیل صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا: "آج شام کی تقریب چائے واقعی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چاہوں تو میں اس وقت بھی وجہ بتا سکتا ہوں مگر مناسب یہی ہے کہ موقع کی بات موقع پر ہی ہو"

جلیل صاحب نے عقیل اور اس کے بھائی بہن کو اور زیادہ الجھن میں ڈال دیا اور ان کا اشتیاق شام کی تقریب چاء میں شمولیت کے لیے بڑھ گیا۔ آخر جب یہ لوگ زبیدہ کے گھر پہنچے اور انھوں نے عائشہ اور زبیدہ سے شام کی دعوت چاء کی اہمیت کا باعث معلوم کیا تو وہ یہ جان کر حیران رہ گیے کہ انھیں بھی معلوم نہ تھا۔ بس زبیدہ کے والدین کی معنی خیز مسکراہٹ پتہ دیتی تھی کہ انھیں وجہ معلوم ہے اور وہ شام سے پہلے وجہ بتانے کو تیار نہیں۔ اسی باعث ان کے انتظار کی گھڑیاں شدت احساس نے بہت طویل کردیں۔ آخر جب شام ہوئی اور سب میز کے ارد گرد بیٹھے تو بشارت نے چاء اور بیکری کی قسم قسم کی لذیذ پلیٹیں لاکر رکھ دیں

عقیل بولا: "چچا جان! اس میں شک نہیں کہ اپنی رہائش کے دوران میں نے آپ کے ہاں اعلیٰ سے اعلیٰ دعوتیں اڑائی ہیں مگر آج کی چاء کے ساتھ جو مختلف النوع سامان رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا"

عزیزہ نے کہا: "معلوم ہوتا ہے چچا جان نے بیکری والے کو خاص آرڈر دے کر یہ چیزیں تیار کرائی ہیں"

زبیدہ نے کہا: "لطف یہ ہے کہ گھر میں رہنے کے باوجود ہمیں اس کا سبب معلوم نہیں"

اور کرامت نے کہا: "یہ بھی باتیں ختم کیجیے اور دعوت قبول کرنے کا سلسلہ شروع کیجیے

کیونکہ میرے منہ سے تو رال ٹپکنے لگی ہے۔"

اس پر سب ہنس پڑے۔ عزیزہ کو شرارت سوجھی، اس نے کہا: "عائشہ بہن نے کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔"

اور اس نے عزارادی طور پر کہا: "میں تائید کرتی ہوں۔"

خود عائشہ کو بھی یاد نہ رہا کہ تائید کے الفاظ کا تعلق کس کی رائے زنی سے ہے۔ عزیزہ بولی۔ "گویا آپ کے منہ سے بھی رال ٹپک رہی ہے۔"

اس جملے کے بعد عائشہ کو ہوش آیا اور وہ حیادار قہقہوں میں گم ہو گئی۔

آخر بسم اللہ پڑھ کر سب نے اپنا اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عزیزہ کو آج بہت سی شرارتیں سوجھ رہی تھیں۔ کرامت جو چیز بھی کھانے کے لیے اٹھاتا۔ وہی چیز عزیزہ اٹھا کر عائشہ کو دے دیتی۔ عائشہ عزیزہ سے بہت تنگ آئی اور خفیہ اشاروں سے اس کی منت سماجت کر کے کہنے لگی: "خدا کے لیے اپنی شرارتیں بند کرو۔"

شرارتیں بند نہ ہوئیں تو عائشہ نے ایک ایسی بات اس کے کان میں کہی کہ وہ اس جگہ سے اٹھ کر زبیدہ کے پاس بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے عزیزہ کے کان میں یہ کہا تھا: "اگر تم شرارتوں سے باز نہ آئیں تو میں چچا جان کے بھتیجے سے شکایت کرنے پہنچ جاؤں گی۔"

جس روز اتفاق سے جلیل صاحب نے زبیدہ کی والدہ کی موجودگی میں یہ الفاظ کہے تھے کہ وہ عزیزہ کا رشتہ اپنے بھتیجے سے کر دیں گے۔ اس روز عائشہ نے اوٹ میں ہو کر یہ الفاظ سن لیے تھے اور وہ اس راز کو صیغۂ راز ہی میں رکھنا چاہتی تھی لیکن آج جب کہ اس نے دیکھا کہ عزیزہ کسی صورت بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آ رہی تو مجبوراً اسے راز کو فاش کر دینا پڑا۔

اگرچہ اس وقت سب کیک، پیسٹری، بسکٹ کٹلٹ اور نمکین چیزوں کو ہڑپ کرنے میں منہمک تھے لیکن کسی کسی وقت زبیدہ اور عقیل کی ۔ ۔ ۔ عائشہ اور

کرامت کی نگاہیں ایک دوسرے کے ساتھ ضرور ٹکرا جاتی تھیں۔ اور انھیں بیتے ہوئے رنگین دنوں کی یادوں کی زنجیروں میں جکڑ دیتی تھیں۔

آج مذاق اور شرارت کے بعض موقعے خود بخود پیدا ہو رہے تھے۔ زبیدہ نے کیک کا ایک ایک حصہ توڑنا چاہا تو وہ زیادہ پک جانے کی وجہ سے جلد ٹوٹ نہ سکا۔ اس کے منہ سے نکل گیا کہ یہ تو "کنکر" معلوم ہوتا ہے۔ "کنکر" کے لفظ سے کرامت چونکا اور کرامت کے چونکنے پر عائشہ کی بے اختیار ہنسی نکل گئی جس پر اس نے نہ جانے کس مشکل سے قابو پایا۔

اب قریب قریب سب چائے سے فارغ ہو چکے تھے۔ عقیل نے کہا "یہ کیا معمہ ہے"! مگر عائشہ نے بات بھلانے کے لیے کہا۔ "اس معمہ کی بجائے چچا جان اپنے معمے کا حل بتائیں جس کے لیے ہم سب بیقرار بیٹھے ہیں"۔

اب جلیل صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا اور یوں بات شروع کی۔

"میرے عزیزو! آج میں اور تمہاری چچی ایک غلطی کا اعتراف کر کے اپنے بوجھ کو سر سے اتارنا چاہتے ہیں"۔

جلیل صاحب کے اس جملے پر سب چونک اٹھے۔ خاص طور پر زبیدہ ہمہ تن گوش ہو گئی

خدا نے ہمیں ایک ہی بیٹی دی جو اس وقت تمہارے درمیان بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ ہمیں بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے خود بیٹے کا بھی بہت شوق ہوا لیکن قدرت نے اس خواہش کو اس طرح پورا کر دیا کہ اس نے مجھے ایک بھتیجا دے دیا جس کا نام قیصر ہے اور جو اپنے والدین کے ہمراہ تیونس میں موجود ہے۔

الجزائر میں رہتے ہوئے چونکہ میرے اکلوتے بھائی کا یہی قیصر ایک لڑکا تھا اور وہ بھی اسے اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے تیونس جاتے وقت وعدہ کیا کہ اگر اور اولاد ہو گئی تو قیصر کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ چنانچہ وہ ہنگامی حالات ختم ہو جانے کے بعد انشاء اللہ الجزائر میں آجائے گا"۔

عائشہ نے بات کاٹ لی۔

"کیا آپ کے پاس ان کے فوٹو ہیں؟"

"ہاں ہیں تو سہی مگر مجھ سے کہیں ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ مل گئے تو دکھاؤں گا۔ اب تو وہ ہٹا کٹا جوان ہو گا۔"

اس فقرے سے عزیزہ زمین میں گڑ گئی۔

جلیل صاحب نے بات جاری رکھی "ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہمیں اپنی بیٹی بہت عزیز ہے۔ ہمیں اس سے شروع ہی سے بے اندازہ محبت ہے۔ ہم اس کا بال بیکا ہوتا بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنی انتہائی محبت ہی کی وجہ سے اس کی تعلیم و تربیت میں اچھا خاصا حصہ لیا۔ اس کو دینی تعلیم سے بھی واقف کرایا اور دنیوی تعلیم سے بھی۔ اسے قرآن حکیم ایک بار ناظرہ پڑھایا اور دوسری بار ترجمہ سے۔ ناظرہ پڑھانے کے بعد اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ختم قرآن کر دیا اور ترجمہ مکمل پڑھ لینے کے بعد بھی ایک مبارک تقریب کا انتظام کیا اور اس کا نام رکھا ختم قرآن مترجم۔ اس موقع پر میں نے اور میرے ان عزیزوں نے جو الجزائر میں ہوا کرتے تھے بہت نصیحت آموز تقریریں کیں۔ ان تقریروں کے ذریعہ اپنی بیٹی کو ہر لحاظ سے مکمل مسلمان بننے کا سبق دیا۔ مکمل مسلمان انفرادی زندگی کے علاوہ قومی زندگی کے ساتھ منسلک ہونے اور قومی تقاضوں کو پورا کرنے سے ہوتا ہے۔ جہاں تک قومی زندگی کے صحیح شعور کا تعلق ہے ہماری یہ بیٹی اس سے بہت حد تک واقف ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اتفاقات نے جب الجزائر کی آزادی کے قومی فرض کی دعوت دے دی تو ہماری بیٹی نے یہی محسوس کیا کہ اس کے قومی زندگی کے صحیح شعور کو پرکھنے کا وقت آگیا ہے۔

"پھر کیا مسلمانوں کی اس خفیہ تنظیم کا ساتھ دینے کیلئے وہ مستعد ہو گئی جس کا مقصد وقت الجزائر کی حصولِ آزادی تھا۔ ہماری بیٹی بجا طور پر سمجھتی تھی کہ اگر ایک زبیدہ اس بھروسہ

پر عمل سے تہی دامن رہے کہ ملک میں اور بہت سی زبیدائیں جنگ آزادی کو تیز کرنے والی موجود ہیں اور ان کی مساعی سے ملک آزادی ہو ہی جائے گا تو پھر ہر گھر کی باشعور لڑکی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں کے مفروضہ بھروسہ پر تکیہ کر کے بیٹھی رہے۔ حالانکہ آزادی کی ضمانت یوں نہیں ملتی بلکہ اس طرح ملتی ہے کہ ہر گھر کے افراد حصولِ آزادی کے لیے یہ یقین کرلیں کہ جب تک وہ خود کفن بردوش ہو کر قدم نہیں اٹھائیں گے تب تک آزادی کی نعمت ایک خواب خیال ہو کر رہ جائے گی بلکہ اس کا ردعمل غلامی کی زنجیروں کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دے گا۔

"مگر میرے عزیزو!" جلیل صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم بدقسمت والدین کے دلوں پر حصولِ آزادی پر اپنی بیٹی کی محبت غالب آئی۔ اور میں احکام خداوندی کو کسی حد تک تاویلات کا رنگ دے دے کر اپنی پیاری بیٹی کو ہر اس قومی اقدام سے روکتا رہا جس سے اس کے قید یا شہید ہو جانے کا غیر متوقع یا متوقع خوف لاحق ہو سکتا تھا۔ ہم کسی صورت میں بھی اپنی پیاری بیٹی کی جان پر آنچ نہیں آنے دینا چاہتے تھے اور اس کے لیے یہی ہو سکتا تھا کہ میں اپنی ذہانت کو راست بازی کے راستے سے ہٹا کر تاویلات کے ایسے راستے پر چلاتا جس سے ہماری بیٹی مطمئن ہو جاتی۔ میں نے پرسوں رات اپنی بیٹی زبیدہ کو سخت مغموم پایا تھا لیکن اس کے مغموم ہونے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی۔ صبح بھی وہ مغموم رہی اور اس وقت بھی اس کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ آخر وہ اپنی بہن عائشہ کے ساتھ سکول چلی گئی اور وہاں سارا دن مغموم رہی۔ عائشہ کے دریافت کرنے پر بالآخر اس نے یہ وجہ بتائی کہ جمیلاؤں کی رہائی کے موقع پر وہ جانا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی جانا چاہتی تھی۔ جانا اس لیے چاہتی تھی کہ اس کی ترسی ہوئی نگاہیں مجاہد ہم جنسوں کو دیکھ کر اور زیادہ روشن ہو جاتیں۔ اور جانے سے گریزاں اس لیے ہوئی کہ وہ ان کو بے عمل چہرہ دکھا کر شرمندہ نہ ہو۔

"جب مجھے عائشہ کی معرفت" جلیل صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ واقعہ معلوم ہوا تو میری بصیرت کے سامنے میری وہ تمام تاویلات آگئیں جنھیں میں اپنی

قابلیت اور ہوشیاری کا رنگ دے کر دلائل کی صورت میں پیش کرتا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی بنیادی تعلیم و تربیت کا بالکل صحیح احساس ہماری بیٹی زبیدہ نے اپنے اندر پیدا کیا تھا لیکن جب اتفاق سے اس احساس کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو ہماری مادرانہ اور پدرانہ نادان محبت آڑے آگئی اور ہم اسے کسی نہ کسی بہانے سے ان اقدامات سے بالواسطہ طریقے استعمال کر کے روکتے رہے جو اقدامات خدا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ نہایت مبارک اور ابدی تھے۔ قرآن و حدیث کی تفہیم اور انھیں اپنی عملی زندگی کا جزو بنانے کے بعد ضروری تھا کہ ہم اسی طرح اپنی لڑکی کو میدانِ عمل کی طرف روانہ کرتے جس طرح قرون اولیٰ میں مسلمان مائیں اپنی پیاری اولاد کو کفن بردوش کر کے اور ان کا دودھ معاف کر کے میدان شہادت میں بھیجا کرتی تھیں۔"

جلیل صاحب نے اپنے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے کہا "ذرا ہماری بے عملی ملاحظہ کرو جن دنوں عقیل بیٹا زخمی ہو کر ہمارے گھر میں لایا گیا تھا، اس روز سے ہم اپنی حقیر سی خدمت کا موقع پانے کی خوشی محسوس کرنے کے ساتھ اس وجہ سے بھی شادماں تھے کہ اس زبیدہ کو جسے زخمی غازیوں کی خدمت کا بہت شوق ہے عقیل کی خدمت کے انہماک میں میدانِ عمل کو روانہ ہونے کا خیال نہ رہے گا کیونکہ وہ اس خدمت کو جہاد کا ایک حصہ سمجھے گی۔ بلاشبہ یہ خدمت بھی خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ لیکن ہماری خود غرضی ملاحظہ ہو کہ ہم محض اس لیے خوش تھے کہ یہ خدمت اس کی جان بچانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم گنہ گار اپنی بیٹی کو قرآن و حدیث کے حوالہ سے شہادت کا درجہ سمجھانے کے بعد یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ خود یہ درجہ حاصل کرے کیونکہ اس سے ہماری خود غرضی کو ٹھیس پہنچتی تھی یعنی ہم اس کی جاں نثاری کے احتمال کو اپنی دنیوی محبت کی وجہ سے گوارا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میری غیر حاضری میں جس ڈاکٹر نے موجودہ حالات کے پیشِ نظر میدان شہادت میں کودنے

کو دانش مندی کے خلاف قرار دیا ہے اس کا خیال موجودہ حالات کے پیش نظر میری رائے میں بالکل صحیح ہے پھر بھی اپنے پچھلے گناہوں کا میں اس صورت میں کفارہ دینا چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹی کو میدان شہادت میں روانہ کرنے کے لیے پوری پوری اجازت دے دوں۔ آج صبح میں نے اس کی والدہ سے بھی بخوشی اجازت لے لی ہے اور اب ہماری خواہش یہی ہے کہ زبیدہ اپنا کفن ہمراہ لے کر ضرور میدانِ عمل میں پہنچے اور آزادی کے دشمنوں کو ختم کرتے ہوئے اگر اس کی جان بھی چلی جائے تو ہم اس پر اظہارِ مسرت کریں۔ ہماری دعا ہے کہ اگر قوم و ملک کو اس کی ضرورت پڑے تو اس کی پیٹھ زخم نہ کھائے بلکہ سینہ چھلنی ہو۔

آج ہم پوری خوش دلی اور احساسِ ندامت کے ساتھ اپنی پیاری بیٹی کو اجازت دیتے ہیں اور اس کے سیاسی حقوق کے اتلاف میں ہم سے جو ناقابلِ تلافی کوتاہی ہوئی ہے اس کی ہم اپنی پیاری بیٹی سے نہایت صدق دلی کے ساتھ معافی چاہتے ہیں ۔۔۔ اس وقت کی دعوتِ چائے اسی مقصد کے لیے دی گئی تھی۔ امید ہے اس تقریب کی اہمیت سے ہماری بیٹیاں بیٹے انکار نہیں کریں گے"۔

جلیل صاحب نے جب اپنی درد بھری تقریر ختم کی تو تقریب کے تمام مدعوعین کی آنکھیں کھل گئیں۔ آنکھیں ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں کے کواڑ بھی کھل گئے۔

عقیل نے کہا "ہمارے محترم بزرگ چچا جان! آپ نے آج جس اعتراف گناہ پر موثر اور دلآویز اظہارِ خیال کیا ہے وہ خدا کے حضور بجائے خود حصولِ ثواب کا ذریعہ بن چکا ہوگا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں زبیدہ کی طرح خود بھی عملی میدان میں کردار ادا کرنے کو تڑپ رہا ہوں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ زخمی ہو گیا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ زبیدہ کی خدمت بھی بہت بڑا جہاد تھی۔ اس میں شک نہیں کہ آپ اور چچی صاحبہ زبیدہ کے میدانِ شہادت میں نہ جا سکنے کے باعث خوش تھے لیکن یہ خوشی آپ کی تھی۔ زبیدہ کو اس سے تعلق نہ تھا اس لیے اس کے حصولِ ثواب میں کوئی فرق نہ آیا ہوگا اور وہ خدمت کرتے ہوئے

حصولِ ثواب کی اسی طرح حصہ دار رہی جس طرح وہ میدانِ شہادت میں حصولِ شہادت سے سزاوار ہوتی رہی آپ کی نیت ثواب آپ نے جس جرأت اور صاف گوئی سے اعتراف گناہ کیا ہے وہ بھی میرے نزدیک جہاد سے کسی طرح کم نہیں، یہ حقیقت ہے کہ آپ اور چچی صاحبہ کے علاوہ ہر کوئی آج کی تقریب چائے کی اہمیت سے قطعاً ناواقف تھا اور اب اس کی اہمیت کا سب کو اتنا زیادہ احساس ہوگیا ہوگا کہ وہ اسے ساری عمر فراموش نہ کرسکیں گے۔"

اس کے بعد زبیدہ نے زبان کھولی۔

"میرے پاس سپاس گذاری کے وہ الفاظ نہیں جن کے ذریعہ میں اپنی شرمسار آنکھوں کو اونچا کرسکوں۔ بہرحال میں اباجان اور امی جان کی بہت شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے اب قومی تحریک میں شامل ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ اگرچہ میں محسوس کرتی ہوں کہ موجودہ حالات میں مجھ جیسی غیر تربیت یافتہ کا شریکِ تحریک ہونا، تحریک کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ پھر بھی مجھے اس بات کی انتہائی مسرت ہے کہ میرے پاس اپنے والدین کا اجازت نامہ محفوظ ہے۔ اب جس وقت قوم اور ملک نے مجھے بلایا میں انشاء اللہ پابہ رکاب ہوجاؤں گی۔"

زبیدہ کے بعد کرامت بولا۔

"چچا جان! انسان کا ضمیر بڑی بے باک طاقت ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس کی ملامت سنتا رہا ہوں مگر آج اس کی آواز نے میرے دل کے کان کھول دیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "تم بھی اس بات کا اعتراف کرلو کہ تم بھی اپنے بھائی کو میدانِ شہادت میں جانے سے محض اس لیے روکتے رہے ہو کہ اس کی جان۔۔۔۔"

کرامت نے ابھی اتنے ہی الفاظ کہے تھے کہ دستک ہوئی عقیل اور کرامت نے باہر جا کر دیکھا تو ڈاکٹر اور مجاہد حمید الدین تھے جن سے ان کی ملاقات ہوٹل میں ہوئی تھی۔

اس سے پہلے جلیل صاحب کو گھر کے افراد سے ڈاکٹر اور مجاہد کا غائبانہ تعارف ہوچکا تھا۔ اب دونوں آئے تو ڈاکٹر صاحب ان سے بڑی گرمجوشی سے ملے۔

مجاہد سے ملنے کے انداز میں خاص تپاک پایا جاتا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس میں انکے تازہ رجحانات اور خیالات کا ردِ عمل شامل ہے۔

بہرحال ڈاکٹر اور مجاہد کو مردانے میں عزت سے بٹھایا گیا اور ان کے لیے زبیدہ نے کئی قسم کے پھل پلیٹوں میں سجا کر رکھ دیے۔

ڈاکٹر اور حمید الدین نے اس تواضع کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی" زبیدہ نے جواب دیا۔

"مشکل یہ ہے کہ ہم اس حقیر سی خدمت کو سرے سے تکلیف سمجھتے ہی نہیں"

زبیدہ کے اس جواب سے مہمان بہت خوش ہوئے۔ مجاہد حمید الدین تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس کی طرف دیکھتا رہا۔

جلیل صاحب نے اپنے گھر کی تمام مستورات کا پردہ ڈاکٹر صاحب اور مجاہد سے اسلیے اتروا دیا کہ ان کا پردہ ہوٹل میں پریشان حال اجلبنی کی وجہ سے ہنگامی حالات میں پہلے ہی اتر چکا تھا۔

جلیل صاحب نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا "قبلہ! میں آپ کی اس محبت کا بے حد ممنون ہوں جس کے اثر سے آپ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی میں برخوردار حمید الدین کا بھی ممنون ہوں جس نے اپنے قیمتی قومی وقت میں سے ہماری ملاقات کے لیے وقت نکالا"

ڈاکٹر صاحب نے اپنا اور حمید الدین کا تعارف کراتے ہوئے کہا "قبلہ! بنیادی اور ذہنی طور پر ہم آہنگی موجودہ دور میں بہت غنیمت ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں ہوٹل کے منیجر کے بلانے پر وہاں پہنچ گیا اور وہاں آپ کی بیگم صاحبہ اور برخورداروں سے ملاقات ہو گئی مجھے اس بات کا بہت افسوس ہوا کہ میں اجلبنی کی لاش میں زندگی داخل نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ کام قادر مطلق کا لیکن اس افسوس کے ساتھ یہ خوشی بھی ہوئی کہ اتفاقاً اچھے لوگوں سے ملاقات ہو گئی

کی بیٹی زبیدہ کی زبان پر جو قدرتی طور پر خیالات طاری ہوئے ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ زبیدہ بھی کوئی نہ کوئی جمیلہ ضرور ہے۔ الجزائر کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی خواتین حسن اتفاق سے ہم نام نکلیں تو مجھے خیال آیا کہ خدا تعالیٰ نے ایک اور ہم نام پیدا کر دی ہے۔ خیر اگرچہ ہم نام نہیں تو ہم خیال اور ہم کار ضرور نکلی۔ خدا اسے قوم اور ملک کا زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع دے۔"

جلیل صاحب نے کہا "آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔۔۔۔۔ اور ہو بھی کیونکر سکتا تھا۔ کہ اس وقت ہم سب کا اکٹھا ہو کر مل بیٹھنا ایک اہم مقصد کے تحت تھا اور وہ مقصد صرف میری طرف سے والدین کے ان فرائض کی کوتاہی کے لیے معذرت سے تعلق رکھتا تھا۔ میری بیٹی واقعی کسی جمیلہ سے کم نہیں معلوم ہوتی لیکن میں نے اس کی کم سنی کے ناپختہ شعور سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے کسی نہ کسی بہانے تحریک آزادی میں عملی طور پر حصہ لینے سے روکے رکھا۔ کل ایک واقعہ نے میرے ضمیر کو کوسا تو مجھے یہ خیال آیا کہ اگر خود میرے پاس علمی زندگی کا سرمایہ نہیں تو غلطی کے اعتراف کی پونجی ضرور موجود ہے۔ چنانچہ اسی پونجی کو استعمال کرنے کی آج تقریب پیدا کی تھی جس میں شمولیت کے لیے جلیل صاحب نے اشارہ کرتے ہو کہا "ان عزیزوں کو بھی تکلیف دی تھی۔" ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا کیا یہ نوجوان زبیدہ کے حقیقی بھائی ہیں؟

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔ "حقیقی بھائی تو نہیں لیکن حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ درجے کے بھائی ہیں۔ اسی طرح یہ لڑکی بھی جس کا نام عزیزہ ہے، زبیدہ کی حقیقی بہن سے بھی بڑا درجہ رکھتی ہے یہ لڑکی عقیل اور کرامت کی بہن ہے۔"

ڈاکٹر نے سب لوگوں سے مل کر انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور جلیل صاحب کے اس فعل کی بہت تعریف کی جو اپنی بیٹی سے معذرت سے تعلق رکھتی تھی۔

زبیدہ بولی۔ "ابا جان! نے مجھے آج بہت شرمسار کیا۔"

زبیدہ کی والدہ بولی۔ "حفظ مراتب کا خیال کر کے تمہیں ایسا ہی کہنا چاہئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں کو اپنی اس بے جا سی محبت کا دلی افسوس ہوا ہے بہرحال اس کفارہ ادا

کے لیے اب کوئی بھی موقع پیدا ہوا تو تم دیکھو گی کہ ہم دونوں تمہاری پیروی کریں گے۔"

حمید الدین بولا۔ "آپ لوگوں کے یہ خیالات دلی عزائم کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ الجزائر کا کوئی گوشہ آزادی کے جذبہ سے خالی نہیں۔ مجھے جس آدمی سے ملنے کا موقع ملا اس کی زبان پر حصول آزادی کے لیے تڑپتی ہوئی پکار پائی۔ بہن زبیدہ نے مجھے تحریک آزادی کے مختلف واقعات سنانے کی فرمائش کی تھی۔ آج کی تعارفی ملاقات کے بعد میں کوئی موقع ضرور نکالوں گا۔ امید ہے کہ آپ حضرات بھی بصورتِ امن ہمارے گھر کو رونق بخشیں گے۔ ہمارا گھر دور نہیں صرف ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے جسے طے کرنے کے لیے شوق اور خلوص کی ضرورت ہے اور اس کی آپ کے ہاں کمی نہیں۔"

جلیل صاحب نے کہا۔ "برخوردار حالات بہتر ہو گئے تو ہم ضرور آئیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "قبلہ! میں دریافت کرنا بھول ہی گیا کہ عقیل، کرامت اور اس لڑکی کا کیا نام ہے ——— ہاں عزیزہ آپ کے رشتہ دار نہیں ہیں تو کیا آپ کی برادری میں بھی شامل نہیں"

"یوں تو نہیں۔" جلیل صاحب نے کہا۔ "لیکن اتفاقات نے جو ان سے ہمیں ملا دیا ہے تو اب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بشرطِ زندگی کبھی جدا نہ ہو سکیں گے ——— ہم کچھ روز بعد یا خود ان کے ہاں پہنچ جاتے ہیں اور یا انھیں بلا لیتے ہیں۔"

"اور ہاں یہ صاحبزادی" ڈاکٹر نے کہا۔ "غالباً ان کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ نومسلم ہیں۔ ان کی تفصیلی تعریف کیا ہے؟"

جلیل صاحب بولے۔ "ان کا تفصیلی تعارف اس اختصار میں چھپا ہوا ہے کہ یہ آج سے کئی سال پہلے فرانسیسی سکول کی طالبہ اور عقیل کی ہم جماعت تھیں۔ لیکن فرانسیسیوں کے ظلم و ستم سے نفرت کرنے کے بعد اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے لگیں اور اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئیں۔ ان کے مسلمان ہونے کا علم جب اس کے والدین اور لواحقین کو ہوا تو انھوں نے اسے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ یہ دیکھ کر ان

ہم نے اس سے کہا کہ انسان دروازے بند کر سکتا ہے مگر وہ قادرِ مطلق دروازے نہیں بند کر سکتا جس کی محبت میں تم نے اسلام قبول کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے اپنی بیٹی لیا ہے اور یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے زبیدہ کی بہن بننا قبول کر لیا ہے۔"

عائشہ بولی۔ "چچا جان! حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ لوگ فی سبیل اللہ میری جو خدمت کر رہے ہیں اس کا اجر تو اجر دینے والا ہی دے سکتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "عائشہ بیٹی! تمہارے اسلام لانے کے بعد تمہاری زبان ہی بدل گئی ہے۔ تمہاری زبان سے سبیل اللہ کے الفاظ تمہاری اسلام فہمی کا پتہ دیتے ہیں، خدا تمہیں اسلام کے احکام پر کماحقہٗ عمل درآمد کرنے کی توفیق بخشے۔"

سب نے آمین کہا اور پھر سیاست و سماج کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال شروع ہو گیا۔

حمید الدین طبعاً جہاد پسند نوجوان تھا اس لیے ہوٹل میں جب اسے زبیدہ کے مجاہدانہ خیالات سننے کا موقع ملا تو وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اسے یہ خیال آیا کہ کاش زبیدہ اس کی رفیقۂ حیات بن سکتی۔ آخر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ عقیل اور کرامت زبیدہ کے بھائی ہیں تو اسے امید کی کرن نظر آئی۔ لیکن آج جلیل صاحب سے یہ معلوم کر کے اس کے دل پر اداسی سی چھا گئی کہ عقیل اور کرامت زبیدہ کے بھائی نہیں اور ہو سکتا ہے کہ جس قسم کے گہرے مراسم کا تعلق جلیل صاحب نے عقیل اور کرامت کے ساتھ ظاہر کیا ہے انھوں نے زبیدہ کا رشتہ ان میں سے کسی بھائی کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہو۔ اس بیکار قسم کی اداسی کے دوران جب اس نے یہ سنا کہ عائشہ عقیل کی ہم جماعت رہ چکی ہے جس نے آخر کار اسلام قبول کر لیا تو اس کی حسرت امید افزا خوشی میں بدل گئی۔ اسے اب خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ عقیل کا رشتہ عائشہ کے ساتھ ہو جائے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ عائشہ کو شروع ہی سے عقیل کے ساتھ محبت ہو اور محبت ہی کی وجہ سے اس نے اسلام قبول کیا ہو۔

اس امید افزا خوشی کے قائم رہنے میں ابھی کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ ایک خیال کی وجہ سے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے اب یہ خیال آیا کہ زبیدہ کا رشتہ اگر عقیل کے ساتھ نہیں ہو سکتا تو کرامت کے ساتھ کہاں ناممکن ہے ـــــ

مجاہد حمید الدین بالآخر دل ہی دل میں ہنسا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "تمہاری جمعہ اور جمعہ آٹھ دن کی تو ان لوگوں سے ملاقات ہے اور یہ حال ہے کہ رشتے ناطے کی باتیں سوچ رہے ہو۔ تم بھی عجیب آدمی ہو" ـــــ لیکن فوراً بعد یہ خیال آیا کہ وہ زبیدہ کا خیال دل کیسے نکال سکے گا۔

آج حمید الدین نے تحریک آزادی کی تفصیل پر بہت مختصر روشنی ڈالی گفتگو کے دوران وہ غیر ارادی طور پر زیادہ تر زبیدہ ہی کی طرف مخاطب رہا۔

عقیل نے اس کی یہ بات پسند نہ کی چنانچہ ڈاکٹر اور مجاہد کے جانے کے بعد جب زبیدہ نے مجاہد کو خاص طور پر بلا کر تحریک کے تفصیلی حالات سننے کا شوق ظاہر کیا تو عقیل کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہو گئیں۔

۴۰

یہ دیکھ کر یورپی خفیہ دہشت پسند تنظیم کے بڑے سے بڑے حملے بھی، جن میں حکومت کی فوج اور پولیس کی مدد صاف شامل ہوتی ہے، الجزائری مجاہدین کے عزائم میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی، یورپی آبادکاروں نے ترک وطن کی رفتار تیز کر دی۔ انھیں ترک وطن کی طبعاً ضرورت نہ تھی لیکن وہ الجزائریوں کے آئینے میں اپنا منہ دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ جس طرح ان کی قوم الجزائریوں کے ساتھ اذیت دہ سلوک کر رہی ہے، آزادی مل جانے کے بعد الجزائری بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرینگے۔ حالانکہ الجزائری رہنما اپنے متعدد بیانات کے ذریعے یقین دلاتے رہے کہ ان کا سلوک مسیّوں کے ساتھ قابل رشک حد تک اچھا ہوگا البتہ موجودہ وقت میں الجزائری مجاہدین کا مقابلہ محض مدافعت کا درجہ رکھتا ہے۔"

لیکن یورپی آبادکاروں کو یقین ہی نہ آتا تھا اور وہ اپنی ملکیتیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگے چلے جا

رہے تھے۔ صرف پچھلے ہفتے پچاس ہزار سے زیادہ یورپی آبادکار الجزائر کو چھوڑ چکے تھے۔ آج کل ہر وقت یورپی آبادکاروں سے ہوائی اڈا بھرا رہنے لگا۔ حکومت کے ہوائی جہاز انھیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیرس پہنچاتے رہے مگر ہوائی اڈے پر ہجوم ذرا بھی ہلکا ہوتا معلوم نہ ہوا۔

الجزائر کی آزادی میں تھوڑا ہی عرصہ باقی رہ گیا۔ اس کے بعد الجزائر فرانس کے تسلط سے پوری طرح آزاد ہوجائے گا۔ الجزائر میں رہنے والے یورپی آبادکاروں کو یہ خوف لاحق ہوا کہ آزاد الجزائر کے دورِ حکومت میں ان کا جان ومال محفوظ نہ رہ سکے گا۔ کیونکہ ان کو اپنا نامہ عمل معلوم تھا کہ دہشت پسندوں کی کارروائی میں ان کی پوری مدد شامل ہے پھر جب مسلمانوں کو حکومت مل گئی تو وہ ان کو معاف نہ کریں گے۔ یہی خوف یورپی آبادکاروں کو دامن گیر تھا کہ حکومت مل جانے کے بعد یقیناً سرکاری سطح پر آزاد الجزائر کی طرف سے کارروائی ہوگی۔ چند یورپی آبادکاروں نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ ریفرنڈم ہوجانے کے بعد الجزائری مسلمان، یورپی آبادکاروں کی بستیوں میں گھس کر ایک ایک متنفس کو قتل کر ڈالیں گے۔

الجزائر کے یورپی آبادکاروں کو ہجرت کرنے سے حکومت اور خفیہ فوجی تنظیم دونوں نے بہت روکا مگر ان پر ذرا اثر نہ ہوا۔ آخر فوجی تنظیم نے ایک دن ہوائی اڈے کے ٹاور کو بم سے اڑا دیا۔ اس واقعہ کے بعد ہجرت کرنے والوں کی رفتار میں قدرے فرق آگیا۔

ادھر خفیہ فوجی تنظیم کو بھی یہ احساس ہوگیا کہ الجزائر پر سے فرانسیسی حکومت کا تسلط ختم ہوجائے گا۔ اسی لیے انھوں نے اگرچہ اپنے مظالم میں کمی نہ کی لیکن تنظیم کے ایک نوجوان رہنما نے تنظیم کے ارکان سے یہ اپیل کی کہ وہ الجزائر میں قتل و غارت کا سلسلہ ختم کردیں۔

یہ اپیل نوجوان رہنما نے جنرل جوہاڈ اور جنرل سالان کی اپیل کی پیروی میں ارکانِ تنظیم سے کی۔ اس سے پہلے جنرل سالان اور جنرل جوہاڈ نے محمد بن باللہ اور یوسف بن

خدہ سے بات چیت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس اظہارِ خواہش کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر عبوری حکومت انھیں عام معافی دینے کے ساتھ ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضامن ہوئی تو ان کی خفیہ تحریک اپنی انسانیت سوز سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دے گی۔

عبوری حکومت کی دفاعی کوششیں اور آزادی کے لیے ریفرنڈم کے انتظامات اپنی جگہ ہوتے رہے اور دہشت پسند اراکین اپنے رہنماؤں کی اپیلوں کے باوجود الجزائری مسلمانوں کی آبادی کو کم کرتے رہے۔

دوسرے شہروں کے علاوہ صرف الجزیرہ میں مسلمان شہیدوں کی تعداد مئی کے وسط میں چار سو سے اوپر پہنچ گئی۔ انہی دنوں تیس بتیس خواتین کو شہید کر دیا گیا۔ اس سے پہلے الجزائر کے مشہور شہروں کی غیر معمولی عمارتوں کو جلا ڈالا گیا تھا لیکن خفیہ فوجی تنظیم نے محکمہ شہری ہوا بازی کے دفتر کو بم پھینک کر گرا دیا۔

مئی کے آخری ہفتے میں گودی کے علاقے کے اندر اچانک فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ عبوری حکومت کی مسلمان پولیس نے امن و امان قائم کرنے کے لیے یورپی آباد کاروں پر گولی چلا دی جس سے دو یورپی مجروح ہوئے۔ فرانسیسی پولیس آئی جس نے یورپی سرپسند باشندوں کو رہا کر دیا اور علاقے کی ناکہ بندی کر دی۔

انہی دنوں بعض یورپی آباد کاروں نے یہ افواہ اڑا دی کہ الجزائر کے متعلق جنرل ڈیگال کا موقف بدل گیا ہے وہ عبوری حکومت بنانے کے باوجود اب الجزائر کو فرانس سے الگ کرنے کو تیار نہیں۔ اگرچہ یہ افواہ اپنے اندر کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی مگر چونکہ افواہ تھی اس لیے بجلی کی طرح ہر گوشے میں پھیل گئی لیکن انہی دنوں جنرل ڈیگال نے یہ اعلان کابینہ کے اجلاس کے بعد ان الفاظ میں کیا کہ "میں الجزائر کی آزادی سے متعلق کیے گئے وعدوں پر حرف بہ حرف قائم ہوں۔ میں ان پر پوری طرح کاربند رہوں گا۔ نیز دہشت پسند تحریک کو کچل دوں گا"

اس اعلان میں یہ الفاظ بھی موجود تھے کہ "اس بارے میں رائے عامہ خواہ کچھ بھی ہو

میں نے جو فیصلہ سوچ رکھا ہے اس سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹوں گا۔"

خفیہ فوجی تنظیم مظالم ختم کرنے کا ارادہ کرنے کیساتھ ہی یہ بھول جاتی کہ وہ انسان نہیں بچھو ہیں اور ان کی عادت ڈسنے کی ہے، چنانچہ حملے ختم کرنے کے فوراً بعد رجون کے پہلے ہفتے میں) انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ جنرل ڈیگال کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ خفیہ فوجی تنظیم کے ان دس ارکان کو گرفتار کرلیا گیا جو جنرل ڈیگال کو قتل کرنے نکلے تھے۔ ایک مجسٹریٹ نے ان پر ارادۂ قتل اور مملکت کے خلاف سازش کے الزامات عاید کیے۔ دس آدمیوں کا قائد ۲۵ سالہ نوجوان تھا جو مدت سے جنرل ڈیگال کی جان کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اب کہیں جاکر اپنی جماعت سمیت گرفتار ہوا۔ تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے صدر ڈیگال کو قتل کرنے کے کئی ایک منصوبے بنائے ہوئے تھے مگر کسی منصوبے میں اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی یہ اس کا آخری منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے دوران ہی اسے گرفتار کرلیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد خفیہ فوجی تنظیم کے کارکن پہلے سے زیادہ مشتعل ہوگیے اور یورپی آبادکاروں کی خیر سگالی کے برتاؤ کو دیکھ کر جو انھوں نے الجزائری مسلمانوں سے کرنا شروع کردیا تھا، بے حد برہم ہوگیے اب انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ یورپی آبادکاروں کا بھی قتلِ عام شروع کردیا۔ سرکاری عمارتوں کے علاوہ سکولوں، مکانوں، دکانوں اور دوسری عمارتوں پر بم پھینک کر فوجی تنظیم کے ارکان اپنی بھڑاس نکالتے رہے۔ موٹر کاروں پر بھی بم پھینک کر سواریوں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا۔ عبوری حکومت نے ان دہشت پسندوں کی کارروائیوں کو ختم کرانے کی انتہائی کوشش کی مگر انھیں زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

خفیہ فوجی تنظیم نے انسانوں کو ختم کرنے کے بعد فوجی اور اقتصادی اہمیت کے مقامات کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے صحرائے اعظم میں تیل کے کنوؤں پر حملے شروع کردیے۔ بموں کے دھماکوں سے ایک کنوئیں کو پوری طرح تباہ کردیا۔ اسی طرح کئی ایک فوجی اڈوں پر بم پھینک پھینک کر فوجی آبادی کو ویرانے میں تبدیل کردیا۔ لطف

کی یہ بات کہ الجزائر میں مدافعت کے دقت تین فرانسیسی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تو الجزائر کے پچیس ہزار طالب علموں نے احتجاج کے طور پر پورے دن کی ہڑتال کر دی۔

شہر قسطنطین سے ۳۶ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں یسر میں مسلمانوں کی بے شمار لاشیں برآمد ہوئیں جنھیں قتل کے بعد گاؤں کے ایک کھیت میں دبا دیا گیا تھا۔ ان کی صرف کھوپریاں باقی رہ گئی تھیں۔ تلاش اور جستجو کے بعد چار سو کے قریب کھوپریاں ملیں۔

اس موقع پر ایک سفید رنگ کے آدمی کو جو فرانسیسی معلوم ہوتا تھا، کھوپریوں پر عورتوں کی طرح آنسو بہاتے دیکھا گیا۔ الجزائری یہ سمجھے کہ کوئی فرانسیسی ہوگا جو اپنے کسی عزیز کے قتل پر آنسو بہا رہا ہے۔ جب اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

" مجھے یہاں اتفاقات لے آئے ہیں اور ان کھوپریوں کو دیکھ کر چند پرانے واقعات تازہ ہو گیے ہیں۔

یہ مارچ ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب کہ میں الجزائر میں مقیم فرانسیسی فوج میں ملازم تھا۔ جس روز میں الجزائر کے مشرقی صوبے قسطنطین میں پہنچا تو دیکھا کہ پانچ امن پسند شہریوں کو محض اس الزام میں زندہ جلا دیا گیا کہ انھوں نے محاذ آزادی کے رضا کاروں کو اسلحہ فراہم کیا تھا۔ اس مہینے میں چند سپاہیوں کے ساتھ ٹرک میں سوار مقامی قبرستان کی طرف ایک کپتان کی قبر پر کتبہ لگانے کے لیے جا رہا تھا کہ ہمارے ٹرک کے سامنے یکایک ایک گدھا آ گیا۔ ڈرائیور نے زور سے بریک لگائی اور پھر دو فرانسیسی سپاہی چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹامی گنیں تھیں۔ گلی میں جتنے بھی لوگ نظر آ رہے تھے، سب کے سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھے لیکن گدھے کا مالک دیوار کے ساتھ لگا کھڑا رہا فرانسیسی سپاہی تیز رفتاری کے ساتھ گدھے کے مالک کی طرف بڑھے ان میں سے ایک نے بندوق کی نالی گدھے کے مالک پر زور سے ماری جس سے اس کی پیشانی سے سرخ سرخ خون چشمے کی طرح

بہنے لگا۔ اسے اف تک کرنے کی مہلت نہ ملی اور زمین پر لوٹنے لگا۔ اس انسانیت سوز منظر میں شامل ہونے کے لیے تین اور فرانسیسی وہاں پہنچ گئے جنھوں نے زخمی عرب پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ تھوڑی دیر بعد عرب کے کراہنے کی آواز سنائی دی لیکن یہ آواز فرانسیسی سپاہیوں کے قہقہوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

آخر جب وہ عرب بالکل بے ہوش ہو گیا تو ایک فرانسیسی سپاہی نے اپنی سنگین کو اوپر اٹھایا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا عرب کا سر کچلا جا چکا تھا۔ میں ایک بہادر سپاہی ہوں فرانسیسی فوج میں ملازم ہونے کے بعد اصولی طور پر یہی کر سکتا تھا کہ حکومت کی پالیسی کے مطابق عربوں اور الجزائریوں کو ختم کر دیتا لیکن بربریت کا مظاہرہ کبھی نہ کرتا۔ میں نے اس سے پہلے دہشت اور بربریت کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لیے میرے سارے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ میں نے فرانسیسی سپاہیوں کے قہقہے سنے تو جی چاہا کہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لوں۔ گدھے کے مالک کے متعلق ایک سپاہی نے قہقہوں پر قابو پانے کے بعد کہا: ”یہ بھی غالباً باغیوں کا ایک ساتھی تھا۔“

اس واقعے کے تین چار روز بعد میں نے ایک فرانسیسی افسر سے یہ کہتے سنا کہ باغیوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انھیں خوف زدہ کریں۔ ان کے ساتھیوں کو اذیتیں پہنچائیں۔ اگر ہم نے ذرا بھی نرمی کا سلوک کیا تو ان کے باغیانہ رجحانات شدید سے شدید تر ہو جائیں گے۔

اس نے سرد آہ کھینچ کر کہا: ”ایک اور واقعہ سنیے ایک بیرک اس کمپاؤنڈ سے ملحق تھی جہاں مسلمانوں کو اقبالِ جرم کرایا جاتا تھا۔ میں اپنی اس بیرک میں بیٹھا اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے رات کا کتنا ہی حصہ گزر گیا۔ میں تین بجے سو سکا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ چیخوں کی کرخت اور دلخراش آوازوں نے بیدار کر دیا۔ میرے ساتھی بھی جو گہری نیند سو رہے تھے۔ یہ آوازیں سن کر جاگ اٹھے۔ ہم نے جاگنے کے بعد یہ دیکھا کہ کچھ فاصلہ

میں عربوں کو دیوار کے ساتھ آمنے سامنے کھڑا کیا گیا تھا ان کے پیچھے کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ فرانسیسی سپاہیوں نے ایک عرب کے بازوؤں کو سنگینوں کے ساتھ کچلنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے دردناک چیخ نکلی لیکن ان چیخوں کے جرم میں اس عرب کی گردن پر فرانسیسی سپاہیوں نے اتنے زور کی ضرب لگائی کہ اس کی چیخیں خود بخود بند ہو گئیں۔

پہلے عرب کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا دیکھ کر دوسرے عرب خوف سے تھر تھر کانپنے لگے صرف دو نوجوانوں نے فرانسیسی سپاہیوں کی طرف نفرت کی نظر سے دیکھا، بلکہ ان میں سے ایک نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا "فرانسیسی درندو! تمہاری سفاکی ہمیں خوف زدہ نہیں کر سکتی تم مطمئن رہو کہ الجزائر آزاد ہو کر رہے گا خواہ اس کی بنیاد ہماری ہڈیوں سے بنے۔"

اس پر ایک فرانسیسی سپاہی نے بندوق کی نالی اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اسکے منہ سے بے اختیار فلک شگاف چیخ نکلی۔ اس چیخ کے بعد وہ چلا کر کہنے لگا "وحشیو! تم سے ان مظالم کا انتقام آنے والی نسلیں ضرور لیں گی۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب——"

دوسرے سپاہیوں کی سنگینوں نے اس کی آواز مکمل نہ ہونے دی کیونکہ سب سنگینیں اس کے سینے میں اتر چکی تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر ایک اور عرب نے لپک کر ایک فرانسیسی سپاہی کی گردن دبوچ لی لیکن گردن دبوچنے والے کے جسم کو بھی سنگینوں نے چھلنی کر دیا۔ وہ عرب کراہتا ہوا نیچے گرا۔ اگرچہ اس کی موت میں کوئی وقفہ نہ تھا لیکن سپاہیوں نے سنگینیں اس بے بس انسان کی آنکھوں میں گھونپ دیں۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد انگریز تھوڑی دیر کے لیے ساکت ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے اشکوں کو بہنے سے روک رہا ہے۔ آخر میں اس نے کہا۔

"مجھے فوج میں شامل ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میں قیدیوں کے ایک کیمپ کے پاس آمد و رفت کی نگرانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا جس دن کا میں ذکر کرنے والا ہوں اس دن گرمی کی وجہ سے گلیاں اور سڑکیں ویران اور اجاڑ نظر آ رہی تھیں۔ ایک چھوٹے

سے مکان سے اچانک ایک کم عمر لڑکا نکلا اور بغیر سوچے سمجھے ایک سمت کو بھاگنے لگا۔ اسکے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ میں اس کے خوف کی وجہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے قریب دو فرانسیسی سپاہیوں نے اسے پکارا۔ وہ لڑکا چونکہ دور جا چکا تھا اس لیے آواز نہ سن سکا ایک سپاہی نے غصے میں آکر رائیفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ گولی چلی اور دوسرے ہی لمحے وہ لڑکا زمین پر تڑپتا نظر آیا۔

میں بھاگتا ہوا تڑپتے ہوئے لڑکے کے پاس پہنچا۔ اس کا چہرہ خون آلودہ تھا۔ اس نے میری طرف نظر اٹھائی۔ اس کے ہونٹ کچھ ہلے، اس نے کہا: "میری بہن کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور میں ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے جا رہا تھا۔"

بس وہ یہی کہہ سکا۔ اس کے بعد موت نے اس کو مزید کچھ کہنے کی اجازت نہ دی۔

میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ میری روح چیخ اٹھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: "کیا ہم انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟" میں نے پلٹ کر فرانسیسی سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا: "کیا معصوم بچے کو قتل کرنا بھی تمہارے فوجی فرائض میں داخل تھا؟"

یہ کہہ کر میں ایک طرف کو چل دیا اور سوچنے لگا کہ کیا میرے دل سے چشم دید واقعات کا دکھ محو ہو سکے گا؟ ... ہرگز نہیں۔

انگریز کی کہانی سننے والے انگریز کا دل بن گئے۔ اور ان سب دلوں نے دھڑکنا شروع کر دیا۔

۴۱

کرامت گھر آیا تو اپنے بھائی عقیل سے کہنے لگا۔ "بھائی جان! آپ نے اخبار نہیں پڑھا؟"

عقیل نے جواب دیا۔ "نہیں۔ ابھی اخبار آیا ہی نہیں۔"

کرامت نے کہا۔ "میں بازار میں پڑھ کر آیا ہوں۔ اس میں ایک عجیب خبر چھپی ہے۔ دہشت پسندوں نے اپنی تنظیم سے غداری کے الزام میں بارہ یورپی آبادکاروں کو قتل کر دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں آج ۵ جون ہے اور آج سے ۲۶، ۲۷ دن کے بعد الجزائر کو انشاءاللہ آزادی مل جائے گی لیکن دہشت پسندوں کو یہ خیال نہیں آتا کہ چند روز بعد ان سے بدلہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ یورپی دہشت پسندوں نے الجزائر میں حریت پسندوں کو اپنے خفیہ ریڈیو کے ذریعے یہ الٹی میٹم دیا ہے کہ اگر ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر ان سے سمجھوتے کے لیے مذاکرات نہ کیے گئے تو وہ قتل و غارت گری کی مہم ایک بار پھر شروع کر دیں گے۔

بھائی جان! اس سے صاف ظاہر ہے کہ یورپی دہشت پسندوں کو اب یقین ہوگیا ہے کہ الجزائر ان کے ہاتھ سے گیا۔

عقیل نے کہا: "اور کیا ـــــــــ ان سے الٹی میٹم اپنی جانوں کی خیر منانے کے سوا کچھ مطلب نہیں رکھتے۔ حالات ان کے سامنے ہیں ایجنسی فرانس پریس کی اطلاع کے مطابق الجزائر کی عبوری انتظامیہ نے تمام رائے دہندگان سے اپیل کی ہے کہ یکم جولائی کے استصواب رائے کے لیے الجزائر کے باشندے فوراً اپنے نام درج کرالیں اور الجزائر میں مقیم رائے دہندگان کے لیے نام درج کرانے کی آخری تاریخ کل ۷ر جون مقرر کی گئی ہے۔ کل رات کے بارہ بجے تک نام درج کرائے جاسکیں گے۔"

کرامت نے کہا: "مگر بھائی جان! یورپی آبادکاروں کی بے سمجھی ملاحظہ کیجیے، بجائے اس کے کہ وہ ووٹروں میں اضافے کا باعث ہوں، انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں بھاگنا شروع کردیا ہے۔ آج الجزیرہ سے دو ہوائی جہاز روانہ ہونے والے تھے۔ اس مہینے ۱۸ جہاز الجزائری بندرگاہوں سے فرانس کی طرف پرواز کرنے والے ہیں ان میں سے ۳ آج روانہ ہوچکے ہیں۔"

عقیل بولا: "بھئی یہ یورپی آبادکار بے سمجھ نہیں۔ وہ اگر الجزائر میں مقیم رہیں تب بھی اکثریت نہیں بن سکتے۔ اس لیے وہ سوچتے ہیں کہ اپنی جانیں بچانے کے لیے ان کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت فرانس ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے خود ہی انھیں فرانس لے جانے میں زیادہ سے زیادہ مدد دے رہی ہے۔"

ابھی یہ فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، دیکھا تو جلیل صاحب تھے۔ اجازت لے کر مکان میں آئے۔ عقیل اور کرامت بڑے احترام سے ملے۔ سب مل کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے، کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے پوچھا: "عزیزہ کہاں ہے؟"

عقیل نے جواب دیا۔ "ہمسایے کے گھر۔"

جلیل صاحب بولے۔ "اچھا ہوا کہ وہ گھر میں نہیں، کیونکہ میں اس کی غیر حاضری ہی میں ایک بات کہنا چاہتا تھا۔"

"فرمائیے چچا جان!" دونوں نے ادب کے ساتھ کہا۔

"کہنا کیا ہے، ایک سوال لے کر آیا ہوں۔"

عقیل بولا۔ "چچا جان! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

کرامت بولا۔ "چچا جان! آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔"

جلیل صاحب بولے۔ "بھئی یہ موقع سوال کرنے ہی کا ہے۔ باقی تم دونوں کی طرف سے عزت افزائی تمہاری نیکی اور سعادت کی دلیل ہے ——— میں نے شاید ذکر کیا تھا کہ میرا ایک بھتیجا ہے چونکہ میرا کوئی لڑکا نہیں اس لیے اسی کو اپنا لڑکا بنا رکھا ہے۔ آج شام وہ تیونس سے صرف دو روز کے لیے آ رہا ہے۔ اس کے بعد عوران میں چلا جائے گا اور پھر چھ ماہ بعد واپس آ کر میرے پاس رہنے لگے گا۔ وہ تاجر باپ کا لڑکا ہے اور عوران میں تجارت ہی کی غرض سے لیے جا رہا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ چھ ماہ بعد یہیں الجزیرہ ہی کو تجارتی مرکز بنا لے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ہمارے ہاں چلو تاکہ تم سب اس کے مزاج اور خیالات سے واقف ہو سکو ——— اگر تم اسے پسند کرو تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں اس کے لیے عزیزہ کو مانگ لوں۔"

کرامت نے عقیل کی طرف دیکھا اور عقیل نے جواب دیا۔ "چچا جان! آپ ہمیں خواہ مخواہ گستاخ کیوں بننے کا موقع دے رہے ہیں۔ ہم اور ہماری ہر چیز پر آپ کا پورا اختیار ہے۔ ہم میں سے جس کسی سے آپ کوئی کام لینا چاہیں، کان سے پکڑ کر لے سکتے ہیں۔"

جلیل صاحب کو مذاق سوجھا۔ انھوں نے چور مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم دو شیطانوں کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ تم فکر نہ کرو تم کو بھی کان سے پکڑ کر الگ الگ زنجیر میں باندھ دوں گا . . . . فی الحال میں تم دونوں کی عزت افزائی سے بہت خوش

ہوا ہوں، اب تم دونوں ہمارے گھر پہنچنے کی تیاری کرو۔"

عقیل اور کرامت دونوں شرم کی وجہ سے موضوع بدلنا چاہتے تھے۔ چنانچہ عقیل نے فوراً کہہ دیا "چچا جان! ہم آپ کے ہاں نہیں آتے بلکہ آنے والے مہمان کو ہم کھانے پر مدعو کریں گے۔ کل دوپہر کا کھانا ہمارے ان دیکھے بھائی کو ہمارے ہاں کھانے دیجئے ظاہر ہے کہ انکو راستہ دکھانے کیلئے آپ سب کو ہمرہ آنیکی تکلیف کرنی پڑے گی! امید ہے آپ ہماری درخواست نامنظور کرکے ہمارا دل نہیں توڑیں گے۔

کرامت بولا "چچا جان! یہ تجویز بہت اچھی ہے۔ امید ہے آپ انکار نہیں فرمائیں گے۔"

جلیل صاحب بولے۔ "بھئی یہ تکلفات بہت بڑی زیادتی ہے۔"

کرامت بولا۔ "چچا جان! آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمیں اپنی کمزوریوں، اپنی خطاؤں، اپنے گناہوں اور اپنی زیادتیوں کا ہمیشہ سے اعتراف رہا ہے۔ اس لیے ہم تو اپنی ان عادات کو ترک نہیں کر سکتے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ ہماری درخواست قبول فرمالیں۔"

جلیل صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر کہنے لگے۔ "بہت اچھا میں تم لوگوں کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ خدا کو منظور ہوا تو ہم سب کل صبح جلد از جلد پہنچ جائیں گے۔ دعا کرو کہ میرا بھتیجا خیر بخیر و عافیت ہمارے ہاں پہنچ جائے۔ ۔ ۔ لو بھئی اب میں چلتا ہوں۔"

عقیل نے کہا۔ "چچا جان! آپ کچھ کھائے پیے بغیر نہ جائیں گے۔"

کرامت نے کہا۔ "صرف ایک منٹ بیٹھئے۔"

جلیل صاحب بولے۔ "بھئی یہ تکلفات ——"

اور کرامت نے بات کاٹ لی۔ "اس کے متعلق تو پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ ہمیں اپنی زیادتیوں کا ——"

جلیل صاحب قہقہہ لگا کر کرسی پر بیٹھ گئے اور دو چار منٹ میں ان کے سامنے تپائی پر بہت سے پھل آگئے جنھیں تینوں نے اِدھر اُدھر کی خوشگوار باتوں میں مصروف رہ کر ختم کر دیا۔ اس کے بعد جلیل صاحب مکان سے نکلے ہی تھے کہ عزیزہ آگئی۔

"بھائی جان! کیا کوئی مہمان آیا تھا؟ یہ چھلکے کہاں سے کوڑے ہیں۔"

کرامت نے کہا۔ "مہمان تو نہیں کہنا چاہیئے انھیں، وہ تو ہمارے اور تمہارے پیارے چچا جان تھے جلیل صاحب!"

عزیزہ نے کہا "آپ نے مجھے بلوا کیوں نہ لیا۔۔۔۔ وہ کیسے آئے تھے؟"

عقیل بولا۔ "بھئی وہ جلدی میں تھے، تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ کہنے یہ آئے تھے کہ ان کا بھتیجا آج شام کو آرہا ہے۔ اس لیے ہم ان کے ہاں دو دن گزارنے کے لیے چلے جائیں۔ کیونکہ وہ دو ہی دن کے لیے آیا ہے۔۔۔ لیکن ہم نے خود سب کو کل دن کے کھانے پر بلا لیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب کل صبح ہمارے ہاں آرہے ہیں۔" عزیزہ نے توثیق کرانے کے انداز میں پوچھا۔

اور کرامت نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں سب آرہے ہیں زبیدہ، عائشہ اور انکے والدین بھی۔"

"عزیزہ کو شرارت سوجھی کیا عائشہ بھی"

کرامت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں اور زبیدہ بھی۔"

عقیل نے کھڑے کھڑے چور آنکھ سے بھائی بہن کو دیکھا اور ان کا قہقہہ نکل گیا۔ "تم فضول باتوں کو چھوڑو اور یہ سوچو کہ کل کا مینو کیا ہونا چاہیئے۔"

عزیزہ نے کہا۔ "بھائی جان! میں آج خوب سوچ سمجھ کر ایسا مینو تیار کروں گی کہ آپ بہت خوش ہوں گے۔ بس آپ نمازِ مغرب کے بعد مجھ سے لے لیجے گا، اس سے پہلے نہیں۔"

عقیل نے کہا۔ "ہم تو دونوں اس وقت سکول کے اجلاس میں جا رہے ہیں۔ شام سے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر دونوں بھائی مکان سے نکل گئے اور عزیزہ کواڑ بند کر کے فنِ رقص جانے بغیر بے تکا

رقص کرنے لگی، یہ رقص اس کی اس خوشی کو اجاگر کر رہا تھا جو جلیل صاحب کے بھتیجے کی آمد کی خبر سے اس کے دل میں سما نہ رہی تھی۔ اچانک اسے کسی کی ایک مسلسل غزل یاد آگئی جسے اس نے اپنے رقص میں شامل کر لیا۔

مری کٹیا میں کل کون آ رہا ہے　　سماں مجبوب ہوتا جا رہا ہے
سندیسہ سن لیا لیکن ابھی تک　　مرا دل ہے کہ دھوکا کھا رہا ہے
یہ کٹیا بے کسی کا جو نشاں تھی　　اک اک ذرہ اب اس کا گا رہا ہے
در و دیوار بدلے جا رہے ہیں　　یہ گھر خلدِ بریں کہلا رہا ہے
جو دل چوٹیں مسلسل کھا رہا تھا　　اسی دل کو کوئی سہلا رہا ہے
مری آنکھوں کا زینہ کر کے روشن　　مرے دل میں اترتا آ رہا ہے

مری کٹیا میں کل کون آ رہا ہے
سماں مجبوب ہوتا جا رہا ہے

اب اس نے رقص کرتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے اس کا محبوب آ گیا ہو۔

وہ کیا آئے کہ دل شرما رہا ہے　　جو گھبرایا نہ تھا، گھبرا رہا ہے
چمک آنکھوں کی غائب ہو رہی ہے　　جگر چیر کے پہ چرکا کھا رہا ہے
کیے جاتی ہے گویائی کنارا　　سکوت احوال کہتا جا رہا ہے
ہنسی ان کے لبوں پر کھیلتی ہے　　مرے دل کا کنول کملا رہا ہے

"وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے"

مری کٹیا میں کل کون آ رہا ہے ——

اس غزل کے بعد بھی وہ مسلسل ناچتی رہی، اسے اپنے نشے میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی ہمسائی سہیلی جس کے پاس وہ گئی تھی ساتھ کی دیوار پھاند کر اس کی بے خودی کی یہ کیفیت مزے

سے دیکھ رہی ہے ۔ ناچتے ناچتے جب اس کی نظر کھڑکی کی اوٹ میں پڑی تو اسے دوپٹہ نظر پڑا ۔ یہ دیکھ کر اس کا سلا نشہ ہرن ہوگیا ۔ وہ آگے بڑھی تو اس کی سہیلی کھڑی تھی ۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس کو بھی اس کمرے میں لے آتی ۔ چنانچہ پہلی نشیلی کیفیت میں سرشار رہ کر اس نے اپنی سہیلی نجمہ کا بازو پکڑا ! اور اس کو ساتھ ملا کر وہ پہلے والا بے تکا ناچ ناچنے لگی ۔ اس نے ناچ ہی کے دوران اس خوشی کا سبب پوچھا تو عزیزہ نے پہلے والی مسلسل غزل پڑھ کر سارا مطلب سمجھا دیا ۔

پھر جب دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بازو ڈال کر کوچ پر گریں تو نجمہ نے پوچھا "واقعی کل آرہا ہے ؟"

اس نے اپنی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کر کے کہا "ہاں —— ہاں کل ان لوگوں کی دعوت ہے ، بہت بڑھیا دعوت —— بڑی معیاری دعوت —— میں تو اپنا دل چیر کر ایک پلیٹ میں رکھ دوں گی ۔"

نجمہ نے پیچھے ہو کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا ۔ "عزیزہ ! مجھے اس سے پہلے تو تم نے بتایا نہیں اور آج اچانک مچل اٹھی ہو ۔"

عزیزہ نے کہا "مصیبت تو یہ ہے کہ مجھے بھی اچانک علم ہوا ہے ۔"

"اچھا ! اس کا نام کیا ہے ؟"

"معلوم نہیں ۔"

"اس کی شکل کیسی ہے ؟"

"یہ بھی معلوم نہیں ۔"

"اس کی عقل کیسی ہے ۔" سہیلی نے مذاق کیا ۔

"بہت اچھی ہے —— بے حد اچھی ۔"

"خوب اس کو دیکھا تک نہیں اور اس کی عقل بھی معلوم ہوگئی ہے ۔"

"اس لیے کہ معتبر ذرائع نے بتایا ہے ۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے اس کی فوٹو بھی نہیں دیکھی۔"

دیکھی کیوں نہیں ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔"

"بن دیکھے کی محبت بھی میں نے آج ہی دیکھی ہے۔ اس سے پہلے نہ دیکھی نہ سنی۔ کہیں دھوکا نہ کھا جانا تم۔"

"کیا تم نے آزادی دیکھی ہے۔"

"نہیں۔"

"کیا آزادی کی تمہیں خواہش نہیں؟"

"ہے ضرور۔"

"بس اسی طرح میں بھی بن دیکھے ایمان لے آئی ہوں۔ یہ سمجھو وہ میرے لیے الجزائر کی آزادی ہے۔"

"تم بڑی وکیل بن گئی ہو۔ وہ بھی ضرور کوئی وکیل ہوگا۔"

"نہیں وہ وکیل تو نہیں۔ ۔ ۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔"

"تو اور کیا ہے وہ؟"

"محبوب۔"

اس کے بعد دونوں سہیلیاں قہقہہ زن ہو گئیں۔

عزیزہ نے کہا۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ سے آج بہت بڑی غلطی ہوئی۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے بھائیوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ نمازِ مغرب تک کل کی دعوت کا مینو پیش کر دوں گی۔"

"تو اس میں مشکل کیا ہے؟"

"مشکل یہی کہ سخت مصروف ہوں۔ میرے پاس فارغ وقت ہی کوئی نہیں۔"

"کیا مصروفیت ہے تمہیں۔"

"یہی کہ اس کے خیالوں میں محو ہوں۔ اس کا خیال فرصت ہی نہیں دیتا۔"

"بھئی مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے محبوب کا خیال بڑی تند قسم کی شراب ہے۔ تمہارا نشہ ہی نہیں اترتا۔"

"لو بھئی اتر گیا نشہ۔ آؤ نا ذرا اِدھر" عزیزہ سہیلی کو میز کے قریب لے آئی۔ کاغذ نکالا اور پن سے لکھنے لگی۔ "بتاؤ بھئی نجمہ کل کے کھانے میں کیا کیا ہونا چاہیے۔"

"ایک تو ہونا چاہیئے تمہارا دل ۔۔۔۔۔۔ تم پہلے ہی شامل کر چکی ہو اپنے مینو میں؟"

عزیزہ نے شرارت سے پوچھا۔ "اچھا اور؟"

"اور جگر کے سلیقے سے کٹے ہوئے ٹکڑے۔"

"بھئی چھوڑو نا اب اپنے مذاق کو، مجھے ٹھیک ٹھیک مشورہ دو۔ مجھے ڈر ہے بھائی آ گئے تو میں انھیں کیا جواب دوں گی۔"

"دھوپ چھائی ہوئی ہے۔ ابھی شام ہونے میں دو تین گھنٹے باقی ہیں اور تمہیں بھائیوں کے آنے کا خوف لاحق ہے۔"

"اس لیے کہ مجھے اپنے آپ پر اعتبار نہیں کہ دو یا تین گھنٹے میں مینو تیار کر سکوں گی۔"

"اچھا تو پھر لو دِل اور جگر کے علاوہ ایک تو ہونا چاہیئے ـــــ بھلا کیا؟"

عزیزہ نے نجمہ کے سر پر ہلکا سا تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "بھلا کیا" کہنے کے لیے تو میں نے تمہیں نہیں بلایا۔"

"بلایا کہاں ہے نگوڑی تم نے مجھے۔" اس نے کہا۔ "وہ تو اتفاق سے میں خود ہی آ گئی تھی۔"

عزیزہ نے کہا "اچھا میں معافی مانگتی ہوں، اب بتاؤ کہ مینو کیا ہونا چاہیئے تمہیں میری قسم اب سنجیدہ ہو جاؤ"۔

نجمہ نے کہا "تم بھی عجب لڑکی ہو۔ محبوب تمہارا آرہا ہے اور مینو مجھے سوجھے۔ میں تو کہتی ہوں کہ سلائیس کے ساتھ آلوؤں کا شوربہ رکھ دینا۔ اور بعد میں میٹھی ڈش کے لیے تھوڑی ہی مٹھاس رکھ دینا ـــــ یعنی تھوڑی سی چینی"۔

"چلو ہٹو"۔ عزیزہ نے شرارت آمیز خفگی میں کہا "تمہیں خیال ہونا چاہیئے کہ مہمانوں کے لیے کیا اتنا مینو مناسب رہے گا"۔

نجمہ نے کہا "میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ مینو چاہیئے اس سے بھی کم اور معمولی کیوں نہ ہو، تمہاری موجودگی میں تمہارے اپنے مہمان کو وہ بہت بڑھیا اور معیاری معلوم ہوگا"۔

عزیزہ نے زور سے گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا "تم اب مہربانی کر کے چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ میں خود سوچ کر مینو بناتی ہوں"۔

"بہت بہتر"۔ نجمہ نے جواب میں کہا "میں ایک کام سے ہو آؤں۔ تم مینو تیار کر لو۔ پھر جب میں آؤں گی تو ڈسکس (Discuss) کریں گے۔

نجمہ اپنے گھر گئی تو بیس بائیس مرتبہ کاٹ چھانٹ کر عزیزہ نے یہ مینو بنایا۔

۱۔ بھنی ہوئی مرغیاں

۲۔ شامی کباب

۳۔ سیخ کباب

۴ قورمہ

۵۔ سبزی

۶۔ پاکستانی سفید دال

۷۔ کسٹرڈ مصنوعات

۸ - آئیس کریم۔

نجمہ اپنے گھر دو گھنٹے لگا کر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے آس پاس پھٹے ہوئے کاغذوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے اور صرف ایک کاغذ جس پہ طے شدہ مینو درج تھا اس کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس مینو پر غور خوض کرنے کے لیے اس کی نگاہیں اس قدر یک سوئی کے ساتھ جمی ہوئی تھیں کہ اسے نجمہ کے آنے کا بھی علم نہ ہو سکا۔ یہ نقشہ دیکھ کر نجمہ بے پاؤں واپس اپنے گھر کیمرہ لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو عزیزہ اسی کیفیت میں مبتلا تھی۔ نجمہ نے ذرا فاصلہ پر کھڑے ہو کر اس انداز سے فوٹو کھینچی کہ اس میں علاوہ عزیزہ کے اس کے اِرد گِرد گرے ہوئے تمام کاغذ آ گئے۔ فوٹو لینے کے بعد وہ عزیزہ کے سامنے اس انداز میں آئی جیسے اس نے کوئی فوٹو کھینچی ہی نہیں بلکہ کھینچنے کا ارادہ ہے۔ عزیزہ نے چونک کر کہا۔

"اتنی دیر بعد آئی ہو"

نجمہ بولی۔ "میں نے دیر قصداً لگا دی کیونکہ میں جانتی تھی کہ تمہیں مینو تیار کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہو گا"

"میں نے دیر تو نہیں لگائی"۔ عزیزہ نے کہا۔

نجمہ نے فوراً جواب دیا۔ "کیا یہ بکھرے ہوئے کاغذ اس بات کی دلیل نہیں کہ تم نے مینو تیار کرنے میں کتنی دیر لگائی"

عزیزہ نے کہا۔ "اف! میرا راز کھل گیا۔ اچھا اپنی اس بکواس کو چھوڑ کر اس مینو کی طرف توجہ کرو"

نجمہ نے ایک نظر مینو پر ڈال کر کہا۔ "اسے کہتے ہیں ان دیکھے محبوب سے انتہائی محبت"

عزیزہ نے خوش ہو کر پوچھا "کیا واقعی یہ مینو تمہیں پسند ہے؟"

"ہاں"۔ نجمہ نے کہا "بہت پسند آیا ہے مگر ایک مد باقی رہ گئی ہے —— ایک تو مدات کے کل نمبر معقول قسم کے ہند سے پر ختم ہونے چاہئیں۔ دوسرے ایک ضروری مد جو تم چھوڑ

گئی ہو تمہاری بے خودی کا پتہ دیتی ہے۔"

عزیزہ نے فکرمند ہو کر کہا۔ "وہ کونسی مد؟"

اور نجمہ نے جواب میں کہا۔ "پانی کی۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگیں اور پھر عزیزہ اپنے مینو کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "میں یہ مینو بھائیوں کو دکھاؤں گی تو وہ بہت خوش ہوں گے۔"

دوسری صبح نماز ادا کرنے کے بعد عزیزہ نے یہ دعا بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ مانگی کہ جلیل صاحب کا بھتیجا گھر آ چکا ہو اور آج دوسرے مہمانوں کے ساتھ وہ بھی بخیر و عافیت دعوت میں شامل ہو جائے۔ اس نے رات ہی کو گھر کی مزید صفائی کر لی تھی مگر صبح کی نماز کے بعد بھی اس کمرے کو خاص طور پر نئے سرے سے صاف کرنا شروع کر دیا جو شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔

آج کی مہمان نوازی کے لیے ایک باورچن کو خاص طور پر بلایا گیا جس کے ذمے مینو کے مطابق مختلف کھانے تیار کرانے کا کام تھا اور وہ صبح ہی صبح ساری چیزیں خرید لانے کے بعد ان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو چکی تھی۔

مکان کی صفائی کے بعد عزیزہ نے غسل کیا اور غسل کے بعد جب وہ کپڑے بدلنے لگی تو شرما گئی۔ "یہ کپڑے زیادہ شوخ رنگ کے ہیں۔" اس نے ہلکے رنگ کا سوٹ بدلا۔ "مگر یہ رنگ تو آج

کل سے فیشن میں داخل ہے۔ کہیں سب یہ نہ سمجھیں کہ میں نے خاص طور پر جلیل صاحب کے بھتیجے کے لیے یہ سوٹ پہنا ہے۔" اس نے ایک سفید سوٹ نکالا۔" بس یہ ٹھیک ہے۔" چنانچہ اس نے یہ سوٹ پہن لیا۔

ڈائننگ روم کو آج عزیزہ نے غیر معمولی طور پر سجایا۔ اس کی دیواروں پر قدرتی مناظر کی خاص الخاص تصویریں آویزاں کیں۔ ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک میز پر متعلقہ کھانوں کے برتن سجا کر رکھے۔ گھر میں پڑی ہوئی ہر چیز کو کمال قرینے سے رکھا۔ اس کے بعد اس نے مہمانوں کا انتظار شروع کر دیا۔ مہمانوں کو دس گیارہ بجے کے قریب آجانا چاہئے تھا مگر انھیں دیر لگ گئی۔

اگرچہ اب خفیہ دہشت پسندوں کی کارروائیاں قریب قریب ختم ہو گئی تھیں پھر بھی عزیزہ کو اس وہم نے سخت پریشان کیا کہ خدانخواستہ راستے میں دہشت پسندوں نے کوئی شرارت نہ کر دی ہو۔ اس وہم کے آنے کی دیر تھی کہ عزیزہ کا دل ڈوبنے لگا اور وہ بار بار کھڑکی سے مہمانوں کو دیکھنے لگی۔

عزیزہ نے آج کی میزبانی میں اپنی ہمسائی نجمہ کو بھی شامل کر لیا تھا جو اس وقت باورچی خانے میں باورچن کی مدد کر رہی تھی۔ نجمہ، عزیزہ کی بہت پرانی سہیلی تھی جو بہت سال گذرے اسی مکان میں رہتی تھی لیکن اسے اپنے والدین کے ساتھ مراکش جانا پڑ گیا تھا۔ کچھ روز گذرے واپس اسی مکان میں آئی تو اس کی محبت عود کر آئی اور وہ زیادہ تر یا تو ان کے گھر میں وقت گزارتی یا پھر اسے اپنے گھر میں رہنے پر مجبور کرتی۔ اس کے ساتھ انتہائی بے تکلفی اور رازداری اس کے تعلقات کی گہرائی کو ظاہر کرتی تھی۔

آج کی مصروفیت میں نجمہ سب سے زیادہ حصہ لے رہی تھی، خاص طور پر کھانے کی چیزیں تیار کرنے میں لیکن عزیزہ کا اس وقت سب سے بڑا انہماک مہمانوں کے انتظار میں تھا۔ جب وہ انتظار کرتے کرتے تھک ہار گئی تو اندرونی کمرے کی چارپائی پر غصے سے پڑ گئی۔ پڑی ہی تھی کہ آواز آئی۔

"السلام علیکم"۔

عزیزہ چونک کر اٹھی۔ عقیل جو مکان سے باہر استقبال کے لیے کھڑا تھا مہمانوں کو اوپر لے آیا۔ سلام کی ابتدا جلیل صاحب نے کی تھی جس کا جواب کرامت صاحب نے دیا۔

"عزیزہ کہاں ہے؟" سب نے دریافت کیا۔

اور عزیزہ شرماتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس سے پہلے جلیل صاحب عقیل اور کرامت کا تعارف اپنے نوجوان بھتیجے سے کرا چکے تھے۔ اب عزیزہ کا تعارف کرایا۔

"یہ ہے زبیدہ اور عائشہ کی طرح میری عزیز بیٹی۔ یہ بڑی ہی عزیز ہے۔ اسی لیے اس کا نام بھی عزیزہ ہے"۔

"اور یہ ہیں میرے بھتیجے مسٹر قیصر جو میرے بیٹوں کی طرح ہیں"۔

قیصر نے کہا۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔

اس کے جواب میں عزیزہ صرف مسکرا سکی۔ اس کی شرم کے پاس شکریہ کے یہی بے آواز الفاظ تھے۔

اتنے میں کرامت کی نظر سامنے کے باورچی خانے کے دروازے میں پڑی جہاں نجمہ اور باورچن شوق بھری نظروں سے مہمانوں کی محبت کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اس نے دونوں کو بلا لیا اور ان کا بھی تعارف کرایا۔

ڈرائنگ روم میں جانے کے بعد جلیل صاحب سے ان کی بیگم نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے زبیدہ اور عائشہ نے عزیزہ سے یہ ضرور کہہ بھیجا ہو گا کہ وہ بھی ان کی طرح سفید سوٹ زیب تن کرلے۔ جبھی تو تینوں لڑکیاں سفید کبوتریاں معلوم ہو رہی ہیں"۔

پاس بیٹھی ہوئی زبیدہ اور عائشہ نے یہ آواز سنی تو زبیدہ نے قریب آکر کہا۔

"امی جان! ہم نے تو عزیزہ کو کوئی پیغام نہیں بھیجا بلکہ ہم تو خود دونوں حیران ہیں کہ عزیزہ نے بھی بالکل ہمارے جیسا سوٹ زیب تن کیسے کر لیا؟"

یہ کہہ کر عائشہ اور زبیدہ اندر والے کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں عزیزہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ عائشہ بولی "دیکھا کوئی کسر رہ گئی ہے اقدامِ قتل میں، جو آئینہ میں اپنا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ تم مطمئن رہو وہ اس سادگی پر جلد ہی شہید ہو جائیں گے"۔

عزیزہ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے عائشہ سے کہا "اگر آپ لوگ ہمارے ہاں مہمان نہ ہوتے تو میں آپ کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیتی"۔

زبیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے۔ گویا ہم تمہارے مہمان ہیں۔ ہم تو اپنے آپ کو مہمان نہیں سمجھتے۔ تمہارے گھر میں اچھے آئے ہیں کہ تم نے ہماری قدر و منزلت ہی کم کر دی ہے — بہت اچھا یوں ہی سہی"۔

عزیزہ ہنس پڑی اور بولی "اچھا بھئی میں اپنی غلطی تسلیم کرتی ہوں۔ تم ہماری مہمان نہیں ہو بلکہ میزبان ہو"۔

عائشہ نے کہا "اس اصول کے مطابق تو ہمیں کان سے پکڑ کر باہر نکال دینا چاہیئے —— اب ذرا نکال کر دکھاؤ۔ قیصر میاں کے سامنے مقدمہ دائر نہ کر دیا تو کہنا"۔

عزیزہ اب ان کی اس قسم کی متجاوز شرارت کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ اپنے مہمانوں کو پیٹنے کیلئے آگے بڑھی مگر شریر لڑکیاں نقرئی قہقہے بلند کرتی ہوئی اس کمرے میں پہنچ گئیں جہاں کرامت قیصر کو الجزائر کی رہنماؤں اور مصروف کارکنوں کی تصویریں دکھا رہا تھا۔

"کنکر" کے واقعہ کے بعد کرامت اور عائشہ میں کتنی ہی خفیہ ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اسی طرح زبیدہ کو جب بھی موقع ملتا عقیل سے مل کر راز و نیاز کی باتوں میں مصروف رہتی۔

زبیدہ اور عائشہ عشق و محبت کے اس مقام سے بہت آگے نکل چکی تھیں کہ

اظہارِ تمنا پر وہ کش مکشِ پیہم
اقرار نہ کر بیٹھوں، انکار نہ ہو جائے

ان دونوں کے تو دلی طور پر اقرار نامے محبت کے آنسوؤں سے لکھے جا چکے تھے۔ اس

لیے ملاقات کے ان مواقع پر جیساکہ آج ایک موقع تقریبِ دعوت کا پیدا ہوا، عقیل اور کرامت کو ان خوشگوار قسم کی شرم اور گھبراہٹ کی راہوں سے نہ گذرنا پڑا جن سے آج عزیزہ کو سابقہ پڑا ہوا تھا وہ تو گویا۔ اپنی اپنی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عزیزہ نے قیصر سے متعلق مذاق سے پیچھا چھڑانے کے لیے زبیدہ اور عائشہ کو عقیل اور کرامت کا حوالہ دیا تو دونوں نے نہایت بے تکلفی سے جواب دیا۔ "ہاں ہمیں اپنے اپنے مرکز سے محبت ہے اور ہم اس کا اعتراف کرتی ہیں مگر ہمارے مقابلے میں ایک تم ہو کہ دل میں محبت کا چور بھی موجود ہے اور چوری کا اعتراف بھی نہیں۔"

عزیزہ اس قسم کے مذاق پر سر پیٹ کر رہ گئی۔ آخر اس نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔ "بہت اچھا سہیلیو! بہت اچھا مجھے قیصر سے محبت ہے، اب تو میرا پیچھا چھوڑو۔"

عزیزہ کے اس غیر متوقع جواب پر نجمہ سمیت جو پاس ہی کھڑی تھی تینوں کا اس قدر زور دار قہقہہ بلند ہوا کہ جلیل صاحب کہنے لگے۔ "ان لڑکیوں میں کتنی اپنایت ہے۔ کتنی خوشی منا رہی ہیں۔ خدا کرے یہ خوشی دائم رہے۔"

زبیدہ کی والدہ نے آمین کہا اور پھر نجمہ نے کھانا تیار ہو جانے کی اطلاع کر دی۔ اس کے بعد عزیزہ کے بازو پکڑے ہوئے عائشہ اور زبیدہ ڈائننگ روم میں آگئیں۔ عزیزہ نے ہزار کہا کہ وہ میزبانی کرے گی لیکن انھوں نے اس کی ایک نہ سنی اور کہا کہ میزبانی کے فرائض باورچن اور نجمہ ادا کریں گی۔ نجمہ پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ "بہ دل وجان، عزیزہ کے قیصر کے لیے میں کیا کچھ نہیں کر سکتی۔"

عزیزہ نے نجمہ کے اس شرارت آمیز جملے پر اسے گھور کر دیکھا اور پھر شکستِ فاش کھاتی ہوئی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ڈائننگ روم میں آگئی۔ جلیل صاحب، قیصر، عقیل اور کرامت کے سامنے تینوں لڑکیاں بیٹھ گئیں۔ اتفاق سے عزیزہ کو قیصر کے بالمقابل جگہ ملی۔

تھوڑی دیر میں کھانا آگیا جس کے نظارے ہی سے سب مبہوت ہو گئے۔ خاص طور پر

جلیل صاحب کی زبان سے "سبحان اللہ" کے لفظ نکلنے لگے۔ نیز انھوں نے کہا "خدا بہتر جانتا ہے میں نے اس سے پہلے کہیں بھی ایسے اچھے کھانے اور اچھے انتظام کے ساتھ نہیں دیکھے اس سے اس گھر والوں کے خلوص اور محبت کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔"

عقیل کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ "چچا جان! ہم آپ بزرگوں اور عزیزوں کیلئے کیا پیش کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ کے حسنِ خیال نے ہماری عاجزانہ سی پیش کش کو اتنا پسند کیا ہے تو اس میں ساری محنت عزیزہ کی ہے جو کل سے یہ بنانے کے بعد کر رہی ہے۔"

عقیل کی اس وضاحت پر عزیزہ کے چہرے پر شرم کی وجہ سے پسینہ آگیا۔ اور وہ سرنگوں کیسے جیسے زمین میں گڑ گئی۔ اسے اپنے بھائی پر سخت غصہ آیا۔ ابھی وہ اس غصے پر قابو پا رہی تھی کہ دائیں بائیں عائشہ اور زبیدہ نے خفیہ طور پر عزیزہ کو کہنیاں مارنی شروع کر دیں۔ اس کے غصے کا رخ بھائی کے بجائے دائیں بائیں پہلوؤں میں بدل گیا۔

زبیدہ کی والدہ نے کمرے کی دیواروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "کمرے کی تزئین بھی عزیزہ ہی نے کی ہوگی ... ... کیوں عزیزہ؟"

اور عزیزہ شرم کی وجہ سے اور زیادہ سرنگوں ہو گئی۔

عقیل نے کہا "عزیزہ! یہ بات تہذیب کے خلاف ہے۔ تمہاری تعریف ہو رہی ہے تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹا لڑکیوں میں شرم اچھی ہوتی ہے۔" اب انہوں نے عزیزہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "بیٹی! اسکول میں تمہارا آخری سال ہے نا؟"

عزیزہ نے عقیل کی سرزنش سے اثر لینے کے بعد سر اٹھایا۔ اور جواب دیا۔ "ہاں چچی جان آخری سال ہے۔"

"اچھا خدا تمہیں کامیاب کرے" زبیدہ کی والدہ بولیں۔"

جس پر سب نے کہا "آمین" "ثم آمین" یہ آواز قیصر کی تھی۔

جب کھانے سے فراغت ہوچکی، جس کا اختتام آئس کریم پر ہوا، تو قیصر نے زبان کھولی "مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ گرانقدر دعوت میری آمد کی خوشی میں کی گئی ہے جس کے لیے میں عقیل صاحب ان کے بھائی ـــــ کیا نام ہے ان کا۔ ہاں کرامت صاحب اور ان کی عزیزہ صاحبہ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ان کے علاوہ اس مبارک گھر کا بھی ممنون ہوں جس کی چار دیواری میں خلوص اور محبت کا یہ اجتماع ایک دوسرے کی دلی خوشی کا موجب بنا ہے۔"

زبیدہ نے کہا "قیصر بھائی آپ کی یہ تقریر تو بہت دلآویز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے خیال میں کھانے پینے کی اب کوئی مد باقی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے باقی ماندہ خیالات کا اظہار آپ قہوے کے بعد کیجئے۔"

زبیدہ کے ان جملوں پر سب ہنس دیے۔ عزیزہ بھی اب پہلی جھجک سے کنارا کش ہو کر کسی حد تک بے تکلف ہوگئی۔ اس نے زبیدہ سے کہا "آپ نے خواہ مخواہ بھائی قیصر کی تقریر کو روک دیا۔ قہوے کا شکریہ علیحدہ طور پر بعد میں ادا ہو جاتا۔"

قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں یہ بھی درست ہے۔"

اس کے بعد قہوے کا سٹ آگیا اور ہر ایک نے فنجان ہاتھ میں تھام لیا۔ قہوے کے ہلکے رنگ اور لطیف ذائقے نے مہمانوں کو میزبانوں کا رطب اللسان کر دیا۔ دعوت کے بعد جب جلیل صاحب مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا جلوس لے گئے تو عزیزہ کو اپنا گھر سونا سونا معلوم ہونے لگا۔

یورپی خفیہ دہشت پسند جتنی تیز رفتاری سے اپنے مظالم میں روز بروز اضافہ کر رہے تھے اتنی ہی تیزی کے ساتھ انھوں نے یکم جولائی کو قریب تر آتے دیکھ کر اپنے اقدامات میں کمی کرنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ جون کے آخری ہفتے میں ان کی طرف سے مظالم کی کوئی نئی بات سننے میں نہ آئی۔

آخر ۳۰ جون کو عوران کے ٹاؤن ہال میں الجزائر کے مسلمانوں اور فرانسیسی آباد کاروں کا ایک مصالحتی جلسہ ہوا جس کی صدارت عوران کے بشپ نے کی۔ اس جلسے میں پانچ ہزار مسلمان اور صرف دو سو فرانسیسی آباد کاروں نے شرکت کی۔ باقی۔ فرانسیسی اس ڈر سے جلسۂ مصالحت میں شریک نہ ہوئے کہ شاید مسلمان ان کی پہنچائی ہوئی اذیتوں کا بدلہ لینے کے لیے اکٹھے ہوئے ہوں۔ بہر حال یہ حقیقت سب کے سامنے آ گئی کہ حصول آزادی کے عزائم

کو، اگر وہ بیدار ہو جائیں تو سات سالہ مظالم تو کیا بیس سالہ قتل و غارت کے منصوبے بھی ختم نہیں کر سکتے۔

ادھر الجزائر کی عبوری انتظامیہ نے، جس کے صدر عبدالرحمٰن فارس تھے، یہ فیصلہ کیا کہ الجزائری عوام کو حقِ خود اختیاری دینے کے لیے یکم جولائی کو استصواب کرایا جائے۔ رائے شماری میں الجزائر کے عوام اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ وہ الجزائر کی کامل آزادی چاہتے ہیں یا نہیں یا وہ فرانس کے ساتھ کسی قسم کا سیاسی اتحاد برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

رائے شماری میں الجزائر کے یورپی اور مسلمان باشندے ووٹ دیں گے۔ الجزائر کے جو مسلمان یا یورپی آبادکار ترک وطن کر چکے ہیں انھیں بھی اس شرط پر ووٹ دینے کا پورا حق ہوگا کہ وہ یکم جولائی سے پہلے الجزائر پہنچ جائیں۔ اُن دنوں الجزائر کی عبوری انتظامیہ تمام رائے دہندگان سے یہ اپیل کرتی رہی کہ وہ ووٹر بننے کے لیے اپنے نام جلد از جلد درج کرائیں۔ انتظامیہ نے نام درج کرانے کی آخری تاریخ ۹ جون مقرر کی تھی اور الجزائر سے باہر گیے ہوئے باشندوں کو نام درج کرانے کی رعایت ۱۷ جون تک دے دی تھی۔ باہر گیے ہوئے باشندوں کو یہ مزید رعایت دی گئی تھی کہ وہ الجزائر سے باہر رہ کر بھی ڈاک سے ووٹ بھیج سکتے ہیں۔ لیکن عبوری حکومت کے اس اعلان نے بھاگنے والے یورپی آبادکاروں کو پہلے سے زیادہ بھگوڑا بنا دیا اور وہ بھاری تعداد میں فرانس روانہ ہو گیے۔ اس روانگی میں بھی کہیں نہ کہیں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان تصادم ہوتا رہا۔ تصادم کے اس قسم کے واقعات آخر کب تک ہوتے۔ ان دنوں ووٹروں کی فہرستیں دھڑا دھڑ بننے لگیں۔ اور ایک ایک ووٹر یکم جولائی کے سورج کا شدت سے انتظار رہنے لگا۔

ایسا ہی انتظار زبیدہ اور عقیل کو بھی تھا۔ دوسروں کو بھی بہت انتظار تھا مگر چونکہ یہ دونوں مجاہدانہ ولولہ رکھتے تھے اس لیے انکے انتظار اور دوسروں کے انتظار میں بڑا فرق تھا۔

طے شدہ پروگرام کے تحت قیصر کو عوران میں تجارت کے لیے جانا تھا لیکن جلیل

صاحب کے مجبور کرنے پر اس نے اپنا سفر حصولِ آزادی کے بعد تک ملتوی کر دیا۔

عزیزہ کو تیسرے روز یہی خیال تھا کہ اس کا قیصر عوران میں اپنے کاروبار میں مشغول ہو چکا ہو گا۔ وہ خیال ہی خیال میں اس کی ہم سفر بنی ہوئی تھی۔ لیکن کچھ روز بعد جب جلیل صاحب نے عقیل اور اس کے بھائی بہن کو اپنے ہاں بلایا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیے کہ قیصر ابھی تک وہیں تھا۔

عزیزہ بار بار آنکھیں مل کر دیکھتی تھی کہ کیا وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ آخر جب پورا یقین ہو گیا تو اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔

جلیل صاحب نے بتایا کہ آج تم لوگوں کو بلانے کا یہ مقصد تھا کہ مجاہد حمید الدین جو تم لوگوں کی غیر حاضری میں چند بار آ چکا ہے آج مختلف واقعات کی تصویریں لا رہا ہے۔ ان تصویروں میں جدوجہد آزادی کی رفتار موجود ہے۔

عقیل نے کہا۔ "چچا جان! آپ نے اس سے پہلے بتایا تو نہیں"۔

"ہاں"۔ جلیل صاحب بولے۔ "مجھے یاد نہ رہا۔ اس نے زبیدہ کو بہت طویل واقعات کی کہانیاں بھی سنائی تھیں"۔

عقیل کو اس موقع پر زبیدہ نے کچھ کھویا کھویا سا پایا لیکن اسے اکیلے بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ کھانے کا وقت ہوا تو مجاہد حمید الدین کھٹ سے آموجود ہوا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر مجاہد حمید الدین نے ایک لفافے سے بہت سی تصویریں نکالیں جنھیں عقیل کے سوا سب نے بہت شوق اور توجہ سے دیکھا۔

جب حمید الدین جانے لگا تو سب کے سامنے زبیدہ نے اسے ایک لفافہ دیا جسے اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر وہ کھانے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے چل دیا۔

عقیل اسے ذرا دُور تک چھوڑنے کے لیے ہمراہ گیا۔ الوداعی سلام کے بعد جب مجاہد اپنے راستے پر گامزن ہوا تو اس نے تھوڑی دُور جا کر لفافہ کھول کر پڑھا اور پھر اس کے دو ٹکڑے

کر کے پھینک دیا۔

جب مجاہد کافی دور چلا گیا تو عقیل نے آگے بڑھ کر وہ پھٹا ہوا کاغذ اٹھا لیا۔ جسے پڑھنے کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے واپس آ کر زبیدہ سے بات کرنے کی تنہائی ڈھونڈ ہی لی۔ خود زبیدہ بھی تنہائی میں باتیں کرنے کی منتظر تھی۔ عقیل نے پھٹے ہوئے کاغذ کو عقیدت سے چوم کر جیب میں رکھ لیا اور زبیدہ سے اپنی بدگمانی کی معافی چاہی۔ رقعہ میں مجاہد کے نام یہ عبارت لکھی تھی۔

بھائی حمید الدین صاحب السلام علیکم

آپ نے جس شریفانہ انداز میں مجھ سے شادی کرنے کی رضامندی معلوم کی ہے اس کے لیے میں شکر گذار ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لیے اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ میں عقیل صاحب کی امانت ہوں اور امانت میں انشائ اللہ مرتے دم تک خیانت نہ کروں گی۔

آپ کی بہن

زبیدہ

آج زبیدہ کے سکول میں شام کے وقت تفریحی پروگرام تھا۔ زبیدہ اور عائشہ، عزیزہ کو ہمراہ لے کر چلی گئیں۔ اور قیصر اپنے کسی کام سے نکل گیا۔ اس موقع سے جلیل صاحب نے پورا فائدہ اٹھایا اور اندرونی کمرے میں سب کو جمع کر کے یوں بات شروع کی۔

"برخوردارو! خدا کے فضل سے ہمارے اور تمہارے تعلقات اتنے زیادہ ہو گیے ہیں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ ہم ایک دوسرے سے نہ ملنے کا پروگرام بنائیں۔"

عقیل اور کرامت کا چہرہ اس فقرے سے پیلا پڑ گیا۔ زبیدہ کی والدہ کو ہنسی آ گئی اور انھوں نے جلیل صاحب سے کہا۔ "آپ نے میرے بیٹوں کو ڈرا ہی دیا ہے۔"

عقیل نے کہا۔ "چچا جان! آپ نے تو واقعی ہمیں ڈرا دیا ہے۔ آپ مہربانی کر کے اپنے

الفاظ واپس لے لیجے"۔

جلیل صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "خیر میں الفاظ تو کبھی واپس نہ لوں گا لیکن اسکے خوشگوار معنی بتانے میں ضرور جلدی کرتا ہوں تاکہ تمہاری پریشانی ختم ہو جائے"۔

کرامت نے کہا "ہاں، ہاں چچا جان! جلد بتایئے"۔

اس پر جلیل صاحب کی ہنسی نکل گئی۔ انھوں نے کہا "دیکھو بیٹا! ایک مدت سے تم لوگوں کے ساتھ ہمارے جس قدر زیادہ مراسم ہو گیے ہیں ان کا تقاضا ہم نے بھی سوچ رکھا ہے اور تم لوگوں نے بھی سوچ رکھا ہوگا۔ بعض باتیں جھجک اور شرم کی ہوتی ہیں مگر بعض حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ شرم اور جھجک سے بے نیاز ہو جانا پڑتا ہے۔ ہمارے حالات ایسے ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تم دونوں کو اور تمہاری بہن عزیزہ کو اپنی حقیقی اولاد تصور کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ نومسلم عائشہ کو بھی ایسا ہی درجہ دیتا ہوں۔ جب میرے اس قول میں تصنع نہیں پایا جاتا تو پھر میرے لیے یہ مشکل ضرور ہے کہ میں تم لوگوں کے اپنی اولاد سے رشتے کرنے میں تم ہی سے مشورہ کروں۔ افسوس تمہارے والدین بقید حیات نہیں ورنہ تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ اب جب کہ خود ہم تمہارے والدین ٹھہرے ہیں تو پھر یہ ہمارا ہی فرض ہے کہ ہم تمہارے رشتوں کا اسی طرح انتظام کریں جس طرح اپنی اولاد کا۔

جس روز عزیزہ اور میں ٹیکسی میں الگ سوار ہو کر آرہے تھے اس روز اُس نے تمہارے لیے زبیدہ اور کرامت کے لیے عائشہ بیٹی کو مانگا تھا اور میں نے درخواست کو قبول کر لیا تھا۔ اِدھر میں نے جیسا کہ چند روز گذرے ذکر کر چکا ہوں، تم لوگوں سے تمہاری عزیزہ کو اپنے بھتیجے قیصر کے لیے مانگا تھا۔ میں خوش ہوں کہ تمہاری فراخ دلی نے میری درخواست منظور کر لی چونکہ مجھے اپنے بھتیجے سے بہت محبت ہے اور وہ میرے ہی پاس انجام کار رہے گا اس لیے میں نے اسے پرسوں دوستوں کی طرح سمجھا دیا ہے کہ میں اس کا رشتہ عزیزہ سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کل شام تمہاری چچی کے باصرار دریافت پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ اس لیے میں چاہتا

ہوں کہ ہم سب یکم جولائی کو ایک جگہ بیٹھ کر منگنی کی رسم ادا کرلیں اور پھر الجوائر کی آزادی مل جانے کے بعد جلد از جلد تینوں رشتے ازدواج کی حسین زنجیروں میں باندھ دیئے جائیں۔ ظاہر ہے منگنی کے بعد ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے زیادہ نہیں ملنا چاہئے اس لیے میں نے شروع ہی میں کچھ عرصہ تک نہ ملنے کا پروگرام بنایا تھا"۔

عقیل اور کرامت نے تھوڑی سی جھجک کے بعد جلیل صاحب اور چچی جان جان کا شکریہ ادا کیا اور پھر یکم جولائی کو پہلے اُن کے ہاں منگنی کے لیے پہنچنے اور بعد میں اپنے ہاں ان کے تشریف لانے کا پروگرام طے پایا۔ اس کے بعد مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات نے وقت لے لیا اور پھر جب عزیزہ واپس آئی تو زبیدہ کی والدہ نے سارے پروگرام سے اسے واقف کر دیا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اسی کے گھر بھی قیصر کی منگنی کے لیے آیا جائے گا تو وہ شرم کی وجہ سے چھوٹی موٹی کے پتوں کی ادائیں چرانے لگی۔ اب جلیل صاحب نے انھیں زیادہ دیر ٹھہرنے پر مجبور نہ کیا اور وہ بھی جلدی سے اپنے چلے گئے۔

گھر آتے ہی عزیزہ ہمسایہ سہیلی سے ملنے چلی گئی۔ اور وہاں اس نے اپنے دل کی خوشی کو باہر نکال کر دکھا دیا۔ اس نے اس طرح کا اظہار مسرت کیا کہ نجمہ کو اس کے دیوانہ ہو جانے کا شُبہ ہو گیا۔ اظہارِ مسرت کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ بہت دیر بعد جب خاموش ہوئی تو اس نے بتایا کہ اسے اچانک اپنے والدین یاد آگئے تھے۔

عزیزہ کی طرح جون کے آخری دن عقیل اور کرامت نے بھی خوشی اور غم میں گذارے۔ خوشی آنے لگتی تو والدین کی یاد غمگین بنا دیتی۔ اور غم آنے لگتا تو خوشی دلاسے دینے لگتی۔ اس کشمکش میں بقیہ دن گذر گئے۔ ہمسایوں کے مشورے سے ابتدائی زیورات اور ملبوسات کی خریداری کی گئی اور کچھ تحفے وغیرہ۔ الغرض شوق اور سادگی کا جس قدر مختصر سامان ہو سکتا تھا اسے کر دکھایا گیا۔

دوسرے متعدد گھروں کی طرح زبیدہ اور عقیل کے گھروں کو اس بات کی انتہائی خوشی تھی کہ جس روز ان گھروں میں ازدواجی بندھنوں کی ابتدائی رسوم ادا ہونا تھیں اس سے

ایک روز پہلے الجزائر کی قسمت کا بھی متوقع خوش گوار فیصلہ ہونا تھا۔ چنانچہ دوسرے روز اتوار کو معاہدہ ایویان کے تحت الجزائر کے حق خود ارادیت کے سلسلے میں سارے الجزائر میں رائے شماری ہونا تھی۔

اتوار کی صبح کو الجزائر کی آزادی کے لیے ووٹ دینے کی خاطر الجزائری مسلمان صبح ہی سے پولنگ اسٹیشنوں کے باہر قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ الجزیرہ کے مسلم حلقوں کے باہر جو پولنگ اسٹیشن بنائے گیے وہاں علی الصبح ہی قطاریں بننا شروع ہو گئیں۔ بہت سے مسلمان تو صبح پانچ بجے پہنچ گیے حالانکہ پولنگ ساڑھے سات بجے سے پہلے شروع نہ ہو سکا۔

پولنگ پرسکون فضا اور چمکتے ہوئے سورج کی ابھرتی ہوئی شعاعوں کے ساتھ شروع ہوا۔ الجزائر کی عبوری انتظامیہ نے فرانسیسی فوجوں کو ان کی بارکوں میں پابند کر دیا تھا اور وہاں سے نہ نکلنے کی ہدایت بھی کی گئی تھی۔ پولنگ سٹیشنوں کی نگرانی کے لیے مقامی مسلمان پولیس اور یورپی باشندوں کی پولیس تعین تھی۔ الجزیرہ کے مسلمان قصبے کے پولنگ سٹیشن کے باہر سو گز کے اندر عورتیں اور مرد علیحدہ علیحدہ چھ چھ کی قطاروں میں کھڑے تھے اور ان قطاروں میں ہزاروں مجاہدین اور اہل ایمان لوگوں کے ساتھ جلیل صاحب، عقیل، کرامت اور قیصر بھی تھے۔ خواتین کی قطاروں میں زبیدہ، زبیدہ کی والدہ، عائشہ، عزیزہ بھی موجود تھیں۔ مگر یہ سب انبوہِ کثیر میں ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل تھے، البتہ ان کے ووٹ ایک جگہ موجود تھے۔

آج کی خوشگوار مصروفیت سے فارغ ہو کر جو رات گیے تک گہما گہمی کی صورت میں رہی جلیل صاحب اور عقیل کے گھروں نے اگلے روز یعنی پیر کے دن منگنی کی رسوم ادا کرنے کے بقیہ انتظامات پورے کرنے شروع کر دیے۔

مسلمانانِ الجزائر تو کیا دنیا بھر کی اسلامی مملکتوں کے علاوہ انصاف پسند حکومتیں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھیں کہ سات سال کی جد وجہد کے بعد الجزائر کو اپنی قسمت بدلنے کا موقع ملا۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت ان کی کامیابی کا صاف پتہ دے رہی تھی لیکن انھوں نے اپنی آنکھوں کی زبانی خدا کے حضور الجزائر کی آزادی کے لیے خضوع وخشوع کے ساتھ

دعائیں مانگیں۔ اس استصواب رائے کا نتیجہ اعلان کے مطابق ۳؍جولائی کو منگل کے دن نکلنا تھا یکم جولائی کی رات، دونوں گھروں کو ۲؍جولائی کا بھی انتظار تھا اور ۳؍جولائی کا بھی۔

جب ۲؍جولائی کی صبح کا سورج طلوع ہوا تو عقیل، کرامت اور قیصر نے ایک عجیب قسم کے پرلطف سرور کے ساتھ آنکھیں کھولیں مگر ان سے بھی زیادہ لیکن ذرا مختلف قسم کی خوشی کا لطیف احساس لیے ہوئے زبیدہ، عائشہ اور عزیزہ جاگیں۔ ان کا احساسِ مسرت شرم کی آمیزش کے باعث کچھ اس طرح کا جھولا جھول رہا تھا جس کے ایک طرف پہنچنے پر عقیل، کرامت اور قیصر آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے تھے اور دوسری طرف سکھیاں مذاق کرتی دکھائی دیتی تھیں۔

بہرحال کرنے والا کام کسی صورت میں کرنا تھا، چنانچہ عزیزہ نجمہ اور نجمہ کی والدہ ٹیکسی میں بیٹھ کر زبیدہ کے مکان پر گئیں جہاں ان کا بے حد احترام کیا گیا۔ انھوں نے زبیدہ اور عائشہ کو عقیل اور کرامت کے لیے مانگنے کی رسم پوری کی، تحفے پیش کیے، کپڑے اڑھائے اور دعائے خیر کے بعد واپس آگئیں۔ جب عزیزہ چلنے لگی تو زبیدہ اور عائشہ نے الگ ہو کر ازراہ شرارت کہا۔ "تم ہمیں مانگ کر جا رہی ہو تو یاد رکھو ہم پیچھے پیچھے تمہیں مانگنے آرہے ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا۔"

عزیزہ شرم کی وجہ سے جلدی نکل بھاگی۔ لیکن ابھی اپنے گھر پہنچے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ جلیل صاحب بمعہ اپنی بیگم تشریف لے آئے۔ عقیل اور کرامت سے عزیزہ کو مانگنے کی رسم پوری کرتے ہوئے تحائف اور بڑھیا قسم کے کپڑے عزیزہ کو پہنائے اور پھر دعائے خیر کہنے کے بعد خوشی خوشی جلد ہی واپس آگئے۔

۴۴

۳ر جولائی ۶۲ء کا دن الجزائریوں کے لیے انتہائی مسرت و شادمانی کا دن تھا۔ صبح کی اذانوں میں نئی زندگی پائی جاتی تھی، سورج کی کرنیں سونے اور چاندی کے پانی سے دھلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ دن کی روشنی میں خاص قسم کی چمک تھی۔ موسم غیر معمولی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔

آج سارے الجزائر میں جب جنرل ڈیگال کی یہ صدا گونجی کہ "الجزائر کے ساٹھ لاکھ ووٹروں میں سے ننانوے فیصد ووٹ الجزائر کی آزادی کے حق میں ڈالے گیے" تو مسلمانوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے قادرِ مطلق کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر کے بے ساختہ اظہارِ مسرت میں اپنی آنکھوں کو بھگو لیا۔ اب فرانس کے ترنگے جھنڈے کی جگہ سبز و سفید الجزائری پرچم لہرانے لگے۔ سب سے پہلے روشر نائر میں الجزائر کے انتظامی صدر دفتر کی عمارت پر الجزائر کے قومی جھنڈے لہرائے گئے۔ اور اس تقریب میں الجزائر کی عبوری حکومت کے صدر مسٹر عبد الرحمٰن فارس اور پانچ دوسرے

اراکین نے حصہ لیا۔

آج ہر شہر میں یہی کیفیت ہوگئی مگر الجزائرہ کی سڑکوں اور گلیوں میں دیکھا گیا کہ ہر جگہ مسلمان لڑکے سبز و سفید لباس پہنے ہوئے سائیکلوں پر سوار اور پیدل ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح لڑکیوں نے سبز رنگ کے سکرٹ اور سفید رنگ کے بلاؤز پہن رکھے ہیں۔ جو بھی گزرتا تھا "یحیٰ آزادی" یعنی آزادی مبارک ہو کے الفاظ پکارتا جاتا تھا عام مسلمان "الجزائر زندہ باد" کے نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔

آج فرانسیسی فوج اپنی بارکوں میں رہی اور مسلمان سپاہی ڈیوٹی پر متعین رہے یہ مسلمان سپاہی الجزائر کی عارضی پولیس فورس کے رکن تھے۔

آج جشنِ آزادی مناتے ہوئے قریباً آٹھ سو مسلمان سپاہیوں نے آزادی کی خوشی میں پریڈ کی اور ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے پرجوش تالیاں بجائیں اور اس طرح مجاہدین کا خیر مقدم کیا۔

مسلمانوں کی نگاہیں الجزائری رہنماؤں پر لگی ہوئی تھیں جن کے متعلق معلوم ہوا کہ عبوری کابینہ کے وزیر تیونس سے تیسرے پہر ہوائی جہاز کے ذریعے الجزائر میں پہنچ رہے ہیں مگر ان میں بن باللہ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ تیونس میں نہیں بلکہ بن غازی میں ہیں۔

بہر حال جتنے بھی رہنماؤں کے آنے کی خبر ملی الجزائری مسلمان ان کے لیے فرشِ نگاہ بنے ہوئے نظر آئے۔ دلآویز دو رنگا جھنڈا بلند ہو گیا۔ اس کو لہراتے دیکھ کر سب کے دل لہرائے مگر زبیدہ کے دل کی مسرت کا کوئی احاطہ نہ کر سکا جو بن بیٹے ہی سرمست ہو گیا تھا۔ یہی حال عقیل کے گھر کا تھا اس کے گھر بھی سبز و سفید پرچم پوری شان سے لہرا رہا تھا جس سے اس کا اور اس کے بھائی بہن کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ الجزائر کی آزادی کی بے پناہ مسرت نے دونوں گھروں کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا ——— اور حقیقت میں الجزائر کی سرزمین اب پہلے والی سرزمین نہیں رہی تھی جہاں پہلے سڑکوں، گلیوں، ہوٹلوں اور کلبوں میں زندگی کی ضمانت نہیں مل سکتی

تھی۔ جہاں گھروں کے مقفل دروازے بھی مقفل نہ رہ سکتے تھے۔ جہاں دن کے آرام اور رات کے چین کو نظر لگ گئی تھی، جہاں مجاہدین کو انسانیت سوز سزائیں ملتی تھیں، جہاں معصوموں کو موت کی نیند سلا دینے کے بعد قہقہے بلند ہوتے تھے۔۔۔۔ آج سبز و سفید پرچم کے لہرانے کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے سابقہ طویل المناک واقعات کا مجموعہ ایک طویل خواب تھا جو بیداری کے بعد اپنے اثرات محو کر بیٹھا۔ حالانکہ آج کی آزادی جن دس لاکھ شہادتوں کے عوض میں ملی۔ وہ قصر آزادی کی حقیقی بنیادیں تھیں۔ اور نعمتِ آزادی کبھی قربانی کے بغیر نہیں مل سکتی۔

آج زبیدہ اور عائشہ آزادی کی مبارک عقیل اور کرامت کو انتہائی اظہارِ مسرت کے ساتھ دینا چاہتی تھیں۔ اسی طرح سرِیزہ کی سرشار امنگیں بھی قیصر کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے اس لیے تڑپ رہی تھیں کہ آزادی کی مبارک دینے کے بہانے اپنے بندھن کی بھی اشاروں اشاروں میں توثیق کرالیں لیکن یہ موقع ان کے لطفِ وصال کا نہ تھا بلکہ لذتِ ہجراں کا تھا جس کے نشے میں سب انتہائی طور پر چُور تھے۔ ایک دوسرے سے دُور رہ کر بھی وہ سورج کی شعاعوں کے ذریعے ایک دوسرے کو مبارکیں بھجوا رہے تھے۔

آج شام کے قہوے کے دور میں زبیدہ نے کہا" جمیلہ بوحائرڈ، جمیلہ بوعزہ اور جمیلہ بوپاشا کتنی خوش قسمت ہیں جن کی ترستی ہوئی آنکھوں کو آزادی کا سبز و سفید پرچم دیکھنا نصیب ہوا۔ عورت ذات کو سیاسی سرگرمیوں کے لیے پیدا نہیں کیا گیا لیکن یہ وقت کا اٹل تقاضا تھا جسے عورتیں بھی نہ ٹال سکیں۔

میری کتنی بہنوں اور ماؤں نے حصول آزادی کے لیے جانیں قربان کردیں۔ جمیلاؤں نے اپنی جوانیوں کو جسمانی اور ذہنی اذیتوں کا صرف اس لیے بے باکانہ نشانہ بننے دیا کہ اس کے بغیر غلامی کی زنجیریں توڑنے کی تگ و دو میں فرق آسکتا تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ آج تینوں جمیلاؤں کو زخموں کے نشان کتنے اچھے لگتے ہوں گے اور ان کے دلوں کی خوشی کا خدا کے سوا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ اگر زندگی رہی تو میں انشاءاللہ تینوں جمیلاؤں سے

ضرور ملاقات کروں گی۔"

زبیدہ کی والدہ نے کہا۔"بیٹی سچی بات یہ ہے کہ قوم کی ان بیٹیوں کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو سیراب کرنے کا مجھے بھی مدت سے خیال ہے۔ میں بھی اپنی بیٹی کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔"

جلیل صاحب بولے۔"حقیقت یہ ہے کہ میری بیٹی کسی جمیلہ سے کم نہیں ــــ ساری بات سچے عزم و ارادہ کی ہوتی ہے اور اس سے اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوا۔ میں روزانہ صبح جاگنے کے بعد جب اپنی بیٹی کو دیکھتا ہوں تو خدا گواہ ہے میرا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ خدا اسے نیکی کے ہر کام میں آگے بڑھنے کی توفیق بخشے۔"

یہ کہہ کر جلیل صاحب انگڑائی لیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے ہی تھے کہ عائشہ نے شاید کسی شرارت کے تحت کہا۔

"چچا جان! جمیلاؤں سے ملنے کے لیے جب ہم سب جائیں گے تو عزیزہ کو بھی ضرور ہمراہ لے چلیں گے۔"

جلیل صاحب جاتے جاتے اس جملہ کا یہ جواب دے گئے۔"صرف عزیزہ ہی ہمراہ نہ ہوگی اس کے دونوں بھائی بھی ہمراہ ہوں گے ــــ اور میرا خیال ہے کہ ہم اس دورہ کا پروگرام اکتوبر یا نومبر میں بنائیں گے۔"

جلیل صاحب کا یہ جواب برداشت کرنے کی دونوں میں ہمت نہ تھی۔ اس لیے دونوں اپنا اپنا فنجان میز پر چھوڑ کر کھانے کے کمرے سے نکل بھاگیں ــــ اور جب وہ بھاگتی ہوئی چھت پر پہنچیں تو زبیدہ نے حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ عائشہ کو جی بھر کر کوسا۔

"تمہیں عزیزہ کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

اور عائشہ نے شریر قہقہوں میں جواب دیا۔"اس لیے کہ آخر عقیل وغیرہ کی تاریخ شادی کا علم تو ہوتا؟"

زبیدہ نے عائشہ کے شانوں کو مضبوطی سے پکڑنے کے بعد اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کہا۔ "عقیل کی ہمدرد بہن! تم بے فکر رہو۔ عقیل کی شادی کے ساتھ ہی وغیرہ کی شادی کا بھی انتظام ہو جائے گا ——— اب مہربانی کر کے پرچم کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ باندھ دو تاکہ تیز ہوا اور آندھی بھی چلے تو اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔"

عائشہ۔ "بہت اچھا حضور۔" کہتی ہوئی پرچم کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ جب وہ پرچم کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ باندھ کر واپس ہوئی تو اس نے دیکھا کہ زبیدہ نے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے گر رہے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کیے یہ دعا مانگ رہی ہے۔

"اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے الجزائری شہیدوں، الجزائری رہنماؤں اور جمیلاؤں کے ساتھ میری آرزو پوری کی۔"

"اے قادرِ مطلق! تو الجزائری آزادی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برقرار رکھ۔"

یہ دلآویز اور دلگداز منظر دیکھ کر عائشہ کے ہاتھ بھی خدا کے حضور اٹھ گیے۔

علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپی

Printed at : Zulfiqar Art Printers 2, Royal Park, LAHOR